حرفِ آغاز

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد زبادِ صبح
درکارِ زندگی صفتِ سنگِ خارہ ایم

علامہ کے ہاں تو یہ ایک شاعرانہ خیال ہے لیکن مولانا حسرت موہانی کی پوری زندگی اس شعر کی مکمل تفسیر ہے۔ اگر ان کی شاعری دیکھیے تو وہ ایک حسّاس ہمتوسط گھرانوں کی لڑکیوں کے حسن و جمال میں گم اور نرم و نازک دل رکھنے والے رومانی شاعر نظر آتے ہیں اور اگر انھیں تحریکِ آزادی میں دیکھیے تو واقعی لوہے کے آدمی اور اقبال کے الفاظ میں "صفت رنگِ خارہ" ہیں۔ انھوں نے اقبال کے اس شعر کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے لیکن اقبال سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ اپنی زندگی کے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر

ہے مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت تقریباً چھ سال جیل میں رہے یہ وہ زمانہ تھا جب جیلوں میں اے بی اور سی کلاسیں نہیں ہوتی تھیں "مشاہداتِ زنداں" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مئی اور جون کے مہینوں میں بھی ان سے چکی چلوائی گئی اور ان کے ساتھ عام مجرموں والا رویہ بھی اختیار کیا گیا۔ ہندستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ میں مولانا کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مولانا علی گڑھ یونیورسٹی کے پہلے طالب علم تھے جو جنگِ آزادی میں جیل گئے۔ مولانا پہلے اڈیٹر تھے جن کو قید با مشقت کی سزا ملی۔ یہ مولانا ہی تھے جنھوں نے ترکِ موالات کی تحریک پیش کی تھی اور جسے منظور کیا گیا۔ مولانا

پہلے مجاہدِ آزادی تھے جنھوں نے کانگریس کے ایک جلسے میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں کی مخالفت کی وجہ سے منظور نہیں ہوئی لیکن چند سال بعد کانگریس نے اس تجویز کو منظور کیا۔ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانفرنس کے مجلسِ استقبالیہ کے صدر مولانا ہی تھے۔ مولانا ایک سچے کھرے حق گو اور بے باک انسان تھے انھوں نے کبھی مصلحتوں کے آگے گردن نہیں جھکائی۔ آزادی کا یہ متوالا منزل کی تلاش میں اتنا بے چین اور بے قرار تھا کہ جب کسی راستے پر منزل کے نشان نظر نہ آتے تو وہ راستہ بدل دیتا۔ یعنی مولانا کئی سیاسی جماعتوں کے رکن رہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ تاریخِ آزادی میں انھیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ملک و قوم اور اردو ادب پر ان کا بہت بڑا قرض ہے۔ اردو ادب کا "حسرت نمبر" اس قرض کو چکانے کی ایک چھوٹی سی حقیر کوشش ہے۔

اردو ادب کے اس شمارے میں عتیق صدیقی مرحوم کے دو مقالے شامل ہیں۔ یہ ان کے آخری مقالے ہیں اور مرحوم نے میری درخواست پر لکھے تھے۔ عتیق صاحب کی ساری زندگی تحقیق اور دوسری ادبی سرگرمیوں میں گزری۔ ان کی چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں

ہندوستانی اخبار نویسی۔ گلکرسٹ اور ان کا عہد۔ اٹھارہ سو ستاون — اخبارات و دستاویزیں۔ صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات۔ بنگلہ دیش میں بارہ دن۔ اقبال جادوگرِ ہندی نژاد۔ شیخ عبداللہ کشمیر اور ہم۔ غالب اور ابوالکلام آزاد۔ یادوں کے سائے۔ آئینۂ ابوالکلام آزاد۔ اور بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط۔ شاید ہی کوئی یونیورسٹی ایسی ہوگی جس میں ایم اے کے نصاب میں مرحوم کی بعض کتابیں شامل نہ ہوں پھر بھی کسی اہم ادارے نے ان کی کسی کتاب پر انعام دے کر ان کی ادبی خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ غالباً اس لیے کہ وہ محض محقق اور عالم تھے اور ان کا وہ سماجی وقار نہیں تھا، جو ادیب کو دوسرے اور تیسرے درجے کی کتابوں پر بھی انعام کا مستحق بنا تا ہے۔ اور مولانا حسرت کی طرح وہ سچے، کھرے حق گو اور بے باک انسان تھے۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔

خلیق انجم

حرفِ آغاز

حسرت کے کسی شعر یا مصرعے کو اتنی شہرت شاید ہی نصیب ہوئی ہوگی جتنی ان کے اس مصرعے کے حصے میں آئی ہے:

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی!

حسرت کے مزاج کی یہ طرفگی یوں تو ان کی سیاسی زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں نظر آتی ہے، تاہم سب سے زیادہ ان کی سیاسی زندگی پر چھائی تھی۔ اور یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ بیسویں صدی کے ہندستان کی تاریخ میں چند ہی ایسی سیاسی شخصیتیں ملیں گی جن کی زندگی کا مطالعہ اتنا دلچسپ ہو، جتنا حسرت کی زندگی کا ہے۔

سیاست کے مردِ میدان ہونے کے علاوہ حسرت کی اور حیثیتیں بھی ہیں۔ وہ شاعر تھے اور فنِ شاعری کے نقاد بھی۔ انھوں نے خاصا ضخیم دیوان چھوڑا اور فنِ شاعری کے معائب و محاسن پر انھوں نے متعدد رسائل بھی لکھے۔ قدیم شعرا کے دواوین بھی مرتب کرکے شائع کیے۔ ان سب میدانوں میں انھیں جو شہرت نصیب ہوئی، وہ ان کے بہت سے معاصرین کے لیے وجہ رشک رہی ہوگی۔
حسرت کو موضوعِ قلم بنانے والوں نے ان کی شاعری کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ لیکن ان کے مزاج کو شاعری سے کہیں زیادہ سیاست سے لگاؤ تھا۔ وہ شاید سیاست ہی کے لیے بنائے بھی گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاسی زندگی کا رنگ جوں جوں چوکھا ہوتا گیا ان کی شاعری کا رنگ پھیکا پڑتا گیا۔ چناں چہ ان کے آخری دور کی شاعری تو بڑی حد تک بے آب و رنگ نظر آتی ہے۔

حسرت کی چند خصوصیتیں دل چسپ اور قابلِ ذکر ہیں۔ ملک کے سیاسی حلقوں میں ان کو ہمیشہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا گیا، لیکن ان کا کوئی پیرو نہ تھا۔ حسرت جیسی قد آور شخصیت کے لیے یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر یہ حقیقت، کہ ان کی تقلید کرنے والا، یا ان کے افکار سے کلی اتفاق کرنے والا، بیگم حسرت کے علاوہ، کوئی نہ تھا۔ اور بیگم کی وفات کے بعد وہ یکہ و تنہا رہ گئے تھے۔ لیکن وہ جہاں بھی رہے اپنی بات منوانے پر ہمیشہ اڑے رہے مگر کامیابی ان کے حصے میں شاید کبھی نہیں آئی۔

کانگرس کے قیام ہی کے وقت سے کچھ نہ کچھ مسلمان اس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوتے رہے تھے، ان میں سے چند علی گڑھ کے فارغ التحصیل بھی تھے لیکن حسرت جس پر جوش انداز میں کانگرس کے ممبر بنے تھے اور جس سرگرمی سے انھوں نے کانگرس کے مقاصد کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دی تھی اس کی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

سب سے زیادہ حیرت ناک یہ ہے کہ حسرت نے کانگرس کے اس بازو سے وابستگی پیدا کی تھی جو انتہا پسند تھا، اور جس کے لیڈر تلک تھے۔ باغیانہ مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں ماخوذ و سزایاب ہونے والے حسرت پہلے مسلمان صحافی تھے۔ جیل میں ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، وہ چوروں اور ڈاکوؤں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا ہے۔

حسرت کو ایک اولیت اور حاصل تھی، جس کا جد و جہد آزادی کی تاریخ میں ذکر کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ تھی کہ ۱۹۲۱ء میں مکمل آزادی کی اور برطانیہ سے قطعی قطع تعلق کی قرارداد ان ہی نے سب سے پہلے احمد آباد میں کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں میں پیش کی تھی، جس کو اس وقت کسی نے قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔

حسرت نے آزادی کی جس تڑپ کا مظاہرہ احمد آباد میں کیا تھا، وہ ۱

کوئی نیا جذبہ نہیں تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں یہ جذبہ ان کے اندر پیدا ہوا، اور وہ مسلسل اس کی پرورش کرتے رہے۔ ان کے دیوان اول (۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۲ء) میں ان کی ایک طویل مسلسل غزل ملتی ہے، جس کا ایک شعر یہ ہے:

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سر بلند سے یاس کا انسداد کر

اسی آرزو کی تکمیل کو انھوں نے زندگی کا مشن بنایا اور لیلائے سیاست کے ناقے کے پیچھے پیچھے نصف صدی تک وہ دیوانہ وار پھرتے رہے۔ ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں سے انھوں نے ناتا جوڑا۔ اپنی سیاسی زندگی کا پہلا نصف حصّہ کانگرس میں بسر کیا، اور دوسرے نصف میں کبھی کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل میں پیش پیش رہے، کبھی جمعیتہ العلماء سے وابستہ ہوئے، کبھی مسلم لیگ سے اور کبھی فارورڈ بلاک سے اور جہاں کہیں مایوسی سے سابقہ پڑا، ہمت سر بلند سے، کام لے کر اس عزم کے ساتھ انھوں نے یاس کا انسداد کیا:

ہو جور و جفا یا ظلم و ستم، ہٹنے کے نہیں پیچھے قدم
جس نے یہ کہا دب جائیں گے ہم، واللہ خیالِ خام کیا

حسرت کی یہ خوش نصیبی تھی کہ 'نجات ہند' کی جد و جہد میں عملی حصّہ لینے کی انھیں سعادت نصیب ہوئی، اور اس سلسلے میں انھوں نے جور و جفا اور ظلم و ستم کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ان کے قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ اس سے بھی بڑی ان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس دنیا کو خیر باد کہنے سے قبل ان کی 'نجات ہند' کی آرزو پوری ہو گئی اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے ملک کو آزاد ہوتے دیکھ لیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس آزادی سے وہ کلّی طور پر مطمئن نہیں تھے، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندستان نے برطانیہ سے قطعی ترک تعلق نہیں کیا تھا۔

حسرت دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ ان کی خواہش تھی، اور اس پر ان کو اصرار تھا کہ ملک کا دستور 'آئین سوویٹ' کے مطابق ہو۔ لیکن ملک

جن حالات میں آزاد ہوا تھا، اور جو قوتیں اس آزادی کو بروئے کار لائی تھیں وہ حسرت کی خواہش کی تکمیل کی راہ میں حائل ہوگئیں حسرت نے احتجاجاً دستور کے مسودے پر دستخط کرنے ہو/ سے انکار کر دیا۔ اور دستور کے نفاذ کے کچھ ہی دنوں کے بعد اس یقین کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے کہ:

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سوویت
دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

۱

حسرت کے عہد کا پس منظر

اگر ہم بہت پیچھے کی طرف نہ جائیں تو انیسویں صدی کے دوسرے نصف کو حسرت کی سیاسی زندگی کے پس منظر کا عہد قرار دے سکتے ہیں۔ ان کی سیاسی زندگی کی تشکیل میں اور ان کے سیاسی کردار کے سانچے کو تیار کرتے ہیں اسی عہد کی دو اہم تحریکوں کا بنیادی حصہ تھا، جن کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد تھی۔ ان میں سے ایک، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی تھی، جو سراسر انگریز دشمنی کے جذبات کی پیداوار تھی۔ اس نے حسرت کو بالواسطہ متاثر کیا تھا۔ دوسری تحریک جس نے حسرت کو براہ راست متاثر کیا وہ سید احمد خاں کی تحریک تھی، جو یک سر انگریز دوستی کے نصب العین پر مبنی تھی۔

موخر الذکر تحریک کے جلو میں، بغاوت کی ناکامی کے اٹھائیس سال بعد اور حسرت کی پیدائش سے چھ سال قبل، ۱۸۷۵ء میں، مدرستہ العلوم کا قیام عمل میں آیا۔ اسی مدرسے نے آگے چل کر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل اختیار کی، جو حسرت کی مادر درس گاہ بنا، اور برصغیر ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۸۵۷ء کا میدان کار زار بننے کا فخر شمالی ہند کے بیشتر علاقوں کی طرح اودھ کو بھی حاصل ہوا تھا۔ حسرت کو اسی علاقے سے وطنی نسبت تھی۔ احمد اللہ شاہ، حضرت محل، تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خاں کا تعلق بھی اسی سرزمین اودھ سے تھا، جنھوں نے ہندستان کی جدوجہد آزادی کے اس باب کو اپنے خون سے لکھا تھا۔ بخت خاں بھی اودھ ہی کی دھرتی کا سپوت تھا، جس نے دہلی جا کر داد شجاعت

دی تھی اور پھر لڑتے لڑتے بغاوت کی تاریخ کے غبار میں ایسا چھپا کہ اس کا نشان بھی کسی کو نہ مل سکا۔ انگریزی راج کے دوبارہ قیام کے بعد شمالی ہند کے اور خطوں کی طرح اودھ کے علاقے کو بھی بدترین برطانوی انتقام کا سامنا کرنا پڑا ہوش سنبھالنے کے بعد حسرت نے ۱۸۵۷ء کے معرکۂ آزادی کی ولولہ انگیز داستانیں ضرور سنی ہوں گی اور جذبۂ انتقام سے سرشار انگریزوں کے بے پناہ مظالم کے واقعات سے ان کے کان یقیناً آشنا ہوئے ہوں گے۔ آگے چل کر حسرت نے 'نجات ہند' کا جو خواب دیکھا اور اسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے انگریزی اقتدار سے لوہا لینے کا جو عزم ان کے اندر پیدا ہوا، اس کا رشتہ ۱۸۵۷ء کے معرکۂ آزادی کے جیالے سورماؤں کے کارناموں سے اور ہولناک انگریزی مظالم سے جوڑنا غلط نہ ہوگا۔

بغاوت کی ناکامی نے برائے نام مغلیہ حکومت کے ساتھ ساتھ کمپنی بہادر کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا جس نے ایک صدی تک ۔۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ۔۔ ہندستان میں صنعتی تباہ کاری، معاشی غارت گری اور سیاسی افراتفری کا بازار گرم رکھا، جسے دیکھ کر مصحفی چیخ اٹھا تھا:

ہندستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

کمپنی کی حکومت کی جگہ برطانوی پارلیمنٹ نے لی۔ حکومت کی اس تبدیلی کے بارے میں حسرت کے ایک ہم وطن صوبیدار سیتا رام نے، جو ضلع اناؤ ہی کا رہنے والا تھا۔ تبصرہ کرتے ہوئے یہ بڑے پتے کی بات کہی تھی:

"ہمارے پنڈتوں نے یہ تو بتایا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت ختم ہو جائے گی، کیوں کہ اس وقت بڑی لڑائی (جنگ پلاسی) کے سو سال پورے ہو چکے ہوں گے۔ مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا تھا

کر کمپنی کی حکومت کی جگہ پر ایک دوسری انگریزی حکومت قائم ہوگی، جو اپنے پیش رو سے جابر تر اور دشوار تر ہوگی[۱]،،

اسی جابر تر اور دشوار تر برطانوی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی برصغیر ہند کی سیاسی تاریخ کے ایک نئے باب کا بھی آغاز ہوا، جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ملکی زندگی کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں بھی شروع ہوئیں۔ بعض علاقوں میں جو شمالی ہند سے دور تھے، نئے قومی شعور کا ظہور ہوا۔ اکثر شہروں میں ایسی انجمنیں قائم ہوئیں، جنھوں نے مغربی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے پردے میں قومی حس کو بیدار کرنے کی خدمت بھی انجام دی۔ قومی حس کی بیداری نے سیاسی شعور کو بیدار کیا، جس نے رفتہ رفتہ انگریز دشمنی کے جذبات کو جنم دیا۔

شمالی ہند میں بھی مغربی تعلیم کی رو آئی، لیکن یہاں اس نے اور علاقوں سے بڑی حد تک مختلف شکل اختیار کی۔ بغاوت کا مرکز ہونے کی وجہ سے اس علاقے کو بے پناہ انگریزی مظالم کا چوں کہ سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے یہاں کے بسنے والوں کے دلوں میں انگریزی اقتدار سے نفرت کے ساتھ ساتھ اس کی بے اندازہ ہیبت بھی طاری کی، جس نے سیاسی شعور کے ابھرنے کی راہیں روک لیں۔

شمالی ہند کی تاریک فضا میں سید احمد خاں کی ذات امید کی کرن بن کر نمودار ہوئی، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے مینارۂ نور کی شکل اختیار کر لی۔ وہ ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک معزز و سربرآوردہ خاندان میں پیدا ہوئے، جس نے مغلوں کے عہد میں عروج حاصل کیا تھا۔ خود سید احمد خاں کے بیان کے مطابق سید متقی کو دو دربار شاہی میں پشتینی رسوخ حاصل تھا[۲]،،

۱۔ صوبیدار سیتا رام: فرام سی پوے ٹو صوبے دار: ص ۱۷۵

۲۔ سرسید: سیرت فریدیہ: ص ۲۴

لیکن سید احمد خاں نے، اپنے نانا خواجہ فرید الدین کے نقشِ قدم پر چل کر، ۱۸۳۸ء میں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی ادنا ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا، اور اپنی خدا داد صلاحیت و قابلیت کے بل پر ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا جب آغاز ہوا تو وہ صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ ان دنوں یہی عہدہ ہندستانیوں کے لیے سرکاری ملازمت کی معراج تھا۔

بغاوت کے دوران میں انھوں نے کمپنی کی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اس حد تک ثبوت دیا تھا کہ بغاوت کے خاتمے کے بعد جب ہر ہندستانی کو، خصوصاً ہندستانی مسلمانوں کو، قابلِ گردن زدنی سمجھا جاتا تھا، جدید برطانوی حکومت نے ان کو اپنا وفادار دوست سمجھا۔ اسی کے بل پر سید احمد خاں نے ہندستانیوں کی وکالت کی قابلِ قدر خدمت انجام دی۔

بغاوت کی ناکامی کے بعد سید احمد خاں نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ ملکی زندگی کے میدان میں بھی قدم رکھے۔ ان کی ملکی خدمات کا نقطۂ آغاز مسلمانانِ مراد آباد کے اس جلسے کو قرار دیا جا سکتا ہے، جو ان ہی کے ایما سے ملکہ وکٹوریہ کے اعلانِ معافی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔

سید احمد خاں نے حالات کا جائزہ لیا اور اس سوال پر انھوں نے غور کیا کہ "قوم پر یہ [۱۸۵۷ء کی] مصیبت کیوں پڑی، اور کیوں کر دور ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ملا کہ قوم میں تعلیم و تربیت نہیں تھی، اور انگریزوں سے، جن کو خدا نے ہماری قوم پر مسلط کیا ہے، میل جول اور اتحاد نہ تھا" یہ جواب پاتے ہی انھوں نے "قومی بہتری کے لیے دو اصول قائم کر لیے۔ ایک تعلیم اور دوسرے انگریزوں سے اتحاد و دوستی"۔[۳] اس جواب کو سر سید نے

۳۔ سر سید: مجموعہ لکچرز: ص ۴

گرہ میں باندھ لیا، اور زندگی کے آخری لمحے تک اسی پر کاربند رہے۔ جب وقت کے مرہم کی چارہ سازی سے بے دست و پائی کا احساس کم ہونے لگا تو سید احمد خاں نے مغربی تعلیم کی ترویج و اشاعت کی تحریک شروع کی۔ اس کا بنیادی مقصد چوں کہ اس وسیع خلیج کو پاٹنا تھا جو محکوم و حاکم کے درمیان حائل تھی، اس لیے حکومت کی ہمدردی و اعانت بھی انھیں حاصل ہوئی۔

سید احمد خاں کے پیش نظر قومی حس کو بیدار کرنا تو تھا، لیکن سیاسی تربیت کی طرف توجہ دینے سے انھوں نے ارادی طور پر گریز کیا، بلکہ ان کی تحریک کا اصل اصول یہ تھا کہ ہندستانی، بلا تفریق مذہب و ملت، سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھیں، ملک کے نظم و نسق کو انگریز حکمرانوں کا حق تسلیم کریں اور ہر حال میں انگریزی حکومت کے وفادار رہیں۔ اس نصب العین نے ان کے یہاں اگرچہ عقیدت کی شکل اختیار کر لی تھی، تاہم اس میں نہ تو ان کے ذاتی مفاد ہی کو کوئی دخل تھا اور نہ یہ کسی وقتی مصلحت ہی پر مبنی تھا۔ اسی کو وہ ملک کی فلاح اور قوم کی بہبود کی کنجی سمجھتے تھے۔

۱۸۶۹ء میں سید احمد خاں نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں سترہ مہینے وہاں مقیم رہے۔ انگلستان جانے کے وقت تک، بلکہ انگلستان کے ابتدائی قیام کے زمانے میں بھی، ان کی فکر کا انداز یک سر قومی رہا تھا، اور اس وقت تک انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا، جس میں صرف مسلمانوں ہی کا مفاد ان کے پیش نظر رہا ہو۔ انگلستان کے دوران قیام میں ان کے انداز فکر میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی اور انھوں نے یکایک فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ صرف مسلمانوں ہی کے مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں گے۔ چناں چہ مدرسۃ العلوم کا قیام ان کے اسی انداز فکر کی پیداوار تھا۔

۱۸۸۵ء میں جب کانگرس کا قیام عمل میں آیا تو سید احمد خاں نے اس

یقین کی بنا پر اس کی مخالفت کی کہ ملک کو مخصوصاً مسلمانوں کو اس سے شدید نقصان پہنچے گا۔ چناں چہ کانگرس کے قیام کے دوسرے ہی سال انھوں نے 'جواب آں غزل' کے طور پر 'محمڈن ایجوکیشنل کانگرس' قائم کی، لیکن چند ہی سال بعد اس کے نام میں تھوڑی سی ترمیم ہوئی اور اس میں کانگرس کی جگہ 'کانفرنس' نے لے لی۔ اس تبدیلی سے قبل نیشنل کانگرس کے تیسرے اجلاس (دسمبر ۱۸۸۷ء منعقدہ مدراس) کے موقع پر محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کا دوسرا اجلاس انھوں نے لکھنؤ میں ان ہی تاریخوں میں منعقد کیا، جو نیشنل کانگرس کے اجلاس کی تاریخیں تھیں۔ اسی موقع پر لکھنؤ کے ایک عام جلسے میں سید احمد خاں نے کانگرس کی مخالفت میں پہلی تقریر کی، جو لب و لہجے کے اعتبار سے خاصی سخت بلکہ غیر معتدل تھی۔ اسی تقریر میں انھوں نے کانگرس کے خلاف ہندو اور مسلمان زمین داروں، تعلقہ داروں اور راجاؤں کا متحدہ محاذ بنانے کی تجویز پیش کی، جس نے عملی شکل بھی اختیار کر لی لیکن وہ چل نہیں سکی۔

یہ اتفاق بھی دل چسپ اور قابل ذکر ہے کہ سید احمد خاں نے جس دن کانگرس کے خلاف لکھنؤ میں تقریر کی اس کے چند ہی روز کے بعد نئے سال کے سرکاری اعزازات کی جو فہرست شائع ہوئی اس میں سید احمد خاں کو نائٹ ہڈ کے اعزاز سے نوازا گیا اور 'سید احمد خاں' سے وہ 'سر سید' بن گئے اور پھر ہماری تاریخ میں اسی نام سے مشہور ہوئے۔

کانگرس کے خلاف ہندو مسلمانوں کا متحدہ محاذ بنانے میں سر سید کو جو ناکامی ہوئی تھی اس نے ان کے اندر ہندوؤں کی طرف سے تلخی پیدا کی۔ اس کے ساتھ ہی کانگرس کی مخالفت میں اپنی کوششوں کی رفتار انھوں نے تیز تر کر دی، جو صرف مسلمانوں ہی کی حد تک محدود رہی۔

سر سید کی ابتدائی تعلیمی تحریک سے لے کر مدرسۃ العلوم کے قیام تک جن لوگوں نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا، یا جو ان کے مشیر رہے تھے، ان میں سے بیش تر اصحاب کے نام ہم کو معلوم ہیں، لیکن کانگرس کی مخالفت میں، نیز مسلمانوں کو

کانگرس کا خلاف صف آرا کرنے کے سلسلے میں جو لوگ سرسید کے مشیر اور شریک کار رہے تھے ان میں سوائے مسٹر تھیوڈر بیک کے اور کسی کا نام ہمیں نہیں معلوم ہوتا، جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے جواں سال انگریز پرنسپل تھے۔ کانگرس کے قیام سے دو ہی سال قبل وہ علی گڑھ وارد ہوئے تھے۔ برطانوی کنزر ویٹو پارٹی سے ان کا تعلق تھا۔ ذہین اور طباع ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صاحب قلم بھی تھے۔ کانگرس کی مخالفت میں اور کانگرس کے باب میں سرسید کے نقطۂ نظر کی تشریح و تعبیر اور ان کی حمایت میں مسٹر بیک کے متعدد زور دار مضامین پانیر (الہ آباد) میں اور پھر کتابچوں کی شکل میں شائع ہوتے رہے تھے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی پرنسپلی قبول کر کے ہندستان آنے کا مسٹر بیک کا فیصلہ ان کی سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ تھا۔ گمان غالب ہے کہ برطانوی حکومت کے ایما کو بھی ان کے اس فیصلے میں دخل رہا ہوگا۔ بہر کیف ان کے تدبر اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کا اس سے بڑا اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ علی گڑھ پہنچتے ہی سرسید اور ان کی تحریک پر وہ اس طرح سے چھائے کہ ہندی مسلمانوں کی قیادت کی باگ ڈور بھی ان ہی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اس سلسلے میں شبلی نعمانی کا یہ خیال قابل ذکر ہے کہ "سرسید کی رائے میں جو انقلاب آیا، وہ ان کی ذاتی رائے نہ تھی، بلکہ ایم، اے، او کالج کے پرنسپل مسٹر بیک نے اپنی زبردست شاطرانہ چال سے سرسید کے دل میں یہ بٹھا دیا کہ ... انگریزوں کی دوستی میں دراصل کالج کا اور مسلمانوں کا فائدہ ہے۔"[۸]

۸۔ شبلی نعمانی: مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ، مسلم گزٹ (لکھنؤ): ۱۴ اپریل ۱۹۱۲

۲

ابتدائی زندگی

بیسویں صدی کے ہندستان کی سیاسی تاریخ میں سید فضل الحسن حسرت موہانی (۱۸۸۱ء تا ۱۹۵۱ء) منفرد شخصیت کے مالک، بلکہ آپ اپنی مثال تھے۔ انھوں نے نہایت مبارک اور یادگار عہد پایا تھا۔ ہندستان کی جد وجہد آزادی اسی عہد میں نقطۂ عروج کو پہنچی اور اس میں حصہ لینے کی سعادت حسرت کے حصے میں بھی آئی، اور پھر اسی عہد میں ملک کو غیر ملکی غلامی سے نجات ملی۔

حسرت کی زندگی کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے متضاد عناصر سے ان کا خمیر تیار کیا تھا۔ ایک طرف شاعر کا نرم ونازک دل لے کر وہ اس دنیا میں آئے تھے، دوسری طرف جنگ وجدال کی کہانیوں سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ چنانچہ بچپن میں "ان کو وہ ایسی کہانیاں بہت پسند آتیں جن میں لڑائیوں کا ذکر ہوتا۔ پرانے رزمیہ قصوں سے بہت متاثر ہوتے اور یہ شوق عرصے تک باقی رہا۔" اپنی قید وبند کے دوسرے دور (۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۸ء) میں جب "وہ کھوتے میں نظر بند تھے تو گاؤں کے تمام بچوں کو اکٹھا کر کے قدیم رزمیہ قصے، جسے آلہ کہتے ہیں، سننے سنانے کا انتظام کرتے۔"[۱]

اسی طرح قدرت نے ایک بے تاب اور پارہ صفت دماغ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بات پر اڑنے کا اور ضد کا مادہ بھی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جس نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا۔ متضاد صفات کی مثالیں ان کی زندگی میں بے شمار

۱۔ والدہ بیگم: حسرت کی خانگی زندگی؛ اردو ادب دعلی گڑھ) حسرت نمبر

ملتی ہیں۔ طالب علمی کے آخری دور کے بعض تجربات نے ان کے ذہن کا رخ سیاست ہی کی طرف موڑ دیا، اور پھر وہ اسی کے ہو رہے۔ سیاست میں بھی ان کے مزاج کی پارہ صفتی کے ساتھ ساتھ ضد بھی ان کی پوری سیاسی زندگی میں شدت کے ساتھ کار فرما رہی۔

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے چار سال قبل، ۱۸۸۱ء میں، اودھ کے قصبۂ موہان میں حسرت پیدا ہوئے۔ ان کا نام فضل الحسن اور حسرت تخلص تھا لیکن ہماری تاریخ میں اپنے تخلص اور وطن کی نسبت سے حسرت موہانی کے نام سے وہ کچھ اس طرح مشہور ہوئے جیسے لوگ ان کا اصلی نام بھول ہی گئے ہوں۔ ایک غزل کے مقطع میں انھوں نے فخریہ لہجے میں شکوہ بھی کیا تھا:

جب سے عشق نے کہا حسرت مجھے — کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

مگر اس شکوے کے باوصف وہ خود بھی اپنے کو 'حسرت' یا 'حسرت موہانی' ہی کہتے اور لکھتے بھی تھے۔ یہی حال ان کی بیوی نشاط النساء کا بھی تھا۔ حسرت کے علی گڑھی احباب کی طرح وہ مخاطب تو کرتی تھیں انھیں 'مولانا' کہہ کر لیکن خطوط میں ان کو 'حسرت' ہی لکھتیں اور آخر میں اپنا نام بھی بالعموم 'بیگم حسرت' یا 'بیگم حسرت موہانی' ہی لکھا کرتی تھیں۔

موہان کے ایک خوش حال گھرانے میں حسرت پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید اظہر حسن کو "اپنی والدہ کی طرف سے تحصیل کھجوا، ضلع فتح پور میں تین گاؤں وراثتاً ملے تھے[۲]"۔ زندگی کے ابتدائی ماہ و سال انھوں نے موہان ہی میں بسر

۲۔ نیاز فتح پوری: تذکرۂ حسرت: نگار (لکھنؤ) حسرت نمبر: جنوری فروری ۱۹۵۲ء: ص ۷

گیے۔ ان کا لڑکپن نانی کے مکان میں گذرا۔ یہ ایک بہت بڑا اور قدیم وضع کا مکان تھا... حسرت کی بہن کہتی تھیں کہ نماز [فجر] کے بعد ہم سب لوگ دالان میں تختوں پہ جمع ہو جاتے۔ والدہ صاحبہ بھی آ جاتیں اور دستر خوان بچھتا۔ والدہ صاحبہ سب کو چینی کے پیالوں میں دودھ، اس میں باسی چپاتی اور شکر ڈال کر دیتی جاتیں، اور ہم لوگوں کو یہ ناشتہ بہت اچھا معلوم ہوتا۔ موہان میں مشہور تھا کہ شہر بانو [والدۂ حسرت] کے ہاں ناشتہ بہت سویرے ہو جایا کرتا ہے[۳]۔"

مکتب سے لے کر مڈل [اردو ہندی] تک کی تعلیم حسرت نے موہان ہی میں حاصل کی۔ ان کے اس دور کی جدّت طبع کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ مڈل کا امتحان دینے سے قبل ان کو خیال ہوا کہ ایک ہی وقت میں یہ امتحان دو مقامات سے دیا جائے۔ چناں چہ ایک امتحان تو موہان کے مقامی اسکول سے دیا اور دوسرے امتحان کے لیے موہان کے قریب ایک مقام جھلوتر جانا پڑا۔ کوئی ساتھ جانے والا نہ تھا۔ آخر اسکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت لچھمی نرائن خود جانے کے لیے تیار ہوئے۔ دو ڈولیاں بلائی گئیں اور دونوں استاد شاگرد ان میں بیٹھ کر وہاں پہنچے۔ نتیجہ نکلنے پر معلوم ہوا کہ دونوں امتحانوں میں اول آئے ہیں۔ پنڈت جی نے ان کی والدہ سے کہلا بھیجا کہ لڑکا بڑا ہونہار ہے۔ خیر و برکت کے لیے ہاتھ میں نیلا ڈورا باندھ دیجیے[۴]"

موہان میں صرف مڈل ہی تک کی تعلیم کا انتظام تھا، اس لیے آگے کی تعلیم کے لیے ۱۸۹۳ء میں حسرت کو فتح پور بھیجا گیا، جو موہان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ وہیں سے ۱۸۹۸ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

۳۔ رابعہ بیگم: متذکرہ

۴۔ ایضاً

حسرت کی پانچ سالہ اسکولی زندگی اور ان کے اساتذہ کے بارے میں معلومات ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ان کے پہلے سوانح نگار عارف ہسوی کی وساطت سے ہمیں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اسکول کی نصابی تعلیم کے علاوہ فارسی و عربی کی کتابیں مولانا سید ظہور الاسلام... اور مولوی حبیب الدین... سے پڑھیں[۵]،، یہی بات نیاز فتح پوری نے بھی لکھی ہے اور فارسی پڑھانے والوں میں اپنے والد نور محمد خاں کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے[۶]

عارف ہسوی کے بیان کے مطابق "حسرت کی شاعری کی نشو و نما اور پرورش فتح پور ہی میں ہوئی[۷]،، لیکن فتح پور جانے سے پہلے موہان ہی میں انھوں نے شاعری شروع کر دی تھی۔ عشق کی لذت سے بھی وہیں آشنا ہو چکے تھے، اور اسی نے ان کی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی[۸]۔ اودھ کے اور قصبات کی

۵۔ عارف ہسوی: حالات حسرت: ص ۳ (یہی حسرت کی پہلی سوانح عمری ہے جسے انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی نے ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸-۱۹ء میں شائع کی تھی۔

۶۔ نیاز فتح پوری: متذکرہ: ص ۷

۷۔ عارف ہسوی: متذکرہ: ص ۵

۸۔ حسرت کی ایک عزیز خاتون رابعہ بیگم کا بیان ہے کہ "موہان کے مقامی اسکول میں ہی پڑھتے تھے کہ شعر و شاعری سے نہ صرف دلچسپی ہو گئی بلکہ اشعار بھی کہنے لگے... ان کا یہ ابتدائی کلام صرف شعرا کی تقلید میں، یا رو کھا پھیکا نہ ہوتا تھا... یہ زیادہ تر عشق و عاشقی کے رنگین قصے ہوتے... یہ قصے ان کی زندگی کے ابتدائی تجربات تھے، ہوائی باتیں نہ تھیں... وہ ان کے قریبی عزیز ان کے اس زمانے کے متعلق گفتگو کرتے وقت زیر لب مسکراتے ہیں کبھی اڑتا اڑتا کوئی نام سنائی دیتا ہے کبھی خوب صورت پہنچیوں کا ذکر ہوتا، جو خربوزے کے بیج ول کو پیلا اور سرخ رنگ کر بنائی گئی تھیں اور ہدیۂ شوق کے طور پر پیش ہوئی تھیں۔،،

—— رابعہ بیگم: متذکرہ: ص ۹۵

طرح موہان کی سرزمین بھی حسرت کے عنوانِ شباب میں خاصی جنوں خیز واقع ہوئی تھی۔ ان کا یہ شعر غالباً اسی دور کی یادگار ہے:

موہان کے کوچے کیا رسوائی کے مسکن تھے　　جو شخص نظر آیا، بدنام نظر آیا

موہان کے کوچوں کی رسوائی و بدنام حسرت کے حصے میں بھی آئی، جسے ابتدائی دور کی اپنی غزلوں میں مزے لے لے کر انھوں نے بیان بھی کیا ہے۔ ان کی اسی دور کی ایک غزل کا مقطع ہے:

یادِ ایام کہ ہم جوشِ جنوں میں حسرت　　خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں

یا ان کے یہ اشعار:

طعنِ احباب سنے، سرزنشِ خلق سہی　　ہم نے کیا کیا تری خاطر سے گوارا نہ کیا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی　　اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

کلیاتِ حسرت کے آخر میں ضمیمۂ دیوانِ حسرت کے عنوان سے ان کی وہ غزلیں ملتی ہیں جو ۱۸۹۴ء سے لے کر ۱۹۰۳ء تک انھوں نے کہی تھیں۔ اس مجموعے کے بیشتر اشعار ان کے عشق کی مختلف منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اکثر اشعار، بلکہ بعض پوری پوری غزلیں عشق میں ان کی ناکامی کا بھی اعلان کرتی ہیں۔ مثال کے لیے اس غزل کو لیجیے، جو موہان ہی میں ۱۹۰۰ء میں کہی گئی تھی۔

ہجر میں ضبطِ غمِ شوق کا دعوا چھوٹا　　ہاتھ سے دامنِ صبرِ دلِ شیدا چھوٹا

ہم سے اس شوخ سے اگلی سی محبت نہ رہی　　گلہ، ترکِ ملاقات کا جھگڑا چھوٹا

اب نہیں کوئی بھی ارماں، خوشا ناکامی　　ایک آفت سے دلِ وقفِ تمنا چھوٹا

نہ رہی دشت نوردی کی ہمیں بھی حسرت　　ہم سے جس روز سے وہ بادیہ پیما چھوٹا

اس غزل کے فوراً ہی بعد جو غزل ملتی ہے وہ بھی موہان ہی میں ۲۰ ستمبر ۱۹۰۰ء کو کہی گئی تھی، اس کا یہ مطلع بھی مندرجہ بالا غزل کی صدائے بازگشت ہی ہے:

چشمِ پُر خون سے بہا کرتا ہے کاک نالا پڑا　　آہ کس نا آشنا سے تھا ہمیں پالا پڑا

جنوری ۱۹۰۲ء کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین میں 'ونظم' کے عنوان سے حسرت کی ایک طویل نظم ملتی ہے، جو یقیناً ۱۹۰۱ء کے اواخر میں لکھی گئی ہوگی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے جوش جنوں نے اپنے لیے ایک نیا 'بادیہ' ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

سر سے سودائے بتانِ بے وفا جاتا رہا
ہوگیا ہے دل ولائے قوم سے رشکِ چمن
بے خودی ہائے محبت سے نہیں کچھ واسطہ
ہم سمجھتے ہیں اب ایسے شوق کو دیوانہ پن
محوِ حبِ قوم را از ہر دو عالم کار نیست
با ہمہ بے گانہ و ہم بے خبر از خویشتن
از فراقِ یار اینک ہیچ آزارے نماند
ہجر جاہِ قوم آتش می زند اندر بدن

کلیات حسرت کے حصہ اوّل (۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۹ء) میں ایک طویل غزل ملتی ہے، جس کا یہ مطلع خاصا مشہور ہے:

توڑ کر عہدِ وفا نا آشنا ہوجائیے
بندہ پرور جائیے، اچھا خفا ہوجائیے

اس مطلع کے تیور سے قطع نظر، اسی غزل میں کچھ قطعہ بند اشعار بھی ملتے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہوجائیے
دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجیے نکال
آرزوئے شوق سے نا آشنا ہوجائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دل مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرتؔ جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے

'مہمان قضا' ہونا تو خیر حسرت کے اختیار سے باہر تھا ہی، لیکن آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جانا بھی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کے کلیات کے اشعار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ قدرت نے پرستش کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ایک ستم پرور کی یاد تو انھوں نے دل سے نکال دی، لیکن ان کے جذبۂ پرستش نے اپنی آسودگی کے لیے ایک نیا صنم تراش لیا، جس کا کوئی مادی وجود نہ تھا، اور پھر سب کچھ تج کر وہ اسی کے ہو رہے۔ اسی غیر مرئی پیکر کی پرستش ہی کو انھوں نے زندگی کا نصب العین بنایا۔ حسرت کے دیوانِ اول ہی میں ان کا یہ شعر بھی ملتا ہے:

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

'نجات ہند' کی آرزو کا یہ دیا حسرت کے صنم خانۂ دل میں کس طرح روشن ہوا؟ یا یہ سودا ان کے سر میں کیوں کر سمایا؟ ان سوالوں کے واضح جواب ہمارے دسترس سے باہر ہیں۔ حسرت کے کسی بھی سوانح نگار نے ان کے فتح پور کے زمانۂ طالب علمی کا کوئی ایسا واقعہ بیان نہیں کیا ہے۔ جس کا سیاست سے حسرت کی دل چسپی کا رشتہ جوڑا جا سکے۔

حسرت نے علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے جو ابتدائی دو ڈھائی سال بسر کیے تھے وہ کسی بھی طالب علم کے دل میں 'نجات ہند' کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے قطعاً ناسازگار تھے۔ سیاسی فکر سے قطع نظر علمی و ادبی مذاق پیدا کرنے کی طرف بھی وہاں کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی۔ اسی دور کے بارے میں سر رضا علی

نے لکھا ہے کہ "میرے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والوں کی خاص قدر تھی۔ ادبی ذوق پیدا کرنے یا علمی ذوق بڑھانے یا ان کی ہمت بندھانے کا خیال نہ تو اساتذہ کو تھا، نہ ٹرسٹیوں کو۔ [کالج کے پرنسپل] مسٹر بیک کھلم کھلا فرماتے تھے کہ رنجیت سنگھ جی (کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جو بعد میں نوانگر کے مہاراجا ہوئے) دادا بھائی نوروجی (پارلیمنٹ کے پہلے ہندوستانی ممبر) سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ مسٹر بیک کے چہیتے طلبا صرف کھلاڑی تھے... ادبی ذوق رکھنے والے طلبا کی موجودگی صرف روا رکھی جاتی تھی۔ وہ کسی تحسین و آفریں کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے۔"[9]

ڈاکٹر سید عابد حسین نے یہی بات واضح تر الفاظ میں کہی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق کالج کی زندگی میں "زیادہ زور ایسے وضع و لباس، اخلاق و آداب، کھیل اور ورزشوں پر دیا جاتا تھا۔ جن کے ذریعے سے انگریز حاکموں کی خوشنودی اور قربت حاصل ہو سکے۔[10]"

کالج کے ابتدائی دور میں حسرت کے علی گڑھ پہنچنے سے دس بارہ سال قبل جب برطانیہ پرستی نے وہاں عریاں شکل اختیار نہیں کی تھی، کالج کے فارغ التحصیل دو ایک ایسے طالب علموں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے سرسید کی وضع کردہ سیاسی ڈگر کو نظر انداز کر کے ۱۸۸۶ و ۱۸۸۷ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاسوں میں شرکت کی تھی لیکن یہ وہ لوگ تھے جو "بقول میر ولایت حسین سب سے پہلے ولایت گئے اور... آزادی کی فضا میں رہنے کی وجہ سے آزادی کی خواہش ساتھ لائے تھے اور اپنا میلان کانگرس کی طرف رکھتے تھے"، لیکن ان اصحاب کی طرح حسرت کو انگلستان جانے اور "آزادی کی فضا میں رہنے" کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان میں اور حسرت میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ آزادی کی تڑپ نے ان کے اندر جنون کی وہ شکل اختیار نہ کی تھی، جو حسرت کے حصے میں آئی تھی۔

۹۔ سر رضا علی: اعمال نامہ: ص ۷۵، ۷۶

۱۰۔ ڈاکٹر عابد حسین: سرسید کا خواب اور اس کی تعبیر: علی گڑھ تحریک مرتبہ نسیم قریشی: ص ۱۳

۱۱۔ میر ولایت حسین: آپ بیتی یا ایم۔ اے۔ او کالج کی کہانی: ص ۲۳

۳

محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج

انیسویں صدی کے آخری برسوں میں علی گڑھ تحریک اور محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج کی تاریخ میں تین ایسے واقعات پے بہ پے پیش آئے، جنھوں نے تحریک اور کالج دونوں پر اپنے گہرے سائے ڈالے۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید احمد خاں نے وفات پائی جو تحریک اور کالج دونوں کے بانی تھے۔ ستمبر ۱۸۹۹ء میں کالج کے ذی اقتدار پرنسپل تھیوڈر بیک بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے جو تحریک اور کالج دونوں کے باب میں سرسید کے ذہن شناس ہونے کے علاوہ سرسید کی زندگی کے آخری دور میں ان کے دست راست بھی رہے تھے۔[۱] تیسرا واقعہ ایم، اے، او کالج میں حسرت کا ورود تھا، جو سرسید کی وفات کے دو ڈھائی ماہ بعد اور بیک کے انتقال سے دو ڈھائی ماہ قبل پیش آیا اور مستقبل میں پیش آنے والے بہت سے ہنگاموں کا پیش خیمہ تھا۔

ایم، اے، او کالج میں حسرت کے ورود کے سلسلے میں دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ میٹرک کا امتحان چوں کہ اوّل درجے میں انھوں نے پاس

۱۔ بیک کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سرسید نے اپنے سوانح نگار انگریز دوست گریہم کو لکھا تھا کہ "وہ نام نہاد کانگرس کی مخالفت کا کام بھی میں نے اپنے سر لے لیا ہے... بیک سے مجھے بے حد مدد ملی ہے۔ وہ نہ ہوتے تو بڑی دشواریاں پیش آتیں، بلکہ کام کو آگے بڑھانا ناممکن ہو جاتا۔"

—— گریہم: سید احمد خاں (انگریزی)؛ ص ۲۷۳

کیا تھا اس لیے کالج کے سربراہوں نے ان کو علی گڑھ آنے کی اور داخلہ لینے کی دعوت دی تھی۲۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حسرت خود ہی علی گڑھ کالج میں داخلہ لینے کے خواہش مند تھے، اور بڑی مشکلوں سے انھیں اس کی اجازت ملی تھی: "ان دنوں علی گڑھ جانا ولایت جانے سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ حسرت علی گڑھ جانے لگے تو گھر میں بہت رونا دھونا مچا۔ بازو پر امام ضامن باندھے گئے اور بادلِ ناخواستہ رخصت کیا گیا۳"۔ اس اقتباس سے، نیز جس وضع قطع سے حسرت علی گڑھ پہنچے تھے، اس سے بھی، اودھ کے اس دور کے قصباتی کلچر کی ہلکی سی تصویر نظر آتی ہے۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ علی گڑھ پہنچنے کے بعد جب "یہ حضرت یکے سے اتر کر بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئے تو ڈھیلا پائجامہ پہنے تھے، پاؤں میں گتھیلی جوتی، ہاتھ میں پاندان، اس ہیت کذائی کو دیکھتے ہی یاردل نے 'خالہ جان' کی پھبتی کہی۴۔۔۔" ایک دوسرے عینی شاہد نے اس بیان پر یہ دلچسپ اضافہ کیا ہے: "ان ایام کے نوواردوں میں کوئی بھی بہ لحاظ شکل و شباہت، وضع قطع اور چال ڈھال کے اس قدر دلچسپ نہ تھا" جتنا کہ حسرت تھے "چھوٹا قد، لاغر بدن، گندمی رنگ پر چیچک کے مٹے ہوئے داغ، عمر کا لحاظ کرتے ہوئے داڑھی کسی قدر نیچی، فراخ پیشانی اور چہرے کی مسکراہٹ قبانے کو ناگوار نہ ہونے دیتی اس پر کلابتونی ٹوپی، پرانی وضع کا چارخانے کا انگرکھا اور الشرع کا تنگ پائجامہ، جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے۔ عینک اور چھتری کا اضافہ کیجیے تو خالہ جان، یا دوسرے الفاظ میں سید فضل الحسن حسرت موہانی کی صورت

۲۔ عبدالشکور: حسرت موہانی: ص

۳۔ نعیمہ بیگم: حسرت موہانی کی کہانی نعیمہ کی زبانی: ص ۱۹

۴۔ مشتاق احمد زاہدی: بحوالہ قرۃ العین حیدر: کارجہاں دراز ہے: حصہ اول: ص ۱۱۸

چشم تصور میں ابھرنے لگے گی۔ ؎۵

یہ امر حیرت ناک ہے کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے مغرب زدہ ماحول میں اودھ کی قصباتی سج دھج سے وارد ہونے والے حسرت نے جلد ہی اپنی جگہ بنالی۔ وہی طالب علم حسرت کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے جنھوں نے ان کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر 'خالہ جان' کی پھبتی کہی تھی۔ یلدرم کے الفاظ میں "اسے ان کے اوصاف حمیدہ کا نتیجہ سمجھو یا ان کی خوش نصیبی کا کہ پورا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ 'خالہ جان' نے عدم کی راہ لی اور اس کی بجائے 'مولانا' بچے سے بوڑھے کی زبان پر جاری ہوگیا۔" ؎۶ اور ایسا جاری ہوا کہ پھر زندگی بھر اس نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ دوست احباب ہی نہیں، بیگم حسرت بھی ان کو مولانا ہی کہہ کر مخاطب کرتیں، بلکہ خطوط میں بھی جہاں حسرت کا ذکر آتا ان کا نام لکھنے کی جگہ پر اکثر مولانا ہی لکھتیں۔ ؎۷

کالج کے ماحول نے حسرت کی وضع قطع بدلی۔ کلابتونی ٹوپی سر سے جدا ہوئی، چار خانے کا انگرکھا جسم سے اترا، مشروع کا پائجامہ ٹانگوں سے جدا ہوا اور گتھیلی جوتی پاؤں سے الگ ہوئی۔ لیکن انگریزی وضع کا یونیفارم، جو کالج کا مروجہ پہناوا تھا، شاید کبھی بھی حسرت کے جسم کی زینت نہ بن سکا۔ ان کے لباس میں تبدیلی کب اور کیسے آئی؟ اس کا صحیح علم ہم کو نہیں ہے لیکن ایک ماخذ سے ہماری معلومات میں اتنا اضافہ ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں جب وہ "سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے، اڈیٹر اردوئے معلی" بن

۵۔ خانی خاں (سجاد حیدر یلدرم): حسرت ایک قدرداں کی نظر سے:
۶۔ زمانہ (کانپور): جلد ۱۱ نمبر ۶: دسمبر ۱۹۰۸ء ص ۲۹۶
۶۔ ایضاً: ص ۲۹۳۔
۷۔ دیکھئے بیگم حسرت اور ان کے خطوط، مرتبہ عتیق صدیقی

پہنچے تھے تو ان کا حلیہ یہ تھا: "معمولی وضع کی اچکن... سر پر ایک بالکل چپٹی سی ترکی ٹوپی، بے حد گھنی داڑھی... علی گڑھ کی تاریخ میں اس زمانے کو بہ درجۂ اتم انگریزیت کا زمانہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ مذہبیت تو درکنار، یہ خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کالج کا کوئی ایسا گریجویٹ ہوگا، جو روزمرہ اپنے چہرے پر استرا نہ پھیرتا ہو۔"

چہرے پر استرہ پھیرنے کا جہاں تک تعلق ہے، زندگی کے اور معمولات کی طرح اس باب میں بھی حسرت کی روش ابتدائی دور میں کچھ عجیب سی رہی تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ "جب تک داڑھی کی درازی تکلیف دہ نہ ہوتی اس وقت تک اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ مگر تکلیف دہی کی حد تک پہنچنے پر اکثر تیسرے مہینے بالکل صاف کرا دیا کرتا تھا۔" ان کے ایک شاعر دوست نے ایک بار داڑھی نہ منڈانے کی لجاجت کے ساتھ ان سے درخواست کی تو ان کے دل پر اس کا، ایسا گہرا اثر ہوا کہ اس دن کے بعد پھر کبھی داڑھی منڈانے کی نوبت نہ آئی۔"

حسرت نے جو وضع قطع ۱۸۰۳ء میں اختیار کی تھی اس نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا۔ اردوئے معلّٰی کی اڈیٹری سے لے کر آزاد ہندستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبری تک اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہی معمولی سی اچکن، بالکل چپٹی سے ترکی ٹوپی، بے حد گھنی داڑھی کم و بیش نصف صدی تک ان کی رفیق رہی امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ لباس ہی میں نہیں، ان کے مزاج میں اور زندگی کے جملہ معمولات میں بھی ایک نوع کی ربودگی و وارفتگی پیدا ہوگئی تھی۔ ان کے آخری زمانے کا نقشہ یہ تھا: "گول چھدری داڑھی، چھوٹے تال کی عینک، بغیر

۸۔ ہارون خاں شروانی: حسرت کے سیاسی رجحانات: آج کل (دہلی)، جون ۱۹۵۳ء: ص ۵

۹۔ حسرت موہانی: اردوئے معلّٰی جلد ۱۶ نمبر ۳: مارچ ۱۹۲۵ء: ص ۴ و ۵

بھنڈنے کی پرانی ترکی ٹوپی، گھسی لپسی چپل، موزے سے کوئی سروکار نہیں، موٹے کھدر کی پیوند لگی کا واک سی شیروانی، جس کے اکثر بٹن ٹوٹے یا غائب ہاتھ میں بدرنگ سا جوٹ کا تھیلا، دری تکیہ اور موٹی ملگجی سی چادر کا مختصر سا بستر۔''

سفر کی حالت میں ایک مختصر سا ہینڈ بیگ بھی ہوتا تھا، جس کو ہمیشہ بکس کہا کرتے تھے۔ اس میں پانی پینے کے لیے ایک ڈونگا، ایک چھوٹے سے ڈبے میں قلم دوات، سرمہ دانی و سلائی، کنگھا، ایک چھوٹی سی تیل کی شیشی اور ایک آدھ جوڑا کپڑا[11] ہو اسی وضع سے مغربی ایشیا کے ملکوں، نیز یورپ کے بھی، متعدد بار دورے کیے۔

حالی نے غالب کو 'حیوانِ ظریف' کہا تھا۔ غالب کے مزاج میں ظرافت کو جتنا دخل تھا، اس سے کہیں زیادہ حسرت میں حصولِ آزادی کی تڑپ تھی۔ اس اعتبار سے انھیں 'مجنونِ آزادی' کہنا غلط نہ ہوگا۔ ان کی وضع قطع، رہن سہن از جملہ معمولاتِ زندگی ان کے جنون آزادی ہی کے تابع تھے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ 'ام، اے، او کالج کی زندگی میں داخل ہونے کے بعد ہی حسرت میں سیاسی حس' پیدا ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو، لیکن اس کا بھی قوی امکان ہے کہ فتح پور کے دورانِ قیام ہی میں سیاست سے دل چسپی کے جراثیم ان کے اندر پرورش پانے لگے ہوں۔ فتح پور ضلع کا صدر مقام تھا، پانیر کے علاوہ اردو کے اخبارات بھی وہاں ضرور آتے رہے ہوں گے، اور حسرت کی نظر سے بھی گذرتے رہے ہوں گے۔

اس سے قطع نظر مولانا ظہور الاسلام کو ندوۃ العلماء کے قیام سے قریبی تعلق

۱۰۔ رشید احمد صدیقی: کچھ حسرت کے بارے میں نگار (لکھنؤ) حسرت نمبر جنوری فروری ۱۹۵۲ء ص ۲۴

۱۱ مالک رام بیگم: حسرت کی خانگی زندگی: اردو ادب (علی گڑھ) حسرت نمبر ۳ اکتوبر ۱۹۵۱ : ص

تھا، بلکہ وہ "ندوۃ العلماء کے ارکانِ خاص میں تھے۔"[12] ان ہی سے حسرت نے فتح پور میں عربی کے درس لیے تھے۔ ندوہ کے قیام سے مولانا ظہور الاسلام کے قریبی تعلق سے یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ انھیں سیاست سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت سے نفرت بھی ضرور رہی ہوگی۔ ان ہی کی صحبت میں سیاسی معاملات سے حسرت کے ذہنی ربط کی تخم ریزی ہوئی ہوگی۔

حسرت کی پہلی سوانح عمری عارف ہسوی نے ۱۹۱۰ء میں کتابی شکل میں لکھی تھی۔ حسرت کی علی گڑھ کی طالب علمی کے دور کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بیگم حسرت کا یہ قول نقل کیا تھا کہ "زمانۂ طالب علمی ہی سے مولانا حسرت کو سیاسی تحریک کے ساتھ خاص دلچسپی اور ہمدردی رہی تھی۔"[13] یہی بات بعد میں لکھنے والوں نے بھی اپنے اپنے الفاظ میں دہرائی ہے۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل کسی نے بھی قلم بند نہیں کی۔

تفصیل بیان کرنے کی توقع سجاد حیدر یلدرم سے ہوسکتی تھی، جو علی گڑھ میں حسرت کے ہم عصر ہی نہیں ان کے گہرے دوست بھی تھے اور ان کے ذہنی ارتقا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھوں نے عارف ہسوی سے دس سال پہلے حسرت پر ایک طویل مقالہ ۱۹۰۸ء میں لکھا تھا۔ حسرت پر لکھا جانے والا یہی پہلا مقالہ تھا، جو جرمِ بغاوت میں حسرت کے سزایاب ہونے کے فوراً بعد لکھا گیا تھا، اور 'خافی خاں' کے فرضی نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یلدرم نے یہ مقالہ لکھ کر حسرت کے ساتھ دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے قلم کے چہرے پر انھوں نے 'خافی خاں' کے نام کی نقاب ڈال لی تھی اس وقت حکومت اور خداوندانِ کالج

۱۲۔ سید سلیمان ندوی: حسرت کی سیاسی زندگی: نگار (لکھنؤ) حسرت نمبر ص۔ ۲۴

۱۳۔ عارف ہسوی: حالاتِ حسرت: ص ۷

دنوں حسرت کو جس غضب آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے اس کے پیشِ نظر حسرت کے ساتھ علانیہ ہمدردی کا اظہار کرنا آسان نہ تھا۔ حسرت کا جرم، سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں "علی گڑھ کی سلطنت میں بغاوت کا پہلا جرم تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج کی حرمت بچانے کے لیے کالج کے بڑے بڑے ذمہ داروں نے حسرت کے خلاف گواہی دی... یہاں تک کہ نواب وقارالملک نے بھی دو ایک جملوں میں... مذمت ہی کی تھی۔"[۱۴]

ان حالات میں یلدرم کا حسرت کی سیاسی روش کو ان کے "وصف" سے تعبیر کرتے ہوئے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کرنا حیرت ناک نہیں ہے کہ "علمی زندگی کے ساتھ ساتھ حسرت کی عادات میں ایک ایسا وصف بھی نشو و نما پا رہا تھا، جس کا آخری نتیجہ علی گڑھ کے سیشن جج کی عدالت میں نظر آیا، اور اس سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ شخص جو مذہب اور ادب میں قدامت پرست تھا، پالیٹکس میں کانگرس کے مقدمۃ الجیش میں کیوں کر شامل ہو گیا۔ یہ وصف جسے ایک قسم کی نظری کم زوری کہنا چاہیے، گاہے گاہے 'مولانا' کے زمانۂ طالب علمی میں بھی ظاہر ہوا کیا، اور ہر مرتبہ مولانا کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا... اور فردِ سیاہ میں، جو پرنسپل کی میز کے داہنے خانے میں رہتی ہے، اس میں ان کا نام لکھ لیا گیا۔"[۱۵]

یلدرم نے اس کی تفصیل بیان کرنے سے ارادی یا غیرارادی طور پر گریز کیا تھا۔ طالب علموں کی شرارتوں اور ہلڑبازیوں کے چند واقعات انھوں نے ضرور قلم بند کیے ہیں، جن میں حسرت صرف شریک ہی نہیں تھے، بلکہ اپنی انتہاپسند فطرت کی وجہ سے شریکِ غالب بن گئے تھے اور ہر بار ان کا نام

۱۴۔ سید سلیمان ندوی: متذکرہ: ص ۲۵

۱۵۔ ثانی خاں: متذکرہ

پرنسپل کی فردِ سیاہ میں ٹانکا جاتا رہا تھا۔ لیکن ان میں صرف ایک ہی واقعہ ایسا تھا جس کا تجزیہ کرنے کے بعد اس کی تہ میں حسرت کے انگریز مخالف رجحان کا شائبہ ہی نظر آسکتا ہے۔ واقعہ یہ تھا:

"شملے میں علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب سے بازی لی۔ علی گڑھ کے بنی اسرائیل اس پر آپے سے باہر ہوگئے۔ ایک گروہ کثیر تمام آلاتِ موسیقی جو کالج میں دستیاب ہو سکتے تھے یعنی تھالیاں، لوٹے گلاس، کھانے کی سینیاں بجا بجا کر رات کی تاریکی میں شورِ محشر برپا کر تا پھرتا تھا۔ فضل الحسن جنھوں نے اپنی عمر میں نہ کبھی بیٹ چھوا تھا، نہ گیند پھینکا تھا، یہ شور سنتے ہی ایک شکستہ حال کنستر لیے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور تیلی کو حوالۂ خاک کرکے سب سے آگے آگے اپنا کوس بجاتے ہوئے پروفیسروں حتیٰ کہ نواب محسن الملک مرحوم کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فردِ سیاہ میں، جو پرنسپل کے دفتر کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی ہے، ان کا نام لکھ لیا گیا۔"[16]

حسرت کے ایک نوعمر ہم عصر کا بیان ہے کہ: "حسرت کی طبیعت میں بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اور اس کا شاخسانہ یہ نکلا کہ کالج کے پرنسپل مسٹر ماریسن نے (جو بعد میں سر تھیوڈر ماریسن اور وزیرِ ہند کی کونسل کے ممبر ہوئے) حسرت کو اقامت خانے [بورڈنگ ہاؤس] سے نکال دیا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ حسرت کی قابلیت کا سکہ کالج کے سکریٹری نواب محسن الملک اور مقامی ٹرسٹیوں پر نہ بیٹھا ہوتا اور وہ طلبہ میں اتنے مقبول نہ ہوتے تو شاید انھیں کالج سے بھی نکال دیا جاتا۔ مگر پرنسپل کی اتنی

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ہارون خاں شروانی : متذکرہ:

لیکن حسرت کا جرم کیا تھا، اور اقامت خانے سے انھیں کیوں نکالا گیا تھا؟ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

مندرجہ بالا بیان سے ملتی جلتی بات حسرت کی ایک عزیزہ مقالہ نگار خاتون نے بھی لکھی ہے۔ اِن کا بیان ہے کہ "بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی وہ سیاستِ ہند میں دل چسپی لینے لگے تھے، اور تین مرتبہ نعرۂ حریت بلند کرنے پر ایم، اے، او کالج [ہوسٹل] سے نکالے گئے تھے۔[۱۸]" لیکن مقالہ نگار خاتون بھی اس کی وضاحت کرنے سے قاصر رہی ہیں کہ حسرت نے کن موقعوں پر نعرۂ حریت بلند کیے اور ان نعروں کی نوعیت کیا تھی؟

لیکن یہ حقیقت ہے کہ حسرت کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں، محسوس یا غیر محسوس طور پر، "نجاتِ ہند" کی جو آرزو کروٹیں لے رہی تھی کالج کے انگریز اساتذہ، خصوصاً پرنسپل مارلیسن، کو شاید اس کا اندازہ ہو گیا تھا اور ان کی دور رس نگاہوں نے غالباً دیکھ لیا تھا کہ حسرت کے دماغ میں قومی سیاست کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کالج کو خیرباد کہنے، یا خیرباد کہنے پر مجبور ہونے، سے ایک سال پہلے تک پرنسپل مارلیسن کے ساتھ حسرت کے تعلقات بہ ظاہر اس حد تک شگفتہ تھے کہ اپنی اکثر نظموں میں انھوں نے مارلیسن کا مدحیہ انداز میں نام لیا تھا، اور وہ نظمیں یونین کے جلسوں میں سنائی بھی تھیں۔ حسرت جب علی گڑھ پہنچے تو کالج کے پرنسپل مسٹر بیک تھے۔ چند ہی مہینوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ مارلیسن نے لی۔ اس کے بعد ہی یونین کے جلسے میں حسرت نے ایک طویل نظم سنائی، جس کے

۱۸۔ رابعہ بیگم، تذکرہ۔

ایک بند کا آخری شعر یہ ہے:

بیک کے مرجانے سے ویران جلسہ ہوگیا
خاک میں ارمان ملے، خونِ تمنا ہوگیا

اس کے آگے کے بند کے تین اشعار یہ ہیں:

ہم تو سمجھے تھے کہ جلسہ اپنا ویراں ہوگیا
خوبیِ قسمت سے لیکن لطفِ یزداں ہوگیا
افسرِ اعلا ہوئے مارلیسنِ ذی علم و شان
سن کے یہ جامے سے باہر ہر مسلماں ہوگیا
آپ کے اسلام پر احسان سارے دیکھ کر
ہر مسلماں خود بخود ممنونِ احساں ہوگیا[19]

پھر کالج چھوڑنے سے کچھ ہی قبل، ۱۹۰۲ء میں حسرت نے ایک نظم یونین کے جلسے میں سنائی، جس کا ایک شعر یہ ہے:

پھیر لی پیرِ مغاں نے ہم سے گر چشمِ کرم
ہم کو ہے کافی نگاہِ فیض بخشِ مارلیسن[20]

لیکن "نگاہِ فیض بخشِ مارلیسن" کو پھرتے دیر نہیں لگی۔ اگلے ہی سال ۱۹۰۳ء کے اوائل میں انجمن اردوئے معلی کے ایک مشاعرے نے اس کے موثر مظاہرے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس انجمن کے بانی تو حسرت کے ہم عصر دوست سجاد حیدر یلدرم تھے۔ وہی اس کے پہلے سکریٹری تھے۔ یلدرم کے بعد ۱۹۰۲ء میں یہ عہدہ حسرت کی طرف منتقل ہوا۔[21] ان کا "زمانہ طالب علمی جب ختم ہونے

---

۱۹ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین (علی گڑھ): فروری ۱۹۰۰ (بحوالہ احمر لاری: حسرت موہانی: ص ۴۰-۴۲)
۲۰ ایضاً: ص ۱۵۱
۲۱ خانی خاں: تذکرہ: ص ۲۹۶

کو آیا تو ایک عظیم الشان مشاعرے کی تجویز قرار پائی... سپہرِ نظم کے آفتاب و مہتاب یعنی مجروحؔ اور تسلیمؔ کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ستاروں نے بھی اپنا کمال دکھلایا۔ مگر چھوٹے ستارے اپنی حرکت میں کہیں کہیں تہذیب یا مغربی تہذیب کے دائرے سے باہر ہو گئے۔"[۲۲]

اس مشاعرے میں حصہ لینے والوں میں امیر مینائی کے ایک شاگرد گستاخؔ رام پوری بھی تھے" جن کی شوخ نگاری کافی شہرت پکڑ چکی تھی۔ علی گڑھ میں جیلر کے عہدے پر مامور تھے... طرحی غزل میں گستاخؔ نے ایک مطلع سنایا:

یہ مرض گستاخؔ کیا تجھ کو پیدا ہو گیا
جس کی صورت اچھی دیکھی شیدا ہو گیا

"پیٹھ پیچھے برائی کرنے والوں نے، جن کو حسرت کی آزاد اور مستغنی طبیعت سے روزِ اول ہی سے اختلاف تھا، مارلین سے جا کے کہہ دیا کہ مشاعرے میں تہذیب سے گرے ہوئے اور اخلاق کو بگاڑنے والے اشعار پڑھے گئے، اور مثال کے طور پر گستاخؔ رام پوری کا وہ شعر پیش کیا، جو اوپر حوالۂ قلم ہو چکا ہے اس اعتراض کرنے والے فرقے کے امام محمد علی مرحوم تھے، جو اس وقت حال ہی میں ولایت سے واپس آئے تھے اور نہایت خالص مسٹر محمد علی، تھے۔ ان لوگوں نے مشاعرے کو نہ جانے کس روشنی میں پیش کیا اور گستاخؔ رام پوری بے چارے کے شعر کی خدا معلوم کیا تشریح کی کہ مارلین آگ بگولا ہو گیا۔"[۲۳]

چناں چہ اگلے روز کلاس ختم ہونے کے بعد مارلین "غریب فضل الحسن کو پکڑے رواں دواں دفتر کی طرف لے گئے۔ یہاں سب لوگ حیرت کے عالم

۲۲۔ ایضاً۔
۲۳ مجنوں گورکھ پوری: حسرت موہانی: اردو ادب (علی گڑھ)

میں دیکھا کیے کہ الٰہی ماجرا کیا ہے! اتنے میں ضمیر غرّایا:

"کیا اخلاق کے دو معیار بھی ہوتے ہیں؟"

سہمی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب ملا:

"جی ہاں! ہم لوگوں کا معیار آپ سے مختلف ہے۔"

مسٹر مارلیسن جھنجھلا کر بولے:

"یہ سب بکواس ہے[۲۴]"

اس کے بعد ہی مارلیسن نے کالج کے معتمدین کا ایک خاص اجلاس طلب کیا اور اس میں یہ تجویز پیش کی کہ حسرت کو کالج سے نکال دیا جائے۔ اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مارلیسن کی رائے سے اختلاف کرتا۔ لیکن حسرت کی شخصیت کا رعب چوں کہ سب پر چھا چکا تھا، یہاں تک کہ خود محسن الملک ان کی قابلیت اور فضیلت کے معترف تھے، اس لیے اس تجویز میں اتنی ترمیم کر دی گئی کہ حسرت کو کالج سے تو نکال دیا جائے، لیکن امتحان میں شریک ہونے سے نہ روکا جائے۔[۲۵] کالج کے مقامی ٹرسٹیوں کی ہمدردانہ مخالفت نے مارلیسن کی خواہش کے برعکس، حسرت کو بالآخر سید فضل الحسن حسرت موہانی بی، اے بنا دیا۔ لیکن ان کے نام کے ساتھ اس ڈگری کا اضافہ نہ بھی ہوتا تو ان کی اُس زندگی پر کوئی اثر نہ پڑتا جو وہ جلد ہی شروع کرنے والے تھے۔

۱۹۰۳ء میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو حسرت نے ایل، ایل، بی میں داخلہ لیا۔ ان کے اس اقدام سے یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اس وقت تک انھوں نے اپنے مستقبل کی قطعی راہ متعین نہیں کی تھی۔ لیکن حالات کی روش نے جلد ہی انھیں اس ڈگر پر ڈال دیا جس پر وہ زندگی بھر چلتے

۲۴۔ خانی خاں: متذکرہ:

۲۵۔ مجنوں گورکھ پوری، متذکرہ: ص ۸۱

رہے۔ ایل، ایل بی میں داخلہ لینے کے بعد "وظیفۂ قانون کے لیے مولانا نے درخواست دی۔ مسٹر ماریسن نہ دیا۔ بورڈنگ ہاؤس میں بدستور رہنے کی اجازت چاہی۔ اجازت نہ ملی مایوسی و افسردگی کا اس کے سوا کیا علاج تھا کہ شہر میں سکونت اختیار کر کے... برائے نام قانون کے سبقوں میں حاضر ہو جایا کریں۔"[۲۶]

یہ سلسلہ بھی زیادہ دنوں نہ چل سکا۔ لیکن اس میں خود حسرت کی افتاد طبع کو شاید زیادہ دخل تھا۔ ان کی بیٹی نعیمہ کا بیان ہے کہ "خود مولانا فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے تعزیراتِ ہند کا مطالعہ کیا اور اس کی بعض دفعات پر غور کیا تو میرے ضمیر نے کہا کہ یہ تیرے بس کا روگ نہیں ہے۔"[۲۷] اس کے بعد "برائے نام قانون کے سبقوں میں حاضری" کا سلسلہ بھی ختم کر کے اپنی کتاب زندگی کے اس باب کو انھوں نے باحسرت و یاس ختم کر دیا، جو ۱۸۹۸ء میں ایم، اے، او کالج میں داخلے کے ساتھ شروع ہوا تھا۔

۲۶۔ خافی خاں: متذکرہ

۲۷۔ حسرت کی کہانی نعیمہ کی زبانی: ص ۲۰

۴

عملی سیاسی زندگی کا آغاز

تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حسرت کے سامنے عملی زندگی کا جولق ودق میدان تھا اسے ان کے سیاسی رجحانات نے اور علی گڑھ کالج سے ان کے تعلقات نے بے برگ و گیاہ بنا دیا تھا۔ اس دور میں ایم اے او کالج کے فارغ التحصیل نوجوانوں کے جذبۂ وفاداری کی حکومت پر کچھ ایسی دھاک بیٹھی تھی کہ پرنسپل کے اشارے پر انھیں سول محکموں میں نیز فوج، پولیس اور دوسرے شعبوں میں آسانی سے ملازمت مل جاتی تھی۔ حسرت کے لیے بھی ایسے مواقع پیدا ہو سکتے تھے، لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرنے پر آمادہ ہوتے۔ مگر ایسا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کے مزاج کا جو سانچہ قدرت نے تیار کیا تھا، اسے کالج کی زندگی کے تجربات کی گرمی نے اس درجہ پختہ کر دیا تھا کہ اب اس کا بدلنا ممکن نہیں تھا۔

حسرت کے ذہن میں مستقبل کا جو نقشہ تھا اور ان کے جو عزائم تھے، ان کا دھندلا سا خاکہ ان کے ابتدائی دور کی ایک غزل میں نظر آتا ہے۔ اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

جان کو محوِ غم بنا، دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو، یوں قطع رہِ مراد کر

عمرِ دو روزہ کو عشرتِ جاوداں نہ جان
فکرِ معاش سے گزر، حوصلۂ معاد کر

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیِ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بہ عذرِ مصلحتِ وقت یہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر، کہ ہے گناہ　　کوشش ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو

ہمتِ سر بلند سے یاس کا انسداد کر

مندرجہ بالا اشعار میں حسرت نے سیدھے سادھے الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا تھا کہ ہندستانی سیاست کے دشتِ پر خار میں قدم رکھنے کا انھوں نے مصمم عزم کر لیا ہے۔ اور یہ عزم انھوں نے ایک ایسے وقت میں کیا تھا جب بر صغیر کا سیاسی مطلع بڑی حد تک یاس آلود تھا۔ عوام بلا تفریق مذہب ملک کے سیاسی حالات سے بے خبر تھے۔ ہندستانی سماج کے بالائی و بالائی متوسط طبقے ہی کو سیاسی معاملات سے، یا کانگرس کی سرگرمیوں سے، کچھ دلچسپی تھی، اور وہ بھی نہایت محتاط و معتدل انداز کی تھی۔ چند انتہا پسند بھی تھے مگر ان کی تعداد کی قلت نے ان کی آواز اتنی نحیف کر دی تھی کہ ان کا عدم اور وجود یکساں تھا۔

مسلمانوں کے بالائی و متوسط طبقے کا جہاں تک تعلق ہے، انھیں علی گڑھ تحریک نے سیاسی معاملات سے خصوصاً کانگرس سے، اس درجہ خائف کر دیا تھا کہ وہ اس کے قریب آنے کو گناہ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ حسرت نے علی گڑھ تحریک کی اس پالیسی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کانگرس میں شرکت کی، اور اس سے زیادہ حیرت ناک یہ تھا کہ انھوں نے کانگرس کے انتہا پسند گروہ سے اپنا رشتہ قائم کیا۔

حسرت نے "فکر معاش سے گزر" کر اپنے نصب العین کے حصول کے لیے صحافت کے میدان میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا، اور علی گڑھ ہی سے اردوئے معلیٰ ہی کے نام سے ایک ماہ نامے کا اجرا کیا۔ رسالے کے اجرا کے لیے علی گڑھ کے انتخاب کی پشت پر جو اسباب بھی کار فرما رہے ہوں گے ان کا ہمیں علم نہیں ہے، لیکن یہ تھا بڑی ہمت کا کام۔

رسالے کا نام بھی اس اعتبار سے کم دل چسپ نہیں تھا کہ انجمن اردوئے معلّٰی کی سکریٹری شپ ہی نے حسرت کی تعلیمی زندگی کا خاتمہ کیا تھا، اب رسالۂ اردوئے معلّٰی کی ادارت ہی سے علمی زندگی کا آغاز کیا۔

اردوئے معلّٰی کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو منظر عام پر آیا۔ اس کے سر ورق پر اڈیٹر کا نام ــــ "سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے" درج تھا۔ اس دور میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا ہر فارغ التحصیل طالب علم اپنی ڈگری کے ساتھ "علیگ" کا اضافہ اپنے لیے قابل فخر سمجھتا تھا۔ لیکن اس روش سے ہٹ کر حسرت نے اردوئے معلّٰی ہی میں نہیں، کسی جگہ بھی اپنے نام کے ساتھ "علیگ" کا اضافہ نہیں کیا۔

۱۹۰۳ء میں اردوئے معلّٰی کا جب اجرا ہوا تو اس وقت اردو کے متعدد اہم رسائل موجود تھے۔ مثلاً شیخ عبدالقادر کا مخزن (لاہور) یا نوبت رائے نظر کا خدنگ نظر (لکھنؤ)، جو مخزن کا بھی پیش رو تھا۔ لیکن ان نامور رسائل کی موجودگی کے باوجود اردوئے معلّٰی کو اپنی جگہ بنانے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے اردو داں طبقے کو جلد ہی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے اجرا سے قبل اردو دنیا میں حسرت متعارف ہو چکے تھے، دوسری اور بڑی وجہ یہ تھی کہ متعدد اعتبار سے وہ اپنے ہم عصر رسائل سے مختلف تھا۔

اخبارات و رسائل کے اغراض و مقاصد کی فہرست اس دور میں، آج کے مقابلے میں طویل تر ہوا کرتی تھی، لیکن حسرت نے اس کا دائرہ صرف ایک ہی مقصد تک محدود رکھا تھا۔ ان کے الفاظ ہیں:

"اس رسالے کا مقصد صرف ایک ہے۔ یعنی درستیِ مذاق۔"

اس واحد مقصد کی تشریح سے حسرت نے غالباً ارادی طور پر گریز کیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے ان موضوعات کی ایک طویل فہرست بھی درج کی تھی،

جن کے تحت اردوئے معلیٰ میں مضامین وہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس فہرست میں سیاسی موضوعات کا کوئی ذکر نہیں تھا، تاہم اس امر کے آشکارا ہونے میں چند ماہ سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ اردوئے معلیٰ کے اجرا کا بنیادی مقصد 'درستی مذاقِ سیاست' ہے ــــ خصوصاً مسلمانوں کے مذاقِ سیاست کی درستی۔ دوسرے اور واضح تر الفاظ میں حسرت کے پیشِ نظر مسلمانوں کے اس مذاقِ سیاست کو بدلنا تھا، جسے انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں سرسید نے بڑی محنت و جانفشانی سے مسلمانوں کے بالائی اور بالائی متوسط طبقے کے سیاسی مزاج کا خاصہ بنایا تھا۔

یوں تو اردوئے معلیٰ کے پہلے ہی شمارے میں 'پولی ٹی کل سائنس' کے عنوان سے قاضی تلمذ حسین گورکھپوری کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کا موضوع فلسفۂ سیاست تھا۔ ہندستانی سیاست سے اگرچہ اس کا کوئی تعلق نہ تھا، لیکن رسالے کے پہلے ہی شمارے میں اس مضمون کی شمولیت سے ناظرین نے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہوگا کہ اردوئے معلیٰ کا دامن سیاسی نوعیت کے مضامین سے تہی نہ رہے گا۔

رسالے کی پہلی جلد دسمبر ۱۹۰۳ء پر ختم ہوئی اور جنوری ۱۹۰۴ء میں اس کی دوسری جلد کا آغاز ہوا۔ اس دوسری جلد کے دوسرے شمارے میں 'مسلمان اور پالی ٹیکس' کے عنوان سے شیخ عبداللہ کا مضمون شائع ہوا جس میں پہلی بار ہندستانی سیاست کو براہ راست موضوعِ قلم بنایا گیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے سرسید کا آخری زمانہ دیکھا تھا اور وہ ان سے متاثر بھی تھے تاہم سرسید کے بعض نظریات سے انھیں اختلاف بھی تھا۔ مثلاً سرسید تعلیمِ نسواں کے حق میں نہیں تھے، اس کے برعکس شیخ عبداللہ نے علی گڑھ ہی میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا، جس نے ان کی اور ان کی بیوی کی انتھک کوششوں سے ترقی کی اور آگے چل کر علی گڑھ کالج کا قابلِ فخر جزو بنا۔

انھوں نے اس خیال کو "محض غلط اور بے بنیاد" قرار دیتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ مسلمانوں کو "سرسید نے پولی ٹکل معاملات میں پڑنے اور ان پر غور کرنے سے" نہیں، "بلکہ انھیں کانگرس کی شرکت سے روکا تھا۔"

حسرت کو شاید اس کا احساس رہا ہو گا کہ شیخ عبداللہ کے دعوے کو حقیقت سے بہت کم تعلق ہے، تاہم ان کے مضمون کو انھوں نے یہ سمجھ کر اردوئے معلیٰ میں شامل کیا ہو گا کہ اس میں سرسید کی فکر سے انحراف کے نیز علی گڑھ اسکول کی سیاست کے ایک نئے دور کے آغاز کے آثار انھیں نظر آئے ہوں گے۔

شیخ عبداللہ کے مضمون کا یہ پہلو خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اس کی اشاعت نے اردوئے معلیٰ میں ہندی مسلمانوں کی سیاست سے متعلق مضامین کی اشاعت کا دروازہ کھول دیا۔ چناں چہ مارچ نیز اپریل ۱۹۰۴ء کے شماروں میں 'مسلمان اور کانگرس' کے عنوان سے دو مضامین ہم کو ملتے ہیں۔ یہ حسرت کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ ان میں سے ایک 'حق پسند' کے قلمی نام سے اور دوسرا 'مسلمان' کے قلمی نام سے لکھا گیا تھا۔ ان دونوں مضامین میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے کی ترغیب دی گئی تھی۔ گمان غالب ہے کہ دونوں مضمون نگاروں کا تعلق، کسی نہ کسی حیثیت سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہی سے رہا ہو گا، اور اپنی عزت و حرمت کو محفوظ رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے چہروں پر 'حق پسند' کی اور 'مسلمان' کی نقاب ڈال لی ہو گی۔

حسرت کا پہلا مضمون ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں 'مسلمان، کانگرس اور پولی ٹکل اجیٹیشن' کے عنوان سے اور دوسرا مضمون نومبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں 'مسلمان اور کانگرس' کے عنوان شائع ہوا۔ پہلے مضمون میں انھوں نے لکھا تھا:

... سرسید اپنے زمانے میں قوم کے مسلّم رہنما تھے اور اس وقت مسلمانوں کے حق میں جو کچھ انھوں نے کیا بہتر کیا...

لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سرسید کے وقت میں تھی؟ کیا سرکار انگریزی کو اب بھی کسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ننگ و عار کا موجب کون امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لیے خود کوشش نہ کریں بلکہ دوسروں کی حمایت پر بھروسہ رکھیں اور اپنے جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی نفع کی امید کی وجہ سے باز رہیں۔"

حسرت کے اس سیدھے سادے سوال نے کہ "کیا زمانے کی اب وہی حالت ہے جو سرسید کے وقت میں تھی" اردوئے معلّٰی کے ناظرین کو یقیناً سوچنے پر مجبور کیا ہوگا۔ ان کے ذہن میں اس کا جو جواب بھی آیا ہو، لیکن خود حسرت کا جہاں تک تعلق ہے نومبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں انھوں نے دوٹوک انداز میں اعلان کر دیا کہ:

"ابتدا میں اردوئے معلّٰی کے مقاصد کا دائرہ ہم نے بہت وسیع رکھا تھا، لیکن اب ارادہ ہے کہ آئندہ اس کے مضامین کا زیادہ حصہ لٹریچر اور پالٹیکس سے متعلق ہوا کرے گا۔ چناں چہ اس لحاظ سے... اساتذۂ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین میں سے دو دیوانوں کے علاوہ بنارس کانگرس کی رپورٹ بھی بلاقیمت نذرِ ناظرین ہوگی۔"

سرسید نے اپنے زمانے میں مسلمانوں کو کانگرس میں شرکت سے باز رکھنے کی جد و جہد میں سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ حسرت نے کانگرس ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اپنے ساتھ اردوئے معلّٰی کو بھی اس حد تک کانگرس کے رنگ میں رنگ لیا کہ وہ کانگرس ہی کا آرگن معلوم ہونے لگا۔ اس کے

اوراق میں کانگرس کی پالیسیوں کی حمایت میں مقالات اور ادارتی نوٹ ہی نہیں شائع ہوئے، اس کے سالانہ اجلاسوں کی کارروائیوں کے ترجمے بھی اردوئے معلیٰ سے ضخیم ضمیموں کی شکل میں چھاپے گئے، اور "بلا قیمت نذر ناظرین" کیے گئے۔

۱۹۰۵ء کے اردوئے معلیٰ کے پہلے شمارے سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ حسرت نے کانگرس کے اس سالانہ اجلاس میں شرکت کی تھی جو ۲۶ ر ۲۷ ر ۲۸ ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔ ان کے نوجوان دل و دماغ نے اس اجلاس کے اثرات جس شدت سے قبول کیے تھے اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

"... راقم حروف لوگوں کے چہروں کو بغور دیکھ رہا تھا، اور حب ملک اور حب قوم کی اس نرالی شان کو دیکھ کر جو حاضرین کے بیجے جوش اور اولوالعزمی کی صورت میں نمایاں تھے، بلا مبالغہ از خود رفتہ ہو رہا تھا!..."[۱]

اسی سلسلے میں آگے چل انھوں نے یہ بھی لکھا تھا:

ہم کو بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم کسی پرانی وضع کے اخبار میں یہ دیکھتے ہیں کہ وہ [کانگرس] مسلمانوں کے مقصد کے خلاف ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ وہ لوگ جو انگریزی سے ناآشنائے محض ہونے کے علاوہ کبھی کانگرس میں شریک نہیں ہوئے، ان کو کیا حق حاصل ہے کہ اس جلسے پر کسی قسم کی رائے کا اظہار کریں۔

۱۔ اردوئے معلیٰ: جنوری ۱۹۰۵ء: ص ۵

"ریاض الاخبار کے شاعر اڈیٹر[2] اور البشیر کے ناواقف مدیر[3] حسب محض رسمِ قدیم کی پیروی کے طور پر کانگریس کو برا بھلا کہتے ہیں، تو ہم اپنے غصّے کو محض اس خیال سے پی کر رہ جاتے ہیں کہ ان پرانے لوگوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ جا و بے جا جس طرح ممکن ہو اپنی قدیم وضع کو نباہے چلے جائیں۔[4]..."

۱۹۰۵ء کا سال ہندستان کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اسی سال برطانوی ڈپلومیسی نے بنگال کو 'ہندو بنگال' اور 'مسلم بنگال' میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسلمانوں کے اس طبقے نے جو علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر تھا اس فیصلے کو خوش آمدید کہا۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں نوزائیدہ مسلم بنگال کی راج دھانی ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بیسواں سالانہ اجلاس بڑے کر و فر سے منعقد ہوا۔ میزبانی کے فرائض نواب سلیم اللہ نے انجام دیے، جو تقسیم بنگال کی پیشوائی میں پیش پیش رہے تھے اور جنھوں نے اس تقسیم کو مسلمانوں کی فتح سے تعبیر کیا تھا۔ حسرت نے اس اجلاس کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

محمڈن ایجوکیشنل کا بیسواں اجلاس بہ مقام ڈھاکہ، بہ صدارت جسٹس شرف الدین بہ خوبی تمام ہوا... چوں کہ ہندستان کی نجات کا دارومدار بہت کچھ اہلِ ہند کے تعلیم یافتہ ہونے پر ہے، اس لیے ہمارے خیال میں

۲۔ ریاض الاخبار (گورکھ پور) کے اڈیٹر ریاض خیرآبادی تھے۔

۳۔ البشیر (اٹاوہ) کے مدیر مولوی بشیرالدین تھے، جو ایم۔ اے۔ او کالج کے ابتدائی دور کے گریجویٹ تھے۔ انھوں نے سرسید کا زمانہ دیکھا تھا اور پکّے سرسید پرست تھے۔

۴۔ اردوئے معلّٰی: تذکرہ، ص ۹

ہر بہی خواہِ ملک کو اس کانفرنس سے ہمدردی رکھنا لازم ہے۔ لیکن باوجود ہمدردی ہم اس [اجلاس] کی بعض کوتاہیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ مثلاً اول یہ کہ تعزیت و تہنیت کے رزدلیوشنوں کی کثرت وقار کانفرنس کے منافی تھی۔ لیکن جب اراکینِ کانفرنس نے اس کو جائز ہی سمجھ لیا تھا تو بدرالدین طیب جی مرحوم [سابق صدر کانگرس] کی وفات کے متعلق اظہارِ افسوس نہ کرنا ایک ایسا امر تھا، جس کو اگرچہ ہم اتفاقی فروگذاشت سمجھتے ہیں، لیکن بدگمان لوگ بلاشبہ تنگدلی و لیپت خیالی کا بدترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہوئی کہ کانفرنس کے اسی اجلاس کے بطن سے مسلم لیگ نے جنم لیا۔ یہ عمل سرسید کی وضع کردہ اس پالیسی کی یک سر نفی تھا جو انھوں نے مسلمانوں کے لیے وضع کی تھی اور جس پر عمل درآمد کے لیے انھوں نے اس کانفرنس کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حسرت نے لکھا کہ:

"آثار زمانہ نے آخرکار مسلمانوں کو بھی [سرسید کی پالیسی کے برعکس] پالی ٹکس میں حصہ لینے پر مجبور کیا اور ڈھاکہ میں تعلیمی کانفرنس کے بعد بہ صدارت نواب وقار الملک یہاں مسلم لیگ کا پہلا جلسہ منعقد ہوا..."۵

نواب سلیم اللہ خاں کا اصرار تھا کہ "تائید احکام گورنمنٹ اور تخریب اقتدار کانگرس"، مسلم لیگ کا نصب العین قرار دیا جائے۔ حسرت کے الفاظ میں یہ تجویز "جوہر دو آتشۂ مہملیت" تھی۔ حاضرین نے، خوش قسمتی سے اکلومت کے ساتھ

۵۔ اردوئے معلّٰی: جنوری ۱۹۰۷ : ص ۴۶

وفاداری کے کھلے مظاہرے کو اور کانگرس کے ساتھ تصادم کی عریاں پالیسی کو مناسب نہیں سمجھا۔ اگرچہ یہی پالیسی، نرم اور مبہم الفاظ میں مسلم لیگ کی پالیسی قرار پائی۔ قیام مسلم لیگ کے مقاصد کی فہرست میں پہلا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے بعض احکام سے مسلمانوں میں جو بدگمانی پیدا ہوتی ہے اسے دور کرنا مسلم لیگ کا اولین فرض ہوگا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حسرت نے لکھا کہ اس سے :

"سوا اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جس طرح احکام الٰہی در حقیقت مخلوق کی بہبودی کے لیے ہوتے ہیں، لیکن جاہل انسان ان میں سے بعض کو بہ ظاہر صورت اپنے خلاف سمجھ لیتا ہے، اسی طرح گورنمنٹ کی بھی تمام کارروائیاں دراصل مسلمانوں کے مفید مطلب ہوتی ہیں اور اگر اتفاق سے کوئی کارروائی مسلمانوں کو اپنے اغراض کے خلاف نظر آتی ہے تو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ محض ان کی غلط فہمی اور کوتاہ نظری کا، جس کا دور کرنا مسلم لیگ کا فرض ہوگا..."

آخر میں حسرت نے لکھا تھا کہ "اختلافی مسائل، نیز معاملات مخصوص بہ اہل اسلام میں، مسلم لیگ کی پالیسی جداگانہ قائم ہوگی، لیکن متفق علیہ مسائل میں مقاصد کانگرس کی تائید کی جائے گی [اگر ایسا کیا گیا] تو ہم بھی اس لیگ کے خیر مقدم کے لیے تیار رہیں، ورنہ بہ صورت دیگر نواب ڈھاکہ کی تجویز کے بعد اس کی نسبت بھی ہم کو یہ کہنے میں باک نہ ہوگا کہ "ایں ہم بچہ شتر است"[۶]"

اجتماعات ڈھاکہ کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ بھی تھی کہ نوابوں، تعلقہ داروں اور ان کے متوسلین کے علاوہ شوکت علی، محمد علی، عبد الرحمٰن صدیقی اور بعض دوسرے نوجوانوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ یہ نو واردان بساط سیاست ایم، اے، او کالج کے تعلیم یافتہ اور علی گڑھ تحریک کے پرجوش مبلغین تھے، اور جلد ہی مسلمانوں کی سیاسی

---

۱۰۶ ایضاً: ص ۴۸ و ۴۸

زندگی میں اہم مقام حاصل کرنے والے تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور قیام مسلم لیگ کے اجتماع میں شرکت کرنے والوں کی فہرست میں جن مسلمانوں کے نام نظر نہیں آتے ان میں حسرت موہانی اور محمد علی جناح کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس وقت یہ دونوں ملکی سیاست میں مسلمانوں کی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے کے خلاف تھے۔ اس بنا پر ان دونوں نے ڈھاکہ کی سیاست سے اپنے کو الگ رکھا، اور کانگریس کے اس اجلاس میں شرکت کی جو ڈھاکہ کانفرنس کی تاریخوں ہی میں کلکتہ میں منعقد ہو گی۔

باایں ہمہ یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ حسرت اور جناح کے مزاج و تمانش وضع و قطع اور طرز بود و ماند میں جو زمین و آسمان کا فرق تھا، وہ کانگریس کی داخلی سیاست میں بھی پوری شدت سے برقرار رہا۔ حسرت کا تعلق کانگریس کے انتہا پسند بازوسے تھے اور جناح معتدلین کے گروہ سے وابستہ تھے۔ ان دونوں کی یہ دوری ہمیشہ باقی رہی۔ یہاں تک کہ زندگی کے آخری دور میں جب جناح مسلم لیگ کے مسلمہ لیڈر بن گئے اور حسرت نے بھی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی، وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہی دور رہے۔

حسرت نے کلکتہ کانگریس کی کارروائیوں پر اردوئے معلّٰی میں بڑے پرجوش انداز میں تبصرہ کیا۔ اس اجلاس کی شان و شوکت کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے لکھا کہ اس اجلاس کی :

> "ظاہری کامیابی سے زیادہ قابل قدر وہ اصلی کامیابی تھی جو بدخواہان ملک، خصوصاً اینگلو انڈین اخباروں کے زعم کے خلاف کانگریس کو ہوئی۔ یعنی یہ کہ بہ سبب نیتوں کے خلوص کو اعلیٰ کے واحد ہونے کے کانگریس کو ماڈریٹس اور اکسٹریمسٹس کی ظاہری کشمکش سے بہ جائے نقصان کے مزید تقویت حاصل

ہوئی۔ فریقِ نرم نے فریقِ گرم کے اختلاف سے متاثر ہو احتیاطِ مناسب لبعض ایسے اصولوں کو منظور کر لیا جن کے بغیر کانگرس کا اثر نہایت کم ور ہو جاتا اور گورنمنٹ اس کے مطالبوں کو بہ اطمینان نظر انداز کر سکتی تھی۔

'فریقِ نرم' (ماڈریٹس) اور 'فریقِ گرم' (اکسٹریمسٹس) کا جہاں تک تعلق ہے، ابتدا کانگرس پر 'فریقِ نرم' ہی چھائے ہوئے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے آخری برسوں میں انتہا پسند رجحانات رکھنے والی ایک چھوٹی سی جماعت بھی پیدا ہو گئی تھی جو حصولِ آزادی کے لیے آئینی ذرائع اختیار کرنے کی جگہ انقلاب کی راہ اختیار کرنے کے حق میں تھی۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انتہا پسند رجحانات بھی قوی تر ہوتے گئے۔

نرم یا معتدل گروہ کے لیڈر گوپال کرشن گوکھلے (۱۸۶۶ء۔ ۱۹۱۵ء) تھے جن کو جناح نے اپنے لیے نمونہ بنایا تھا اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر 'مسلم گوکھلے' بننے کی آرزو ان کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ 'گرم' یا انتہا پسند گروہ کے لیڈر بال گنگا دھر تلک تھے، جن کو حسرت نے طالب علمی ہی کے دور میں اپنا سیاسی گرو تسلیم کر لیا تھا' اور ان کی پیروی پر ان کو ناز تھا۔ تلک ہی کے لیے انھوں نے کہا تھا:

یاد آئی تری جس دم فوراً حسرت نے جھک کے سلام کیا۔

۱۹۰۷ء کا سال کانگرس کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال کانگرس کا اجلاس گجرات کے شہر سورت میں منعقد ہوا۔ ۱۹۰۶ء کے کلکتہ اجلاس کے برعکس سورت اجلاس کے موقع پر معتدلین اور انتہا پسندوں کے نظریاتی اختلافات

۷۔ ایضاً: ص ۴۰۔

لے تشدد آمیز تصادم کی شکل اختیار کی۔ پالا معتدلین کے ہاتھ رہا اور کانگرس پر وہ اس طرح چھا گئے کہ انتہا پسندوں کو کبھی بھی کانگرس میں بالادستی حاصل نہ ہو سکی۔

سورت کے اجلاس میں ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد تلک کچھ عرصے کے لیے کانگرس سے کنارہ کش ہو گئے۔ حسرت نے بھی ان کی پیروی کی اور اردوئے معلی کے اوراق کو معتدلین کی مخالفت اور انتہا پسند گروہ کی حمایت اور وکالت کے لیے وقف کر دیے۔

۱۹۰۷ء کی ایک تاریخی اہمیت یہ بھی تھی کہ یہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی پچاسویں سال گرہ کا سال بھی تھا اتفاقاً یہی وہ زمانہ تھا جب تقسیم بنگالہ کے خلاف ہندستانیوں کا، خصوصاً نوجوان بنگالیوں کا غم و غصہ نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا، جس نے شورش کی شکل اختیار کر لی۔ بموں کا اور آتشیں اسلحہ کا بھی استعمال ہونے لگا تھا۔ ان تمام باتوں نے حکومت کو شدید ذہنی و سیاسی بحران سے دوچار کر دیا۔ صورتِ حال پر قابو حاصل کرنے کے لیے حکومت نے دار و گیر کا سلسلہ شروع کیا۔ تلک اور حسرت بھی اس کی زد میں آئے، جن کے گروہ کی ہمدردیاں بھی شورش پسند بنگالیوں کے ساتھ تھیں۔

تلک اور حسرت پر شورش انگیزی کے وہ الزامات تو عائد نہ کیے جا سکے جو بنگالیوں پر عائد کیے گئے تھے، اس لیے ان کو باغیانہ مضامین کے لکھنے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا۔ حسرت ۲۳ر جون ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں گرفتار کیے گئے اور اس کے دوسرے ہی دن ۲۴ر جون کو تلک کی گرفتاری بمبئی میں عمل میں آئی۔

تلک اور حسرت کی سیاسی حیثیت میں اس وقت بڑا فرق تھا۔ تلک آل انڈیا لیڈر تھے۔ حسرت کی سیاسی حیثیت زیر تعمیر تھی اور ان کا حلقۂ اثر شمالی ہند کے مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے حلقے ہی تک محدود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تلک کی گرفتاری پر سارے ملک میں خاصا شور و غل ہوا، لیکن حسرت کی گرفتاری کا خود ان کے صوبے میں بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ اس طرح تلک کی وکالت کے

بیے بمبئی کے سربرآوردہ بیرسٹر میدان میں آگئے، لیکن حسرت کے مقدمے کی پیروی کے لیے کوئی قابلِ ذکر وکیل سامنے نہ آیا۔

"تلک اور حسرت کی سزاؤں میں بھی حسبِ مراتب فرق تھا۔ تلک کو چھ سال کے لیے کالے پانی بھیجا گیا۔ حسرت کے حصے میں دو سال کی قید سخت اور پانچ سو روپے کا جرمانہ آیا۔ یہ سزا بھی اپیل میں سال ہی بھر کی رہ گئی۔ لیکن قید کے دوران میں حسرت کو جن شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا، خوش قسمتی سے تلک ان سے دوچار نہیں ہوئے۔"

۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو حسرت گرفتار ہوئے اور ۴ اگست کو ان کے مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی۔

"قید سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک کرتا ٹوپی پہننے کے لیے، ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل اوڑھنے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا ایک چھوٹا دیگر حوائج ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا..."[8]

حسرت کا یہ شعر اسی دور کی یادگار ہے:

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن کا سلسلہ ایک دو دن یا ایک دو ہفتے نہیں پورے گیارہ مہینے جاری رہا۔ بہ قول حسرت:

"جیل کی سخت ترین مشقت چکی سے پہلے روز ہی سابقہ پڑا اور راقم کو... قید کی ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔..."[9]

۸۔ اردوئے معلّٰی: مارچ ۱۹۱۰ء: ص ۸

۹۔ ایضاً: ص ۹

اس اجمال کی تفصیل حسرت نے مشاہداتِ زنداں میں قلم بند کی ہے جسے تمام و کمال ایک دوسری جگہ نقل کیا جا رہا ہے

حسرت کو یہ سزا جس جرم میں بھگتنی پڑی تھی، اس کی نوعیت بھی کم دلچسپ نہیں تھی۔ اردوئے معلیٰ کی اشاعت اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون "مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" کے عنوان سے شائع ہوا، جو حکومت کی نظروں میں "باغیانہ" قرار پایا۔ یہ حسرت کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ صاحب مضمون کے نام کی جگہ پر "راقم ایک طالب علم از علی گڑھ" درج تھا۔ ایک روایت کے مطابق مضمون "مولوی عبدالحق صاحب کی اردو اور فضل امین صاحب کی انگریزی تحریروں کا خلاصہ تھا، جو اقبال سہیل نے تیار کیا تھا۔ یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عدالت کی طرف سے ایک پروانہ مولوی عبدالحق صاحب کے نام بھی گیا تھا، مگر اس کی تعمیل نہ ہوسکی تھی۔"[۱۰]

بہر کیف مضمون جس کا بھی رہا ہو، حسرت نے مضمون نگار کا نام عدالت کو بتلانے سے انکار کر دیا، اور اڈیٹر کی حیثیت سے سارا الزام خود اوڑھ لیا۔ ان کو اس کا بھی احساس رہا ہوگا کہ مضمون نگار کا نام ظاہر کر دینے کے بعد بھی سزا سے وہ بچ نہ سکیں گے، اس لیے دوسروں کو بھی کیوں مصیبت میں مبتلا کریں۔

اس وقت حسرت کے لیے علی گڑھ کی فضا جس حد تک ناسازگار تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے مقدمے کی سماعت کے دوران میں ایم، اے، او کالج کے بڑے بڑے ذمہ داروں نے حسرت کے خلاف گواہی دی۔ یہاں تک کہ نواب وقار الملک نے بھی [جو کالج کے سکریٹری تھے] ایک دو فقروں میں اس مضمون کی "مذمت ہی کی"،[۱۱] جس کی بنا پر حسرت کو باغیانہ مضمون کی اشاعت کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا۔

۱۰۔ جلیل قدوائی: مقدمہ انتخاب حسرت (کراچی ۱۹۵۳ء): ص ۹

۱۱۔ سلیمان ندوی، حسرت کی سیاسی زندگی: نگار کا دلکھنؤ) حسرت نمبر: ص ۱۱۲

حسرت کی مالی حالت کا اندازہ عارف ہسوی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ :

"ان کی آمدنی ابتدا سے اس وقت تک (گرفتاری کے وقت تک) کبھی شاید پچاس روپے سے زائد نہیں ہوئی۔ ... اردوئے معلیٰ کی محدود آمدنی پر مولانا قانع تھے، اور اردوئے معلیٰ کی اشاعت پانچ سو سے کبھی زائد نہیں ہوئی ... بس یہی ایک آمدنی تھی جس پر حسرت اپنے اہل وعیال کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ جیل جانے کے بعد اردوئے معلیٰ بند ہو گیا، اور یہ تھوڑی بہت آمدنی بھی جاتی رہی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس وقت بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور ان کی شیر خوار بچی نے کیوں کر دن گزارے[۱۲]"

۱۲۔ عارف ہسوی : حالات حسرت: ص ۲۳

عتیق صدیقی

مشاہداتِ زنداں پر ایک نظر

بیسویں صدی کے ہندستان کی سیاسی تاریخ میں عموماً اور ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں خصوصاً سید فضل الحسن حسرت موہانی کو کئی اعتبار سے اولیت کا فخر حاصل تھا۔ بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہو کر سزایاب ہونے والے وہ پہلے ہندستانی مسلمان صحافی تھے۔ حسرت سے پہلے یہ اعزاز ۱۸۹۷ء میں بال گنگا دھر تلک کے حصے میں آیا تھا، جو اس میدان میں اُن کے پیش رو ہی نہیں، ان کے سیاسی مرشد بھی تھے۔

یہ اتفاق بھی قابل ذکر ہے کہ حسرت کی گرفتاری کے دوسرے ہی دن تلک بھی دوسری بار گرفتار ہوئے۔ حسرت ۲۳ رجون ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں گرفتار کیے گئے اور ۲۴ رجون کو بمبئی میں تلک کی گرفتاری عمل میں آئی۔ دونوں کے خلاف باغیانہ مضمون لکھنے کا الزام تھا۔ تلک کی گرفتاری کی خبر سے حسرت کو جو صدمہ ہوا تھا، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ گرفتاری کے دو ہی روز کے بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا، جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہو گئیں۔ مسٹر تلک کے ڈفنس ایڈرس کو پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوتی تھی۔"

تلک اس وقت آل انڈیا لیڈر بن چکے تھے، حسرت کی سیاسی شخصیت

زیر تعمیر تھی اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں بھی ان کا دائرہ اثر ایک چھوٹے سے حلقے ہی تک محدود تھا۔ چنانچہ تلک کی گرفتاری و سزا پر سارے ملک میں خاصا شور و غل ہوا، لیکن حسرت کی گرفتاری و سزا کا کسی نے نوٹس بھی نہ لیا۔ اسی طرح تلک کے مقدمے کی پیروی کے لیے بمبئی کے سربرآوردہ وکلاء میدان میں آ گئے، جن میں مسٹر محمد علی جناح بھی شامل تھے، جو سیاست کے میدان میں اگرچہ نو وارد تھے، تاہم بیرسٹر کی حیثیت سے انھوں نے بمبئی کی قانونی و سماجی زندگی میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ تلک کے برعکس حسرت کے مقدمے کی پیروی کے لیے انھیں کوئی قابل ذکر وکیل بھی میسّر نہ آ سکا۔

تلک اور حسرت کی سزاؤں میں بھی حسب مراتب فرق تھا۔ تلک کو چھ سال کے لیے کالے پانی بھیجا گیا اور حسرت کے حصے میں دو سال کی قید سخت آئی۔ اور پانچ سو روپے کا جرمانہ ہوا۔ اپیل میں سزا سال ہی بھر کی رہ گئی۔ لیکن قید کے جو شدائد حسرت کے حصے میں آئے، خوش قسمتی سے تلک ان سے دوچار نہیں ہوئے۔ حسرت کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے:

> ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
>
> اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

"مشاہدات زنداں" اسی شعر کی جامع شرح ہے۔ "مشقِ سخن" اور "چکی کی مشقت" کا متضاد عمل ایک دو دن یا ایک دو ہفتے نہیں پورے ایک سال، تک جاری رہا:

"... جیل کی سخت ترین مشقت "چکی" سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا، اور راقم نے بہ مصداق "در بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگزرد" اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہو گی

اور کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا... لیکن راقم کو... قید کی تقریباً ساری مدت ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔ حالاں کہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔"

حسرت کے سیاسی مطالعے کے سلسلے میں بھی "مشاہداتِ زندان" کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ اپنی پوری سیاسی زندگی میں حسرت ہمیشہ خواص سے دور اور عوام سے قریب رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام کی فہم اور ان کے خلوص پر انھیں جو اعتماد تھا، وہ خواص پر نہیں تھا۔ انھوں نے اس زمانے میں بھی ٹرین کے تیسرے ہی درجے میں سفر کرنا پسند کیا جب ریاستی اسمبلی اور مجلسِ دستور ساز کی ممبری کی نسبت سے ان کی جیب میں فرسٹ کلاس کا پاس ہوا کرتا تھا۔

مشاہداتِ زنداں کے دیباچے میں حسرت نے ہندستانی عوام کی سیاسی زیرکی اور ان کی فہم و فراست کے بارے میں اپنی پہلی قید و بند کا ایک دل چسپ تجربہ قلم بند کرتے ہوئے جس انداز میں اس کا تجزیہ کیا ہے، وہ خود ان کی سیاسی بصیرت کا اچھا ثبوت فراہم کرتا ہے:

"تمام بھیڑ بھاڑ کے موقعوں پر عموماً اور تیسرے درجے کے ریلوے سفر میں خصوصاً عوام اہلِ ہند کی جہالت، مفلسی اور بے کسی کا نظارہ دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ ان لوگوں کو سیاسی معاملات سے دل چسپی حاصل ہونے کے لیے ایک عرصہ دراز درکار ہے، اور اس وقت تک آزادیِ ہند کا خیال خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ خواص کے غرور اور عوام کے انکسار کی بدولت

ان دونوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کی نوبت ہی نہیں آنے پائی، ورنہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ جمہور اہل ہند میں سیاسی اصول کے سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد کافی مقدار میں موجود ہے۔ زندان فرنگ میں راقم حروف کو ایک قیدی کی حیثیت سے عوام کے درمیان بہ غایت بے تکلفی اور برابری کے ساتھ رہنا پڑا اور اس طرح پر ان کے اصل جذبات اور خیالات کے معلوم کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ راقم کے خیال میں عوام ہند کی حیرت انگیز زیرکی تمام سیاسی مسائل کو، باوجود کم علمی بلکہ بے علمی، بہت جلد اور بہت اچھی طرح اپنے ذہن نشین کر سکتی ہے۔ جس مسئلے کا ان کے روبرو ذکر ہوا، اسے وہ لوگ بیشتر دن میں سمجھ گئے۔ بلکہ اس کے متعلق ایسی پختہ رائے بھی ظاہر کی جس کی بہ ظاہر ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔"

حسرت کا یہ تجربہ اس اعتبار سے حیرت ناک ہے کہ اس وقت تک بلکہ اس کے بعد بھی طویل مدت تک ــــ کسی سیاسی لیڈر، یا سیاسی متفکر کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا۔ حسرت کے بعد جواہر لال نہرو ہی شاید دوسرے لیڈر تھے، جنھوں نے اس شدت کے ساتھ ہندستانی عوام کی سیاسی فہم پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا تھا۔

حسرت کے مزاج و کردار کے مطالعے کے سلسلے میں بھی مشاہدات زنداں، سے بہت کچھ رہنمائی ہوتی ہے۔ مثلاً حسرت نے ساری زندگی جس قلندرانہ وضع میں بسر کی اس کا ذکر سب نے کیا ہے۔ بعض اصحاب نے اس کا رشتہ حسرت کے مالی و معاشی وسائل کی تنگ دامنی سے جوڑا ہے، جو یکسر بے بنیاد ہے۔ حسرت کے قلندرانہ زندگی اختیار کرنے کے اسباب کی عقدہ کشائی بھی، مشاہداتِ زندان، ہی سے ہوتی ہے۔

،، ۲۳ر اگست ۱۹۰۸ء کو قید سخت کا آغاز اس طرح پر ہوا کہ کچہری سے جیل پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک کرتا ٹوپی پہننے کے لیے، ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل اوڑھنے اور بچھانے کے لیے اور ایک قدح آہنی بڑا، ایک چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔

،، ابتدا میں سامان بود و ماند کی اس تقلیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی، لیکن بہت جلد طبیعت نے انھیں کے استعمال پر قانع ہوکر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کردے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی سے فراہم ہو سکتی ہیں کہ بظاہر ان کے لیے انسان کو جبر و ستم یا مکر و فریب کے وسائل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی و غلامی قبول کرنے پر آمادہ ہو جانا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔ زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کے مناسب حال تھی...،،

حسرت نے اس تجربے کو گرہ میں باندھ لیا اور جیل سے باہر نکلنے کے بعد بھی اس پر عمل ہی نہیں کرتے رہے بلکہ ضروریات زندگی کی تحلیل و تقلیل کو ایک آرٹ بنایا اور پھر یہی چیز ان کے لیے طرۂ امتیاز بن گئی۔

قید کے دوران میں حسرت کو جن غیر معمولی تجربات سے گزرنا پڑا تھا، بلکہ جس غیر انسانی زندگی بسر کرنے پر وہ مجبور ہوئے تھے، وہ مضبوط ارادے کے آدمی کی بھی ہمت شکنی کے لیے کافی تھے۔ وہ خاموشی سے اگر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے اور صحافت سے بھی دامن جھٹک کر الگ ہو جاتے تو یہ چنداں حیرت کی بات

نہ ہوتی۔ لیکن جیل کی زندگی کے شدائد نے ہمت شکنی کی جگہ پر ان کے ذوق گنہ، کو تیز تر کر دیا۔ چناں چہ رہا ہوتے ہی انھوں نے "اردوئے معلیٰ" کے اجرا کا ازسرِنو سروسامان شروع کیا، جو ان کی جبری غیر موجودگی، کے دوران میں بند رہا تھا۔ لیکن انھیں اس کا اندازہ شاید نہیں تھا کہ جرم بغاوت میں ان کے سزایاب ہونے کی اس درجہ ہیبت علی گڑھ کی فضا پر طاری ہوگی کہ وہاں کی کوئی پریس ان کا رسالہ چھاپنے پر تیار نہ ہوگا۔ لیکن حسرت اپنی دھن کے بڑے پکے تھے۔ ان کے ارادہ کی تکمیل کی راہ میں بڑی سے بڑی مشکل بھی حائل نہیں ہوسکتی تھی۔ کرائے کے جس مکان میں وہ رہتے تھے، وہیں انھوں نے کاٹھ کا ایک دستی پریس لگا لیا اور وہ تین پتھروں کا انتظام کرکے "اردو پریس" کے شاندار نام سے رسالے کی طباعت شروع کر دی، اور یہ سارا انتظام انھوں نے جس سرعت کے ساتھ کیا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جولائی ۱۹۰۹ء کو وہ رہا ہوئے اور اکتوبر کے مہینے میں رسالے کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مشاہداتِ زنداں کو نہاں خانہ دل و دماغ سے نکال کر صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کیا۔ اس کی پہلی قسط دسمبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئیں۔

"مشاہداتِ زنداں"

۲۳ جون ۱۹۰۸ء سے ۱۹ جون ۱۹۰۹ء تک بزمانہ قید فرنگ جو کچھ راقم حروف نے دیکھا یا سنا اس کے شائع کرنے کا، بوجوہ چند در چند ارادہ نہ تھا۔ لیکن بعض احباب کے اصرار سے مجبور ہوکر اب بہ قصد

ر لیا گیا ہے کہ مندرجۂ بالا عنوان کے کم از کم چند دل چسپ واقعات
ور حالات ہر ماہ درج رسالہ ہوا کریں۔۔۔''
ہر اس کی اشاعت کا سلسلہ تیرہ مہینے۔ جنوری ۱۹۱۰ء تک
اری رہا۔ بعد میں اس کا ایک اڈیشن، غالباً ۱۹۱۸ء میں، کتابی شکل
یں بھی شائع ہوا۔ لیکن راقم کو یہ نہیں مل سکا ہے۔ حسرت کے
انتقال کے بعد نیاز فتح پوری نے اسے نگار (لکھنؤ: جون ۱۹۵۲ء)
میں شائع کیا اور وہیں سے اخذ کر کے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے
کراچی سے شائع ہونے والے نگار (حسرت نمبر: ۱۹۷۶ء) میں
شائع کیا۔ آگے آنے والے صفحات میں 'مشاہدات زنداں' اردوئے
معلیٰ کی اشاعتوں سے نقل کیا گیا ہے۔

'مشاہدات زنداں' حسرت کی پہلی 'جیل یاترا' کے تجربات کی ہیبت
ناک داستان ہے، جو زبان و بیان کے اعتبار سے ادبی اہمیت کی
اور مواد کے اعتبار سے تاریخی نوعیت کی ہے۔ یہ افسوس ناک ہے
کہ عالمی زندانی ادب میں یا کم از کم ہندستانی زندانی ادب میں
اسے وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کی وہ مستحق ہے۔ اس کی
بڑی وجہ تو شاید یہ ہے کہ کسی ملکی یا غیر ملکی زبان میں اسے منتقل
نہیں کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود حسرت کو ہمارے
ملک کی سیاسی تاریخ میں وہ درجہ نہیں مل سکا ہے، جو انھیں
ملنا چاہیے تھا۔ اس میں دوسروں کی ناشناسی، یاد فراموش
کاری، سے زیادہ خود حسرت کے سیاسی تلون کو دخل تھا۔ ان کا
رفتارِ شوق، کبھی منزل آشنا نہ ہو سکا، بلکہ عمر کے آخری دور
میں تو سفر کی دھن میں وہ گم کردہ منزل ہو گئے۔

اردو ادب کی تاریخوں میں شاعر کی حیثیت سے، نیز اردو کے قدیم شعرا کے دواوین اور تذکروں کے مرتب کی حیثیت سے تو حسرت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کے "اردوئے معلیٰ" کا بھی ضمناً نام لے لیا جاتا ہے۔ لیکن "مشاہدات زنداں" کو نہ جانے کیوں، نا قابل التفات سمجھا گیا اور اردو ادب کی تاریخیں اس کے ذکر سے تہی دامن رہیں۔ یہی بات افسوسناک حد تک، حسرت کے اکثر سیرت نگاروں پر بھی صادق آتی ہے۔

حسرت نے اپنی قید و بند کی زندگی کا ایک سال جس حال میں بسر کیا تھا اور اس دوران میں ان سے جو وحشیانہ سلوک کیا گیا تھا، اس کو حسرت نے اگرچہ کچھ حد تک تفصیل کے ساتھ "مشاہدات زنداں" میں قلم بند کیا ہے، لیکن ان کے اندازِ بیان کا یہ پہلو خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ اس میں کسی جگہ بھی بغض و عناد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔

"مشاہداتِ زنداں" کی آخری قسط کے بعد "فرنگی جیل خانوں میں کالے گورے کی تمیز" کے عنوان سے حسرت نے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کا سلسلہ چونکہ "مشاہداتِ زنداں" ہی سے ملتا ہے اس لیے اُسے بھی آخری حصے میں درج کر کے اس داستان کا جزو بنا دیا گیا ہے۔

حسرت نے "سوامی شوانند" کے عنوان سے بھی لکھا تھا۔ سوامی جی ان کے رفیق زنداں اور ان ہی کی طرح جرم بغاوت میں سزایاب ہوئے تھے۔ حسرت کے اس مضمون کو حواشی میں کے ضمن میں درج کیا گیا ہے۔

آگے آنے والے صفحات میں "مشاہدات زنداں" کا متن براہِ راست اردوئے معلیٰ سے نقل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

(عتیق صدیقی)

مشاہدات زنداں

[دیباچہ]

تاہم بھیڑ بھاڑ کے موقعوں پر عموماً اور تیسرے درجے کے ریلوے سفر میں خصوصاً عوام اہل ہند کی جہالت مفلسی اور بے کسی کا نظارہ دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ ان لوگوں کو سیاسی معاملات سے دل چسپی حاصل ہونے کے لیے ایک عرصہ دراز درکار ہے اور اس وقت تک آزادیٔ ہند کا خیال خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ خواص کے غرور اور عوام کے انکسار کی بدولت ان دونوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کی نوبت ہی نہیں آنے پاتی، ورنہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ جمہورِ اہل ہند میں سیاسی اصول کے سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد کافی مقدار میں موجود ہے۔ زندانِ فرنگ میں راقم حروف کو ایک قیدی کی حیثیت سے عوام کے درمیان بہ غایت بے تکلفی اور برابری کے ساتھ رہنا پڑا، اور اس طرح پر ان کے اصلی جذبات اور خیالات کے معلوم کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ راقم کے خیال میں عوام اہل ہند کی حیرت انگیز ذہانت ہر کی تمام سیاسی مسائل کو، باوجود کم علمی بلکہ بے علمی، بہت جلد اور بہت اچھی طرح اپنے ذہن نشین کر سکتی ہے۔ جس مسئلہ کا ان کے روبرو ذکر ہوا اسے وہ لوگ چشم زدن میں نہ صرف سمجھ گئے بلکہ اس کے متعلق ایسی پختہ رائے بھی ظاہر کی جس کی بہ ظاہر ان سے کوئی توقع نہ ہو سکتی [تھی]

اسی ضمن میں ہم کو [کانگرس کے] فریقِ گرم کے برسرِ حق اور نرم گروہ کے خطا پر ہونے کا قطعی ثبوت بھی پہنچا۔ کیوں کہ سودیشی، بائیکاٹ، قومی تعلیم اور پنچایت

کے اصولوں کو عوام نے بلا تکلف سمجھا اور پسند کیا۔ برخلاف اس کے موجودہ نظام حکومت کی اصلاح اور عرضِ معروض کی پالیسی کو ان سب نے بالاتفاق مہمل قرار دیا۔ اور اس قسم کے غلط اصول کی پیروی کو خبط اور تضیع اوقات سے تعبیر کیا۔ لاریب جمہور کا یہ طبعی رجحان ہمارے مذکورہ بالا دعوے کا قطعی اور آخری ثبوت ہے۔ جن لوگوں کو خواص اپنے زعم میں ناپاک اور رذیل سمجھ کر تمام اعلےٰ صفات سے محروم اور تعلیم و تہذیب سے مستفید ہونے کے ناقابل قرار دیتے ہیں۔ ہم نے ان سب کو بخوبی آزما کر دیکھا اور ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ قیود ذات سے متعلق تقریباً کل اصول یک قلم باطل ہیں اور تہذیب و تعلیم کے نقص و کمال کا دار و مدار صرف سوسائٹی کی اچھائی یا برائی پر منحصر ہے۔ ہم نے اپنے قیدی دوستوں میں جن لوگوں کو سب سے زیادہ ذہین و شریف و علم دوست پایا ان میں ایک پاسی، ایک کج بندہ بلے ایک ہندو تیلی اور ایک مسلمان تیلی تھا۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اگر ادنا اقوام کو حصولِ علم و تہذیب کے ذرائع حاصل ہوں تو وہ لوگ بلاشبہ ترقی کے اعلاترین مدارج تک پہنچ سکتے ہیں۔

حسرت موہانی

[آغاز داستان]

(۱)

جس شخص نے کبھی قید خانے کی صورت نہ دیکھی ہو وہ تو وہاں کے حالات سے کسی طرح آگاہ ہو ہی نہیں سکتا، لیکن ہمارا یہ دعوا ہے کہ جو لوگ جیل کی سیر بطور ریفارمر یا وزیٹر کیا کرتے ہیں وہ بھی کما حقہ وہاں کے اندرونی حالات سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ ملازمانِ جیل کی سختیاں، گھڑکیاں اور گالیاں، غذائے زنداں کی حد سے زیادہ ابتر حالت، حاکمان جیل کے ظلم اور بے انصافیاں ان سب کی اصلی کیفیت قیدیوں کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔

یادش بخیر لالہ لال چند فلک نے آخر ۱۹۰۸ء میں بزمانہ سورت کانگرس کچھ حالاتِ زندان لاہور کے سنائے تھے۔ لیکن جیل کی حقیقت راقم کے ذہن نشین صرف اس وقت ہوئی جب کہ ۲۳ رجون ۸ء کو دفعتاً بہ علتِ سڈیشن [بغاوت] داخل حوالات ہونا پڑا۔

داخلۂ جیل کو دنیا سے قطع تعلق کے برابر نہیں تو اس سے کچھ ہی کم سمجھنا چاہیے۔ اربابِ ہوش کو اس سے موت کا سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ جس طرح سے کہ اجل انسان کو تمام دنیاوی جھگڑوں سے چھڑا کر آناً فاناً ایک ایسے عالم میں پہنچا دیتی ہے جس کا کسی کو علم نہیں، اسی طرح سے مقدمۂ سڈیشن میں گرفتار ہونے والا اپنے تمام مشاغل اور کاروبار سے دفعتاً علاحدہ ہو کر ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، جہاں کی آب و ہوا، طریق بود و ماند، طرز رفتار و گفتار غرض کہ ہر چیز نرالی نظر آتی ہے۔ فرق صرف اس قدر سمجھ لیجیے کہ موت کے بعد اعزا و اقربا سے دائمی جدائی

ہو جاتی ہے لیکن یہاں آئندہ کے لیے امید باقی رہنے کے علاوہ اختتام مقدمہ تک کبھی کبھی ان سے دور کی ملاقات بھی ہو جایا کرتی ہے۔

گرفتاری کے وقت راقم حروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدۂ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت پر بر بنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بہ ذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کار پردازان زندان متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہٖ امرِ حق کی پیروی کے باعث یوں ہی توی تھا۔ لیکن ان کی یہ تحریر کہ

"تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا متعلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو"

تقویت مزید کا سبب ہوئی۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا، جن کے ہم راہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتے آیا کیں، اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ فالحمدللہ۔ ختم مقدمہ تک اخبار دیکھنے کی اجازت مجسٹریٹ علی گڑھ سے مل گئی تھی، اس لیے جن جن اخباروں کی نسبت میری پسند کا انھیں علم تھا وہ روزانہ بھیج دیا کرتی تھیں۔

دو ہی روز کے بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا، جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہو گئیں۔ مسٹر تلک کے ڈفنس میں ایڈریس کو پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوتی تھی، اور مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایڈریس کی سماعت کے بعد اگر جج انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک ضرور بری ہو جائیں گے لیکن جسٹس داور کے فیصلے نے ان ساری امیدوں کا خون کر دیا۔

اسی کبیدگیِ خاطر کے دوران میں ایک رباعی ذہن میں آئی تھی، وہ نذرِ ناظرین ہے:

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور
کیا خاک انھیں دادگری کا ہو شعور
انصاف کے دشمنوں کا دادار ہے لقب
برعکس نہند نام زنگی کافور

(۲)

حوالات میں داخل ہونے پر نوگرفتارانِ زنداں کو سب سے زیادہ افسوس ناک نظارہ حوالاتیوں کی حالتِ زار کا یہ نظر آتا ہے کہ ادنا ملازمانِ جیل ناجائز حصولِ زر کی غرض سے ان کی تذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ بہت سے لوگ ان میں ناکردہ گناہ، پولیس کا شکار اور پہلے ہی سے مظلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ سنگ دلی کا یہ قابلِ نفرین برتاؤ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ قواعدِ جیل کی رو سے حوالاتیوں سے کچھ کام نہیں لیا جا سکتا۔ لیکن علی گڑھ جیل میں تو ہم نے جب دیکھا کسی کو گھاس چھیلتے، کسی کو جھاڑو دیتے، یا کچھ نہیں تو پانی بھرتے پایا۔ کیوں کہ ان خدمات سے انکار کا نتیجہ زدوکوب کی ذلت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں پر بلا ثبوتِ کافی محض اس لیے مقدمے قائم تھے کہ انھیں سزا نہ بھی ہو تو کم از کم حوالات میں رہ کر ان کی آبرو تو خاک میں مل جائے گی۔

ایسے لوگوں کے مقدمات کو اہلِ پولیس ملتوی کراتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حوالات کی زندگی سے تنگ آ جاتے اور بری ہونے پر بھی ایک طرح سے کافی سزا برداشت کر چکتے ہیں۔ ہم سے ایک نوجوان حوالاتی نے بہ قسم بیان کیا کہ پولیس نے مجھے ازراہِ عداوت ڈیڑھ مہینے سے حوالات میں بند کرا رکھا ہے اور دورانِ مقدمہ میں علانیہ مجھے سنا سنا کر کہا کرتے ہیں کہ "بچا اب چھوٹ بھی جاؤ گے تو کیا، تم سے سزا سے زیادہ تو ہم نے حوالات میں تکلیف بھگتوا لی"۔ یک ساں طور پر مبتلائے مصیبت ہونے کی وجہ سے تمام حوالاتیوں میں باہم ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر ایک دوسرے سے اپنی داستانِ الم بیان کر کے طالبِ ہمدردی و تسکین ہوتے ہیں۔

راقم حروف کا زمانہ حوالات اسی قسم کے انسانوں کی سماعت میں صرف ہوا۔

اس بات کو جیل خانہ کے خصوصیات میں سے سمجھنا چاہیے کہ وہاں معاملات کی اصلیت قیدیوں یا حوالاتیوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور مقدمات کے تقریباً کل واقعات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جیل میں داخل ہونے یا قید ہو جانے کے بعد پھر کوئی مجرم اپنے رازوں کو دوسرے قیدیوں یا حوالاتیوں سے چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہم نے عادی مجرموں کے سوا باقی اور سب قیدیوں کو عموماً سچ ہی بیان کرتے پایا۔ اب اگر ان لوگوں کے بیان صحیح تھے اور بہ ظاہر ان کے درست نہ ہونے کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا تو ہم کہہ سکتے ہیں اہل پولیس کی رشوت ستانی و جبر نیز بعض با اختیار لوگوں کی بے انصافی اور ناخدا ترسی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اگر لوگوں کو اس کی اصلی کیفیت معلوم ہو تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ ہم ان تمام واقعات کی صحت کو باضابطہ طور پر ثابت نہیں کر سکتے ورنہ ان کے اظہار سے باز نہ رہتے۔

ان تمام واقعات کو سن سن کر راقم حروف کو اپنی گرفتاری میں بھی مصلحتِ ایزدی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ نظر آتا تھا کہ اسی کی بہ دولت اہلِ پولیس و بعض حکام کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دیکھنے اور ان کی تمام پوشیدہ کارروائیوں کے معلوم کرنے کا موقع حاصل ہوا۔

(۳)

تقریباً چالیس روز کی کشمکش اور بیکار طوالت کے بعد آخر کار مقدمے کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے یعنی ۴ اگست ۰۸ء سے قیدِ سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک کرتا ٹوپی پہننے کے لیے، ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے لیے اور ایک قدح آہنی بڑا ایک چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے

مرحمت ہوا۔

ان چند چیزوں کے سوا قیدیوں کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ابتدا میں سامان بود و ماند کی اس تقلیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی لیکن بہت جلد طبیعت نے انھیں کے استعمال پہ قانع ہو کر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی کے ساتھ فراہم ہو سکتی ہیں کہ بہ ظاہر ان کے لیے انسان کو جبر و ستم یا مکر و فریب کے وسائل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی و غلامی تک کے قبول کرنے پہ آمادہ ہو جانا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔ زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کے مناسب حال تھی۔ البتہ ابتدا میں بہ حالت نیم برہنگی فریضۂ نماز کے ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنا دیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت "چکی" سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا اور راقم نے بمصداق "ہر بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد" اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا۔ چنانچہ جب ۳۱ اگست کو دفعتاً تبادلہ الٰہ آباد کی خبر معلوم ہوئی تو لوگوں کے اس گمان کو اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اس جیل میں گورنمنٹ برانچ پریس اور جیل پریس کی موجودگی نے عام طور پر یہی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ قیدیوں کا وہاں بھیجا جانا اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان سے لکھنے ہی پڑھنے کی کوئی خدمت لی جائے گی لیکن راقم کو اہل فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے کسی رعایت کی امید نہ تھی چنانچہ یہ بعد کو ثابت ہوا کہ میرا خیال بالکل صحیح تھا اور الٰہ آباد جیل میں صرف یہی نہیں ہوا کہ بجائے کار تحریر راقم کو چکی ہی کی خدمت سپرد ہوئی بلکہ قید کی تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔ حالاں کہ تمام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا

ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔

(۴)

روانگی الہ آباد کے لیے علی گڑھ جیل سے اسٹیشن تک دو پولیس مینوں کے ہمراہ پابہ جولاں بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ روانگی ٹرین کا وقت قریب تھا لیکن سلاسل وبیڑیوں کی سختی مانع رفتار تھی۔ علاوہ اس کے آسماں کو ہجوم ابر نے عنبریں اور زمین کو خفیف ترشح نے نم کر دیا تھا۔ کچھ دور پاپیادہ چلنے کے بعد ہم راہی ملازمانِ پولیس نے حسبِ معمول از روے قانونِ بیگار ایک اکا گرفتار کیا اور ہم سب اس پر سوار ہوکر اسٹیشن پہنچے۔ واضح ہو کہ گورنمنٹ نے ہمارے اخراجاتِ سفر کے لیے کرایہ ریل کے سوا ایک پیسہ زائد نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں قیدیوں کی خوراک کے لیے ان کو فی روز کے حساب سے جو رقم ملتی ہے وہ بھی نہیں دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے چنوں کے سوا اور کچھ کھانے کو نہ ملا۔

اور کسی کو تو راقم حروف کی روانگی علی گڑھ سے اطلاع نہ تھی، البتہ ریلوے اسٹیشن کے ملازموں میں سے جو چند لوگ واقفِ حال تھے وہ گرد جمع ہو گئے اور افسوس کرتے رہے۔ تین بجے سہ پہر کو ٹرین علی گڑھ سے روانہ ہو کر قریب شام ٹونڈلے پہنچی، جہاں اتفاق سے انڈین ڈیلی ٹیلی گراف کا ایک پرچہ دست یاب ہو گیا۔ دس بارہ روز سے چوں کہ کوئی اخبار دیکھنے کو نہ ملا تھا اس لیے اس کا ایک ایک حرف بڑے شوق اور اضطراب کے ساتھ پڑھا۔ ٹرکی میں دستوری حکومت کے قائم ہونے کا حال معلوم کر کے مسرت بے اندازہ حاصل ہوئی۔ اس روز کے بعد سے پھر آخر مدتِ قید تک اور کسی اخبار کی صورت تک نظر نہ آئی اور حق یہ ہے جیل میں یہی ایک تکلیف ایسی تھی جسے راقم نے سب سے زیادہ محسوس کیا۔

زمانۂ حوالات کے آئے ہوئے اخباروں، کتابوں اور کپڑوں کی ایک گٹھری بھی ہم راہ تھی۔ اثنائے راہ میں آخری بار دیوانِ حافظ کی زیارت نصیب ہوئی۔

...فنا کی غزلیں ارباب ذوق ومحبت کے لیے ہر حالت میں سرمایہ سرور ثابت ہوتی
...یں چنان چہ اس فقیر کے قلب مضطر نے بھی باوجود بے اطمینانی ان سے بہت کچھ تسکین
...اصل کی۔ ایک غزل نے خصوصیت کے ساتھ دل پر اثر کیا۔ اس قدر کہ راقم حروف
...نے اسے زبانی یاد کرلیا اور دورانِ قید میں بحالتِ تنہائی بار ہا اُسے دہرایا اور ہر بار
...یا لطف پایا۔ ملاحظہ ہو:۔

خیز تا از درِ مے خانہ کشادے طلبیم	بر درِ دوست نشینیم و مرادے طلبیم
لذت داغ غمت بر دلِ ما باد حرام	اگر از جورِ غمِ عشقِ تو دادے طلبیم
زاد راہِ حرم دوست نداریم مگر	بگدائی درِ میکدہ زادے طلبیم
چوں غمت را نتواں یافت مگر در دلِ شاد	ما بامیدِ غمت خاطرِ شادے طلبیم

بر درِ مدرسہ تا چند نشینی حافظ
خیز تا از درِ مے خانہ کشادے طلبیم

...ٹونڈلے میں چند نوجوان لوگوں کو شاید راقم کا حال معلوم ہوگیا تھا کیوں کہ
...جب ٹرین وہاں سے چلی تو انھوں نے پلیٹ فارم کے آخری حصّے کے قریب جمع ہو کر
...بڑے خلوص کے ساتھ باچشمِ پرنم سلام کیا۔
کان پور میں ایک صاحب نے آکر دریافت کیا کہ غالباً آپ اردوئے معلّیٰ کے
...ایڈیٹر حسرت موہانی ہیں اور جواب اثبات میں پاکر کچھ دیر ہمدردانہ باتیں کرتے رہے۔
...انھیں بھی الہ آباد جانا تھا اس لیے راستے میں ان سے کئی بار ملنا ہوا۔
والد مرحوم کی نسبت مجھ کو معلوم تھا کہ وہ اپیل کی غرض سے الہ آباد ہی میں
...موں گے اس لیے میں نے انھیں صاحب کے ذریعے سے اپنے تبادلۂ الہ آباد کی اطلاع
...اور سنٹرل جیل ہی میں مل جانے کی درخواست کردی تھی والد مرحوم کے جائے قیام
...سے مجھ کو آگاہی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے انھیں بہ کوشش
...تلاش کرکے میرا پیام اسی روز پہنچا دیا۔ کیوں کہ دو ہی چار روز کے بعد معلوم ہوا

کہ والدِ مرحوم نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی ہے۔ لیکن افسوس کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور نہیں کیا اور وہ ناکام واپس آئے۔ مجھ کو اس واقعے کا کسی قدر افسوس ہوا، خصوصاً اس لیے کہ اپیل کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو رہی تھی اس کا کچھ بھی حال معلوم نہ ہو سکا۔

والد مرحوم کو میرے اس طرح پر گرفتارِ مصیبت ہونے کا بے انتہا قلق تھا۔ چنانچہ جیل سے واپس آنے پر اکثر اعزا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد ان کی صحت کبھی صحیح نہیں رہی اور آخر کار میری عدم موجودگی ہی میں انھوں نے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جیل میں مجھ کو اس واقعے کی خبر تک نہیں ہوئی۔

الٰہ آباد کا سنٹرل جیل نینی میں ہے جہاں جانے کے لیے الٰہ آباد سے آگے نینی جنکشن پر اترنا ہوتا ہے۔ ہم لوگ صبح کو وہاں پہنچ کر آٹھ بجے کے قریب سنٹرل جیل میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ جیل کے کپڑے اتار لیے گئے اور کہا گیا کہ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے۔ اس وقت تک کا ئے کپڑے پہنو جن کی کیفیت یہ تھی کہ ان سے زیادہ کثیف، غلیظ اور بدبودار کپڑوں کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آ سکتا۔ لیکن قہر درویش بجان درویش وہی کپڑے پہننا پڑے۔

راقم حروف کی نگاہ دوربین نہیں ہے اس لیے پڑھنے لکھنے کے اوقات کو چھوڑ کر باقی ہر وقت عینک کی ضرورت رہتی ہے۔ چنانچہ علی گڑھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بعد معائنہ عینک لگائے رہنے کی اجازت دے دی تھی لیکن الٰہ آباد والوں نے اس کو کسی طرح گوارا نہ کیا اور عینک کو داخلِ دفتر کر کے راقم کی بے دست و پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا۔

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں اور کاغذوں کو بہ استثنائے دیوانِ حافظ اپنے سامنے جلوا کر خاکستر کر دیا اور ردی قلم ہیں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

دفتر میں مجھ کو غضب آلودہ اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیجے جاؤ گے اور وہاں مار کر خاک کر دیے جاؤ گے۔ اس خطابِ پُر عتاب کا خاموشی کے سوا اور جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ جیلر صاحب نے غالباً یہ تقریر محض دھمکانے کی نیت سے کی ہو گی، کیوں کہ بعد میں ان سے مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیدیوں کی نسبت جیل خانے کی یہ مشہور مثل بالکل صحیح ہے کہ "مر جائیں تو مکھی اور نکل جائیں تو شیر"، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی قیدی جیل میں مر جائے تو وہاں اس واقعے کی اہمیت ایک مکھی کے مر جانے سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی لیکن اگر کوئی قیدی وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ واقعہ اسی قدر اہم شمار کیا جائے گا جتنا ایک شیر کا کٹہرے سے نکل جانا۔

حاضری دفتر کی زحمت سے نجات حاصل ہونے پر سفری بیڑیاں کٹوانے اور وزن درج رجسٹر کرانے کی غرض سے روز گزشتہ سے اس وقت تک کے آئے ہوئے نئے قیدیوں کی قطار میں بیٹھنا پڑا۔ سوامی [9] شوانند سے اوّل اوّل اسی مقام پر ملاقات ہوئی کیوں کہ وہ بھی ایک جدید قیدی کی حیثیت سے کالے کپڑوں میں وہاں موجود تھے۔

مذکورۂ بالا ضروری کارروائیوں کے بعد ہم (یعنی راقم حروف اور سوامی جی) حسب قاعدہ مقررہ تا معائنہ ثانی "پرانی تکلیف" بھیج دیے گئے جہاں کہ دس بارہ روز قیام کی کیفیت بضمن تذکرۂ سوامی جی مجملاً درج اردوئے معلی ہو چکی ہے۔

واضح ہو کہ الہ آباد سنٹرل جیل کے چار خاص حصے ایک ہی چہار دیواری کے اندر علیحدہ علیحدہ بنے ہیں۔ اوّل "نئی تکلیف" جس میں زیادہ تر کمسن نوجوان یا وہ قیدی رکھے جاتے ہیں جو گورنمنٹ برانچ پریس میں کام کرتے ہیں۔ دوم "پرانی تکلیف" جس میں عارضی طور پر نئے آئے ہوئے قیدی یا جنگ جو و شورہ پشت لوگوں کے سوا کوٹھریوں میں قید تنہائی بسر کرنے کے لیے تمام جیل سے ہر ہفتے کچھ قیدی آتے

جاتے رہتے ہیں۔ پرانی اور نئی تکلیف میں بارکوں کی وضع یہ ہے کہ ہر ایک بارک میں دو رویہ کوٹھریاں بنی ہیں اور درمیان میں تھوڑی جگہ سنٹر کے نام خالی ہے پھر ہر دو بارکوں کے درمیان ایک کھلا ہوا احاطہ ہے، جسے جیل کی زبان میں اڑگڑا کہتے ہیں۔ یہاں قیدیوں کے نہانے دھونے پاخانے وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔

باقی رہے دو احاطے ایک نیا احاطہ ہے جس میں زیادہ تر دو قسم یا زیادہ مرتبہ کے سزا یافتہ قیدی رکھے جاتے ہیں۔ دوسرا پرانا احاطہ اس میں زیادہ تر ایک بارہ قیدی رہتے ہیں۔ ان دونوں احاطوں کی بارکوں میں کوٹھریاں نہیں ہیں بلکہ ہر بارک میں دو رویہ برابر برابر ۴۰ یا ۴۵ مٹی کے چبوترے قیدیوں کے لیٹنے کے واسطے بنا دیے گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رات کو جو چالیس پچاس قیدی ایک بارک میں بند ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر فرصت کے وقت بات چیت بھی کر سکتے ہیں۔

(۵)

"نئی تکلیف" جیلر کے تحت میں رہتی ہے پرانے اور نئے احاطوں کے لیے علاحدہ علاحدہ یورپین نائب جیلر اور وارڈ اور "پرانی تکلیف" کے واسطے عموماً ایک ہندستانی وارڈر مقرر رہتا ہے۔ جیل میں ان مختلف حصوں کی اچھائی برائی کا اندازہ وہاں کے حکام کی اچھائی برائی سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے زمانہ میں جیلر نیز یورپین اور ہندستانی وارڈر نیک مشہور تھے اس لیے نئے احاطے نیز نئی اور پرانی تکلیف کو قیدی غنیمت شمار کرتے تھے۔ لیکن نائب جیلر کی سختی کا ہر شخص شاکی تھا۔ چنانچہ اسی باعث سے پرانے احاطے کے نام سے قیدی خوف کھاتے تھے۔ وہاں کی سختیوں کے قصے روز قیدیوں کی زبانی سننے میں آتے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ چند ہی دن میں ہم کو اسی احاطے میں جانا اور پھر وہیں تمام زمانہ قید بسر کرنا پڑے گا۔

اب ہر ایک بارک کا انتظام سنیے کہ ان تنیس چالیس قیدیوں میں سے جو ایک بارک میں بند کیے جاتے ہیں کم از کم تین برقنداز قیدی نمبر یا نگراں کار، کم از کم چھ پہرے والے اور باقی معمولی قیدی ہوتے ہیں۔ ہر پہرے والا رات کو دو گھنٹے پہرا دیتا ہے، جس کا طریق یہ ہے کہ ایک سرے سے تمام قیدیوں کو شمار کر لینے کے بعد شمار کنندہ آخر میں خود کو بھی شمار کر کے بارک کے مقفل دروازے کے قریب آ کر بہ آواز بلند رپورٹ دیتا ہے۔ مثلاً ۲۰ قیدی بارک نمبر ۵ میں بند ہوں۔ تو پہرے والا یوں کہے گا: ایک دو تین چار .... سترہ اٹھارہ انیس ہم بیس ہیں۔ قیدی ٹھیک ہیں صاحب۔ تالا جنگلا سب ٹھیک ہے۔ "پانچ نمبر"، رات کو چار یا پانچ بار ملازمانِ جیل کی روند آتی ہے اس وقت پہرے دار کی جگہ برقنداز رپورٹ دیتا ہے کیوں کہ رات بھر کے لیے بارک کے اندر ہر قسم کی جواب دہی برقندازوں ہی کے ذمہ ہوتی ہے۔

اس ذمہ داری کے عوض میں قیدیوں پر ان کو اختیار بھی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں جس طرح جیل کے مختلف احاطوں کی اچھائی یا برائی کا دارومدار وہاں کے حاکموں کی نیکی یا بدی پر ہوتا ہے اسی طرح سے احاطے کے اندر بارکوں کا پسندیدہ ہونا برقندازوں کی نیکی یا بدی پر ہوا کرتا ہے۔

پرانی تکلیف میں ہماری اور سوامی جی کی بارک کے سب برقنداز نیک پڑھے لکھے اور ہم لوگوں پر خاص کر مہربان تھے۔ ضلع فرخ آباد کے منشی جھمن لال قیدیوں کے کپڑوں اور طوقِ گلو کی تختیوں پر نمبر ڈالنے کی خدمت پر متعین تھے، ضلع فیض آباد کے منشی نول بہاری لال غلہ گودام میں منشی تھے اور ضلع بریلی کے دارو فرنرائن داس "پرانی تکلیف" کے محرر تھے۔ برقندازوں کو پوشاک عام قیدیوں سے بہتر ملتی ہے۔ خوراک میں قاعدے کی رو سے تو کچھ فرق ہوتا نہیں لیکن منشا صاحبِ اختیار ہونے کے سبب سے وہ لوگ بہ طور خود بہتر خوراک کا انتظام کر سکتے ہیں۔ انھیں کاغذ پنسل رکھنے کی بھی اجازت ہے اور وہ بہ ضرورت احاطہ جیل کے اندر جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ سوامی جی کو داروغہ صاحب روز صبح

گیہوں کا دلیا منگا دیتے تھے اور شام کو ہم دونوں کے لیے صاف روٹیاں اور ترکاری بہم پہنچاتے تھے۔ بلکہ سوامی جی اور داروغہ صاحب کی خاطر سے دوسری بارکوں کے برقنداز بھی جب کبھی خفیہ طور پر کوئی غیر معمولی چیز پکواتے تھے تو ہم لوگوں کا بھی حصہ لگایا جاتا تھا۔ سوامی جی کے ذمے بان بٹنے کا کام تھا اس لیے انھیں کہیں جانا نہ پڑتا تھا۔ لیکن راقم حروف کو چکی پیسنے کی غرض سے پرانے یا نئے احاطے میں جانا ضروری تھا۔ نئے احاطے میں دوبارا قیدی چکی پیستے ہیں اس لیے وہاں عموماً آٹا موٹا پیسا جاتا ہے اور ان سے کوئی تعرض بھی نہیں کرتا کیوں کہ وہ لوگ بے باک اور مار دھاڑ سے بالکل بے خوف ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف پرانے احاطے میں یک بارہ قیدی معاملاتِ جیل سے ناواقف اور ملازموں کی زدوکوب و سب و شتم سے ہر وقت خائف رہتے ہیں اسی لیے ان سے آٹا بہت باریک پسوایا جاتا ہے۔

داروغہ صاحب نے پہلے روز راقم کو نئے احاطے کو بھجوایا۔ نئے احاطے کا وارڈر نیک تھا اس لیے چکی خانے کے برقنداز اور دفعدار نے راقم پر کوئی خاص سختی نہ کی بلکہ داروغہ کی سفارش سے رعایت ہی کا مستحق سمجھا۔ لیکن دوسرے ہی روز نائب جیلر کا حکم آگیا کہ علی گڑھ والے قیدی کو پرانے احاطے بھیج دو، اور وہ چکی پیسنے نئے احاطے میں نہ جانے پائے۔ قریب شام جب ہم نئے احاطے سے کام کرکے پرانی تکلیف حسبِ معمول اپنی بارک میں بند ہونے کے لیے آئے تو داروغہ صاحب اور سوامی جی کو خاموش اور رنجیدہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی وقت مجھ کو پرانے احاطے میں جانا اور سوامی جی سے جدا ہونا ہوگا۔ داروغہ صاحب نے سوامی جی کی فرمائش سے راقم حروف کی آخری دعوت کے لیے کچھ پوریاں اور کچھ حلوا تیار کر رکھا تھا۔ سوامی جی نے مجھے علیحدہ لے جاکر خود کھلایا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں بغل گیر ہوکر بغایت افسوس و افسردگی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ ابتدائی مقدمہ اور دوئے معلیٰ سے اس وقت تک بہت سے افسوس ناک مناظر پیش نظر

ہوئے تھے لیکن مجھ کو خوب یاد ہے کہ کسی موقع پر میرے آنسو نہیں نکلے۔ لیکن اس وقت
والدہ جی کو مضطر اور آب دیدہ دیکھ کر مجھے بھی ضبط نہ ہو سکا اور دیر تک باوجود
ضبط آنکھیں پرنم رہیں۔ پرانی تکلیف سے رخصت ہوکر پرانے احاطہ میں اس وقت
پہنچا ہوا کہ بارکیں بند ہو رہی تھیں۔ نائب جیلر جن کے تحت میں وہ احاطہ تھا، اس
وقت پانچ نمبر کو بند کرا رہے تھے۔ دفعدار نے مجھے لے جاکر ان میں پیش کیا۔ لیکن
کچھ مشورہ کرنے کے بعد یہ حکم ہوا کہ اس کو پانچ نمبر میں نہیں بلکہ سات نمبر کے پچھلے
حصے میں بند کر دو۔ پانچ نمبر کے برقنداز ضلع مظفرپور کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان تھے ان سے
بعد میں مشورت کی حقیقت دریافت ہوئی کہ سات نمبر کا برقنداز چوں کہ تمام احاطے میں بدزبان
اور سخت گیر مشہور تھا، اسی لیے میرا اسی نمبر میں رکھا جانا مناسب سمجھا گیا۔ سات نمبر کے
قیدیوں کو پہلے ہی سے یہ حکم سنا دیا گیا تھا کہ نئے آنے والے قیدی سے نہ کوئی ملے اور نہ بات کرے
اور برقنداز کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس شخص کے دماغ کی گرمی نکال دو۔

پرانا احاطہ تمام جیل میں تشدد اور سختی کے لیے بدنام تھا پھر اس احاطے
میں سات نمبر کے برقنداز کی سختی، بدزبانی بھی مشہور عام تھی۔ ان سب پر طرہ مزید
سختی اور نگرانی کے خفیہ احکام تھے۔ جن کو سن سن کر میرے لیے لوگ بہت متفکر
تھے۔ لیکن بہ مصداق "دشمن اگرچہ قوی است نگہبان قوی تراست"، جن لوگوں سے بدی
کی توقع تھی انھوں نے راقم حروف کے ساتھ نیکی اور مروت کا برتاؤ کیا۔ جس کا ذکر
آئندہ آئے گا!

(جلد ۱۱: نمبر ۵: مئی ۱۹۱۰: ص ۱۲-۱۴)

(۶)

بلاک نمبر ۷ کے تمام قیدیوں اور برقندازوں کو راقم کے متعلق پہلے ہی سے خفیہ
احکام پہنچ چکے تھے کہ نئے قیدی سے نہ کوئی ملے نہ بات کرے۔ ذاکر برقنداز بارک
نے جو اپنی سختی اور بدزبانی کے لیے تمام جیل میں بدنام تھا مزید احتیاط کی غرض سے

راقم کا بستر عین اپنی نشست کے سامنے لگوایا تاکہ ہر وقت کافی نگرانی آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ لیکن بہ مصداق "الانسان حریص علیٰ ما منع"[12] اس روک ٹوک سے قیدیوں کے دل میں مجھ سے ملنے اور بات چیت کر کے دریافت حال کرنے کا اور بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ دن کو نوفنا کر کے خوف سے کوئی بول نہ سکتا تھا لیکن رات کو جب سب سو جاتے تھے تو ضلع شاہجہاں پور کے پنڈت تلک رام پہرے والے اپنے ہر گشت میں کچھ دیر میرے قریب ٹھہر کر ضرور مصروف گفتگو ہوتے تھے۔ یہ اس درجہ ذہین تھے کہ تھوڑی ہی دیر کی گفتگو میں انھوں نے کل معاملات کو بخوبی سمجھ لیا کہ اخبار کسے کہتے ہیں اور سڈیشن کس شے کا نام ہے۔ سدیشی اور بوائیکاٹ سے وہ پہلے ہی سے واقف تھے۔ قومی تعلیم اور پنچایت کے اصول کو بھی انھوں نے بلا تکلیف معلوم کر لیا۔ اور دوسرے ہی تیسرے روز انھیں تلک مہاراج کے ذریعے سے تمام بارک والوں کو میرے معاملے کی خبر ہو گئی اور پھر بارک سے نکل کر بہت جلد تمام احاطے میں مشہور ہو گئی۔ کیوں کہ ہماری بارک کے قیدی قریب قریب تمام کارخانوں میں کام کرنے کے لیے جاتے تھے۔ حسن اتفاق کا یہ بھی کرشمہ قابل التفات ہے کہ مسٹر تلک کے ایک پیرو کو جیل میں بھی ہر جگہ پہلے پہل تلک ہی کے ہم نام لوگوں سے سابقہ پڑا۔ پرائی تکلیف میں میرٹھ کے مشہور شورہ پشت قیدی تلک سنگھ نے اس کا خیر مقدم کیا اور پر بلنے احاطے میں ابتدائے کلام "تلک رام" سے ہوئی۔

تلک سنگھ کا حال سننے کے قابل ہے۔ یہ بزرگ چھبیس سال سے جیل میں سکونت رکھتے ہیں۔ درمیان میں کئی بار رہا ہوئے لیکن ہر مرتبہ چند ہی ماہ کے بعد دوبارہ کسی جرم کی علت میں خوشی خوشی اپنے مسکن میں پھر داخل ہو گئے۔ پنجاب اور صوبجات متحدہ کا کوئی سنٹرل جیل ایسا نہیں ہے جس کا حال انھیں ذاتی طور پر نہ معلوم ہو۔ جب کبھی یہ اپنے کارنامے بیان کرتے تھے تو تمام سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔

جیل میں آگ جلانے یا حقہ پینے کی سخت ممانعت ہے لیکن تلک سنگھ علانیہ آگ جلا کر حقہ پیتے تھے اور ملازمان جیل بھی تنگ ہو کر چشم پوشی کرتے تھے۔ جیل کی کوئی

سزا ایسی نہیں ہے جو ان کو نہ ملی ہو۔ بیڑیاں ان کے پڑی تھیں۔ کوٹھری میں یہ بند رہتے تھے۔ کپڑوں کے عوض ٹاٹ انھیں پہننے کو ملا تھا۔ لیکن اسے بھی انھوں نے جلا دیا تھا اس لیے ایک لنگوٹے کے سوا اور کوئی کپڑا ان کے جسم پر نہ تھا۔ ٹاٹ کا بستر توڑ توڑ کر انھوں نے حقہ پی ڈالا تھا۔ اور ان تمام بدعتوں کے بعد بھی اس درجہ بے باک تھے کہ جب کبھی جیلر یا کسی دوسرے افسر کا ان کی جانب گزر ہوتا تھا تو اس سے تیل اور گڑ کی فرمائش ضرور کرتے تھے اور کبھی کبھی پا بھی جاتے تھے۔ راقم کے حال پر ان کی خاص نظر عنایت تھی۔ اپنے پاس بٹھا کر جیل کے کل معاملات کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ سمجھا دیا تھا کہ اتنی معلومات سالہا سال کے تجربے سے بھی بہ مشکل حاصل ہوتی۔ بان بٹتے تو زیادہ نہ تھے، لیکن برقنداز سے کبھی سات آٹھ سو گز سے کم نہ لکھواتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مقررہ (۳۰۰) گز سے ہمیشہ چار یا پانچ سو گز زیادہ کام کرنے کے صلے میں آٹھ یا دس نشان روز انھیں ملا کرتے تھے اور چھبیس نشانوں کی ایک دن کے حساب سے ہر ماہ دس یا بارہ روز رہائی کے مستحق ٹھہرتے تھے۔

سلسلۂ بیان کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اصل میں برقنداز ذاکر کا مذکور تھا کہ انھیں راقم حروف کی سخت نگرانی کا حکم تھا اور عجب نہیں کہ در پردہ غیر معمولی سختی کرنے کا بھی اشارہ کیا گیا ہو۔ راقم ان تمام معاملات سے آگاہ تھا لیکن ان سے یک قلم بے پروا اکثر فکر و تصور کے دوسرے ہی عالم میں رہا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے قریب اسی عنوان سے گزر گیا کہ میں کسی سے بولا نہ ذاکر کو مجھ سے بات کرنے کی نوبت آئی۔ باندے کے کریم پہلوان کا بستر میرے بستر سے بالکل متصل ہوتا تھا وہ البتہ کبھی کبھی شب کو اپنی سرگزشت سنایا کرتے تھے کہ پولیس نے انھیں بے قصور ڈاکو ثابت کرکے پانچ سال کے لیے قید کرا دیا۔ واللہ اعلم۔

غازی آباد کے ایک نوجوان عبداللہ نے بھی ابتدا ہی سے میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور شرافت کا برتاؤ کیا کہ جب کبھی موقع ملتا تھا وہ میری دل دہی کی

کوشش کیا کرتے تھے۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ تھوڑے ہی دنوں میں رمضان المبارک کی آمد آمد سے مسلمان قیدیوں میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔ اسلامی اخوت کا جیسا زبردست اثر میں نے اس موقع پر زندانِ فرنگ میں محسوس کیا اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ ہمارے بارک میں جتنے مسلمان قیدی تھے تقریباً ان سب نے روزہ رکھنے اور سحر و افطار کے وقت یکجا ہوکر کھانا کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔ جس سے بے سرو سامانی کی حالت میں بھی اسلام کی شانِ مساوات و اُخوت سادگی کے ایک عجیب و غریب عالم میں نمودار ہوتی تھی جس کا اثر ہم سب کے حق کے ذاکر کے دل نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ ایک روز وہ مجھ سے بلا تقریب مخاطب ہوکر بولے کہ "بھائی صاحب میری جانب سے سختی کا خوف آپ اپنے دل سے نکال دیجئے۔ مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ میں کچھ نہ کروں گا بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو یا جو تکلیف ہو مجھ سے بے تکلف کہہ دیجیے گا۔"

ذاکر کے اس غیر معمولی برتاؤ نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو اس کو محض بناوٹ سمجھتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا سچے دل سے کہا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بعد جب تک وہ بارک میں رہے روزانہ شام کو اپنے کارخانے سے افطار و سحر کے لیے مختلف قسم کی چیزیں پکا کر لاتے تھے اور سب کے ساتھ کھاتے تھے لیکن آٹھ ہی دس دن کے بعد وہ دفعتاً بیمار ہوکر اسپتال چلے گئے اور پھر وہیں سے، ہندستان میں حکومت برطانیہ کے پنجاہ سالہ جبلی کی خوشی کے موقع پر، رہا ہوگئے۔ جن لوگوں کی مشقت چکی خانہ میں تھی ان کو رمضان میں سب سے زیادہ دشواری پیش آئی کیوں کہ جلد جلد پانی پینا چکی پیسنے کے لوازمات میں داخل ہے۔ علاوہ بریں بے کھائے پئے ایک من گیہوں پیسنا یوں بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اکثر مسلمان بہادروں نے باوجود ان تمام سختیوں کے روزہ ترک نہ کیا۔ رحمتِ الٰہی نے بھی ہم لوگوں کو فراموش نہیں کیا کیوں کہ لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے، کہ دن میں دس دس بیس بیس بار پانی پینے والے ایک بار بھی

پانی پیئے بغیر اتنی سخت محنت کس طرح سے کر لیتے تھے۔

الغرض ایک ایک دن کر کے ماہ رمضان بھی ختم ہونے کو آیا اور آخری جمعہ کو ضلع بجنور کے میر مظفر حسین صاحب فوق کی تحریک پر نماز ادا کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ راقم حروف نے زبانی خطبہ اور اسی وقت کے لکھے ہوئے چند الوداعی اشعار[۱۳] پڑھ کر نماز پڑھائی۔ دو ہی چار روز کے بعد عیدالفطر کی تقریب پیش آئی۔ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ الہ آباد سنٹرل جیل میں عید کی تعطیل کا دستور تھا۔ لیکن اتفاق سے کنگ ایڈورڈ آنجہانی کا اعلان بابت معافی تبدیلی مجرمان بہ تقریب جشن پنجاہ سالہ حکومت برطانیہ اسی روز تمام جیل کو ملا۔ جس نے عید کی خوشی کو دوبالا کرنے کے علاوہ تعطیل کو بھی لازمی قرار دیا۔ جذبۂ امید کی خوش گواری اور فوری تاثیر کا جیسا دلچسپ سماں جیل خانوں میں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال غالباً کہیں اور نہ مل سکے گی۔ جیل یا بہ زبان عوام جیلی کی غضبیہ سے خفیہ خبر یا افواہ طرفۃ العین میں تمام جیل میں مشہور ہو کر قیدیوں کے چہروں کو سرور امید سے منور کر دیتی ہے اور ہر شخص اپنی رہائی کے خیال سے کم از کم تھوڑی دیر کے لیے اپنے مصائب کو فراموش کر دیتا ہے۔

غازی آباد ضلع میرٹھ کے عبداللہ کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس نیک دل نوجوان نے بہ خلوص کامل میرے انکار اور ممانعت کی مطلق پروا نہ کر کے بہ اصرار میری ایسی خدمت کی جس کا میں مدت العمر ممنون احسان رہوں گا۔ بلا ناغہ میرے کھانے پینے کے برتنوں کی صفائی، میرے بستر کا بارک سے باہر نکالنا اور پھر اندر لے جانا چکی خانے میں اپنا کام ختم کر کے میری مدد کو آنا، اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ عید کے روز بھی معلوم نہیں کہاں سے چند لکڑیاں فراہم کر کے ایک گوشے میں چھپا کر میرے غسل کے لیے پانی گرم کیا اور کپڑے دھو کر صاف کر دیے۔

عید کے روز تھوڑی دیر کے لیے تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت ملتی ہے کہ وہ جیل اسپتال میں جمع ہو کر نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ اس روز بھی پرانی تکلیف، نئی تکلیف اور نئے احاطے سے سب لوگ آئے تھے۔ لیکن ہمارے احاطے کے

وارڈر نے اپنی معمولی سختی سے کام لے کر ہم لوگوں کو احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً ہم ساٹھ، ستّر لوگوں کو علاحدہ نماز پڑھنا پڑی۔ نماز کے بعد لوگوں کے اصرار سے راقم حروف نے مختصر سا وعظ بھی کہا۔ جس میں تمام فرائض اسلامی کی عموماً اور فریضۂ صوم کی خوبیاں خصوصاً حاضرین کے گوش گزار کی گئیں تھیں۔

نماز عید کے بعد سارا دن جبلی کے تذکروں میں صرف ہوا۔ شاہ اڈورڈ ہفتم کا فرمان یہ تھا کہ "تمام قیدیوں کی قید یا معاف کی جائے یا اس میں تخفیف ہو" لیکن غالباً درمیانی لوگوں کی دراندازی کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ معاف تو کسی کی بھی قید نہ ہوئی، البتہ فی سال ایک ماہ کے حساب سے رہائی کل قیدیوں کے ٹکٹوں پر چڑھا دی گئی۔ مگر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ تین ماہ کے بعد روزانہ دس بیس لوگوں کی جبلیاں خارج ہونا شروع ہوئیں۔ جس سے شاہی اعلان کی حد درجہ سبکی ہوئی۔ حقیقت حال سے ناواقف قیدی بے گناہ بادشاہ کو علانیہ برا بھلا کہتے تھے کہ دے کر کسی چیز کا واپس لینا کم ظرف لوگوں کا شیوہ ہے، بادشاہوں کا طریقہ نہیں ہے۔

اس رعایت سے پولٹیکل قیدیوں کی محرومی کا قصہ ہم پہلے ہی درج کر چکے ہیں۔ مجھ کو بھی ایک روز مع ٹکٹ اپنے روبرو طلب کر کے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "تم کو جبلی نہیں ملے گا"، اور اٹھ ماہ کی رہائی میرے ٹکٹ سے خارج کر دی۔ میں نے "عطائے تو بہ لقائے تو" کہہ کر خاموشی اختیار کی۔ یہ پچیس دن تو گویا چشم زدن میں گزر گئے لیکن اہل فرنگ کی اس تنگ دلی کا افسانہ ہمیشہ کے لیے یاد رہ گیا۔

۱۴
بر گردن او بماند و بر ما بہ گزشت

الہ آباد سنٹرل جیل میں چکی کی مشقت سب سے زیادہ سخت ہے کیوں کہ وہاں رام بانس یا ہاتھی چنگھاڑ کوٹنے کی مشقت موجود ہی نہیں ہے، جو چکی سے بھی بدتر سمجھی جاتی ہے اور جس کی نسبت ہر جیل میں یہ شعر قیدیوں کی زبان زد ہے کہ:

جیل خانے کا برا اردتیہ کوئی کسی کا یار نہیں
رام بانس کی کڑی مشقت چکی سے انکار نہیں

راقم حروف کے حال پر حکام جیل کی یہ خاص عنایت تھی کہ تقریباً تمام مدت قید اسی مشقت میں بسر ہو گئی۔ قاعدے کی رو سے فی قیدی ۱۵ سیر کے حساب سے دو قیدیوں کو ۳۰ سیر غلہ پیسنے کو ملنا چاہیے۔ الہ آباد میں ۳۰ سیر کے بجائے ۴۰ سیر پسواتے ہیں، جس کے عوض میں ہر سہ ماہی پر دو یا تین دن رہائی کے دیے جاتے ہیں، بشرطیکہ اس عرصے میں کوئی قصور ایسا نہ سرزد ہو جائے جس سے پیشی کی نوبت آ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ قیدی جب کوئی جیل کا جرم کرتا ہے تو اسے وارڈر سزا کے لیے سپرنٹنڈنٹ کے روبرو پیش کرتا ہے۔ اسی کا اصطلاحی نام پیشی ہے جس کی عجیب و غریب وارداتیں تقریباً ہر روز چکی خانے میں پیش آتی رہتی تھیں۔ اگر چالیس سیر غلے کا آٹا ٹھیک چالیس سیر سے چھٹانک آدھ پاؤ بھی کم ہو جائے تو پیشی۔ اگر آٹا ذرا بھی موٹا رہ جائے تو پیشی۔ اگر آٹے میں ذرا بھی مٹی یا پانی ملائے جانے کا شبہ ہو تو پیشی۔ مٹی یا پانی ملائے جانے کا معاملہ اس طور پر ہے کہ بعض قیدی کافی خوراک نہ پانے کے سبب سے مجبوراً کچا غلہ چبا جانے پر مجبور رہتے ہیں اور بعد میں آٹا پورا کرنے کے لیے گیہوں میں مٹی یا جوار یا چاولوں میں پانی ملا دیتے ہیں۔ جو لوگ نہیں کھاتے انھیں بھی کچھ نہ کچھ ملانا ضرور پڑتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ آٹا پیسنے کے دوران میں کچھ تو چکی میں رہ جاتا ہے اور کچھ اڑ کر ہوا میں مل جاتا ہے، کچھ پیسنے والوں کے بدن پر پسینے کے ساتھ جم جاتا ہے۔ داروغہ صاحب علانیہ فرماتے تھے کہ جو چاہو کرو ہم کو آٹا پورا دو۔ ورنہ ہم پیشی کر دیں گے۔ چناں چہ چکی خانے کا برقنداز بھی ڈر کے مارے

خود ہی قیدیوں کو مٹی چھپا کر بے آنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ ایک روز ایک قیدی کی برقنداز سے اس بنا پر کچھ مخبت ہو گئی تھی کہ برقنداز نے اسے غلہ چرا کر نہ لے جانے دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیدی نے دفعدار کو بلایا اور کہا کہ برقنداز پانی ملواتا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھیے کہ سب سے پہلی چکی میری ہی تھی جس کے پاس ہی میرا ساتھی بہ قدر ضرورت یعنی قریب آدھ یا پون پاؤ کے پانی ملا رہا تھا۔ مجھ کو اس واقع کی خبر نہ تھی کیوں کہ عام طور پر میں روزانہ غلہ پیسنے کے بعد چکیوں کے جانب پشت جا کر زمین پر لیٹ رہا کرتا تھا اور آٹے کا جھاڑنا اور ٹلی میں بھرنا وغیرہ اپنے ساتھی ہی پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ ہنگامہ برپا ہونے پر میں نے بھی دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرا ساتھی گرفتار ہے۔ اس کے پاس یا میرے پاس کچھ پیسے دفعدار کو دینے کے لیے ہوتے تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔ لیکن چوں کہ ہم دونوں نادار تھے اس لیے پیشی ہوئی اور کچا غلہ کھا جانے کے الزام میں تین دن رہائی ضبط ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مسکراہٹ سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں میری نسبت غلہ کھانے کا گمان نہیں ہے لیکن اصولِ جیل کے مطابق کسی ماتحت کے پیش کرنے پر سزا کا دینا لازمی تھا، ورنہ اس کی سبکی ہوتی۔ میرے متعلق پیشی کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ پہلا واقعہ اس سے بھی زیادہ دل چسپ ہے۔ چکیاں عموماً اس قدر وزنی ہوتی ہیں کہ ایک شخص کو ان کے اوپر کا پاٹ اٹھانا بھی مشکل ہوتا ہے اس لیے دو شخص ایک چکی پر آمنے سامنے کھڑے ہو کر پیستے ہیں اور اگر برابر پیسے جائیں تو صبح چھ بجے سے لے کر سہ پہر کے تین بجے تک غلہ پس جاتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دونوں پیسنے والے برابر زور لگائیں۔ میری نسبت وارڈر کو یہ گمان تھا کہ اس سے چکی نہ پس سکے گی۔ جب دوسرے دن برقنداز سے دیا فت کرنے پر اس نے معلوم کیا کہ میں نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا تو اسے یقین نہ آیا اور برقنداز سے ایسی باتیں کیں جن سے اس نے اپنی سمجھ کے مطابق یہ نتیجہ نکالا کہ میری نسبت وارڈر کا منشا یہ ہے کہ اس کی پیشی ہو جائے۔ چناں چہ تیسرے ہی دن اس نے

مجھے سب سے زیادہ خراب چکی دی اور میرے جوڑی دار کو سمجھا دیا کہ تم ڈھیل دے دینا، تمھیں ہم پیشی پر نہ بھیجیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دس سیر غلہ باقی رہ گیا۔ قاعدے کے مطابق ہم دونوں کی پیشی ہونی چاہیے تھی لیکن حسب قرار داد سابق صرف میری پیشی ہوئی اور دو دن کے لیے رات کو ہتھکڑیاں ڈالنے کی سزا تجویز ہوئی میں چاہتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ سے سب حال کہہ دوں لیکن ہتقندار کو میٹی اتارکر زدوکوب پر آمادہ پاکر میں نے خاموشی اختیار کی اور معاملے کو خدا کے سپرد کیا۔

(۸)

صبح سے شام تک چکی پیسنا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز جس شخص کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ہو، اسے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یک قلم عرصہ دراز کے لیے علاحدہ کر دینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو خاص تاکید کر دی تھی کہ کاغذ قلم پنسل کتاب یا اخبار تک اس شخص کی کسی طرح دست رس نہ ہو سکے۔ اس خاص سختی کے سبب سے چکی پیسنے کے دوران میں جتنے شعر خیال میں آتے تھے انھیں اکثر کئی کئی دن تک بہ کوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ ان غزلوں کے جمع ہونے اور بہ حفاظت جیل سے باہر پہنچ جانے کا قصہ اکتوبر ۱۹۰۹ء کے پرچے میں درج ہو چکا ہے۔ چکی پیسنے والوں کی نگرانی میں ایک قیدی نمبردار کے سپرد ہوتی ہے۔ راقم حروف چوں کہ سال بھر کے قریب چکی خانہ میں رہا اس لیے سیکڑوں قیدیوں اور متعدد نمبرداروں کے وہاں جانے اور تبدیل ہونے کا عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ چوں کہ نئے قیدیوں کو عموماً پہلے چکی ہی دی جاتی ہے اس لیے نئے آنے والوں سے سب سے پہلے ملاقات کا موقع چکی خانے والوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

نومبر ۸ء میں من جملہ دیگر نو وارد قیدیوں کے ایک اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ کے منیجر مسٹر ریفنل کے بیٹے بھی تھے، جنھوں نے اپنے مقدمے کا فیصلہ بہ ذریعہ جوری کرانے سے انکار کر کے نادانستہ طور پر یورپشین ہونے کا حق کھو دیا تھا اور دیسی عیسائیوں کے زمرے میں بہ جبر شامل کر دیے گئے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد ایک انگریزی داں شخص سے مل کر نہایت خوشی ہوئی۔ زیادہ تر مسرت کا باعث یہ تھا کہ مسٹر ریفنل کچھ کچھ اخباری دنیا کے حالات سے بھی آگاہی رکھتے تھے۔ زمانۂ حوالات میں بھی ان کو پانیر وغیرہ پڑھنے کو مل جایا کرتا تھا کیوں کہ اس وقت تک ان کے ساتھ یوریشینوں ہی کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اور تو سب خبریں انھوں نے صحیح بتائیں لیکن مسٹر تلک کی نسبت جو امید انھوں نے ظاہر کی تھی وہ غالباً یہ پری کونسل میں اپیل سے رہا ہو گئے ہوں گے، بعد میں غلط ثابت ہوئی۔ مسٹر تلک کی فرضی رہائی کا مژدہ سن کر راقم نے اپنی دلی مسرت کا اظہار ایک فی البدیہ غزل کے ذریعے سے کیا تھا، جس کا مطلع اس وقت تک یاد ہے[۱۶]۔

نسیم صبح گاہی یہ پیام جانفزا لائی
تلک کو بے گناہی ان کی لندن سے چھڑا لائی

سوامی شوانند نے بھی ایک ہندی چیز اس موقع پر تصنیف کی تھی جس کا ایک ایک لفظ رنگ تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ خیر مسٹر ریفنل کو دو ہی چار روز چکی پیسنے کے بعد اس بلا سے نجات مل گئی اور وہ جیل پریس میں پروف ریڈری پر بھیج دیے گئے۔ ایک مسٹر ریفنل ہی پر کیا موقوف ہے جتنے لوگ چکی خانے میں تھے، سب اپنے اپنے وقت پر یعنی کوئی ایک ہفتہ پندرہ روز کوئی ایک مہینہ اور کوئی حد درجے تین مہینے رہ رہ کر دوسری آسان مشقتوں پر چلے چلے گئے۔ حکام جیل کی خاص عنایت سے یہ فخر اس خاکسار ہی کو حاصل ہوا کہ تقریباً سارا زمانۂ قید اسی ایک شغل میں گزارنا پڑا۔ جیل میں ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چکی پیسنے والوں کا معائنہ خاص اسی غرض سے ہوا کرتا ہے کہ جو قیدی وزن میں کم ہو گئے ہوں یا جن کو چکی پیسنے

کئی مہینے گزر چکے ہوں وہ کسی دوسرے آسان کام پر بھیج دیے جائیں۔ راقم حروف کے زمانہ میں تین چار بار ایسے معائنے ہوئے جن میں تقریباً تمام پرانے ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کر دی گئیں۔ لیکن یہ کمترین جہاں تھا وہیں رہا۔ ایک بار جیلر نے خاص کر میرے لیے تبدیلی مشقت کی سفارش بھی کی اور سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کی غیر معمولی کمی سے بھی آگاہ کیا۔ داخلۂ جیل سے قبل راقم حروف کا وزن ۱۳۲ پونڈ تھا لیکن اس وقت صرف ایک سو آٹھ پونڈ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ کی قساوتِ قلب نے اس کی جانب بھی کچھ توجہ نہ کی اور میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔

ہر روز صبح کو سب قیدی جانگیا، کرتا، تسلا، کٹوری چکی خانے کے باہر برآمدے میں لگا کر صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ان سب کی گنتی لے کر دفعدار باہر سے دروازہ بند کر کے قفل لگا دیتا ہے کھانے کے وقت دروازہ پھر کھولا جاتا ہے اس سے قبل اگر کسی کو رفع حاجت کے لیے دفعدار کو دروازہ کھولنے کی تکلیف دینا پڑے تو اس تکلیف ہی کا عوض اکثر ڈنڈوں اور سونٹوں کی شکل میں یقیناً ملتا ہے۔ کئی قیدیوں کو تو اس جرم میں اتنی سزا ملی کہ عرصے تک ان کے اعضا مجروح باقی رہے۔ قیدیوں کے مارنے پیٹنے کی قانوناً ضرور ممانعت ہے لیکن جب خود وارڈر قواعد جیل کی پابندی نہیں کرتے تو ان کے ماتحت دفعداروں سے اس کی امید رکھنا عبث ہے۔ ہمارے سامنے اسمٰعیل قیدی کو بے رحم وارڈر نے اس قدر مارا کہ اس کا تمام جسم زخمی ہو گیا اور پھر الٹی سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کر کے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوا دیں۔ قصور اس کا صرف اتنا تھا کہ ہاتھ میں ضرب آ جانے کے سبب سے اس نے چکی پیسنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی۔

جب کبھی گودام میں ضرورت سے زیادہ آٹا جمع ہو جاتا ہے تو دو ایک روز کے لیے چکی والے قیدی کسی دوسرے کام پر بھیج دیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر

انھیں کٹنگ مشین پر کربی کاٹنے یا بنولے صاف کرنے کی خدمت ملتی ہے۔ لوگ اس تبدیلی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ اسی بہانے سے کم از کم اپنے احاطے سے باہر نکلنے اور دن بھر کھلے میدان میں رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن راقم حروف اس عارضی لطف سے بھی محروم رہا۔ کیوں کہ جب کبھی ایسا موقع ہوتا تھا تو وارڈر مجھ کو باہر جانے والے گروہ سے الگ کرکے چکی خانے ہی میں بند کر دیتا تھا اور قہر درویش بر جان درویش، اس روز اکیلے ہی چکی پیسنا پڑتی تھی۔ صرف ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ وارڈ کی عدم موجودگی میں، میں بھی اور لوگوں کے ساتھ احاطے سے باہر گیا۔ بنولے صاف کرنے کی مشین ہمارے احاطے سے کسی قدر فاصلے پر ایک ایسی جگہ نصب تھی جہاں چاروں جانب درختوں اور جھاڑیوں کی موجودگی سے نواح دیہات کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ قیدیوں نے اس موقع کی پوری قدر کی۔ یہاں تک کہ قیدی نمبردار نے بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی سختی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ قیدیوں کے دو گروہ کر دیے گئے تھے، جو باری باری سے بیلوں کی طرح مشین کو گھماتے تھے۔ ہر گروہ اپنی وقت فرصت کو کشتی لڑنے، ہنسی مذاق یا راگ راگنی میں صرف کرتا تھا۔ ہمارے گروہ میں ضلع جھانسی کا ایک میراثی غوثو نام تھا۔ لوگوں کے اصرار سے اس نے اردو ہندی کی کئی چیزیں خوب گائیں۔ راقم حروف کی طبیعت کو چوں کہ موسیقی سے ایک فطری انس ہے اس لیے غوثو کی نغمہ سنجی نے دل پر نہایت گہرا اثر کیا۔ اس گانے کی تاثیر اس حسن اتفاق سے اور بھی زیادہ ہو گئی کہ ہندی چیز غوث پاک محبوب سبحانی حضرت سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں تھی جن کی غلامی پر اس فقیر کو ہزاروں ناز ہیں۔ طرفہ تر یہ کہ اس ٹھمری کے آخر میں تخلص راقم کے عزیز بزرگ مولوی سید فخر الحسن نظرت موہانی کا نکلا وہ ٹھمری یہ ہے!۔

سنسار تھارو نام جیسے بگداد کے مورد کا نھیا

تیرا بنداد

نیہ کی آگ لگی تن ماں دن رین کہت دیاد یا

محبّت — رات دن

کٹ جائے پیا چیری تیری سگری ہوں بپت کی بیں گھری

کہاں — مصیبت

گریب نواج ۲۹ آ رلو اب مورے سر سے دکھ کی گاگریا

غریب نواز

مہراج دیا کی ایک نجر، فطرت کا سر توری چوکھٹ پر

نظر

حنین کا صدکا پار کرو منجدھارسے موری ناؤ ریا

صدقہ

چکی خانے میں پسائی کا کام عموماً وقت مقررہ سے کچھ نہ کچھ پہلے ہی ختم ہو جایا کرتا تھا۔ اسی لیے داروغہ کے آنے تک کا وقت باہم قیدیوں کی بات چیت یا کبھی آلہا اودل کی رزمیہ نظم کے سننے میں صرف ہوتا تھا۔ راقم نے چونکہ کبھی اس لاجواب ہندی ایپک کو غور سے نہ سنا تھا اس لیے اس کی خوبیوں سے ناآشنائے محض تھا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ہندی زبان میں اس سے بہتر کوئی رزمیہ نظم اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس نظم کی خوبی اور عوام کی نظروں میں اس کی پسندیدگی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس وقت ہمارے صوبے میں ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جنھیں یہ افسانہ ازبر یاد ہے۔ ایک نینی ہی کے سنٹرل جیل میں دس بارہ قیدی، جن میں دو مسلمان بھی تھے، اس داستان کے حافظ موجود تھے۔ ضلع کانپور کے ٹھاکر باسدیو سنگھ اور ضلع لکھنؤ کے پنڈت تلسی رام کی آلہا کو ہم لوگ روزانہ بڑے شوق اور انتہا درجے کی توجہ سے سنا کرتے تھے۔

(جلد ۱۱: نمبر ۸: اگست ۱۹۱۰ء ص ۸-۱۱)

(۹)

راقم حروف کے چکی خانے میں داخل ہونے کے وقت دو برقنداز نگرانِ کار مقرر تھے۔ ایک میر مظفر حسین صاحب فوق بجنوری اور دوسرا ضلع باندا کا بندا اہیر۔ جن میں سے میر صاحب کو تو دو ہی تین روز میں صرف میری وجہ سے جیل پریس کی نگرانی سپرد ہو گئی۔ بندا سے البتہ بہت روز تک سابقہ رہا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے نائب جیلر کا اشارہ پاکر بلا وجہ میری پیشی کرادی تھی لیکن بعد میں اپنی غلطی پر نادم ہوئے۔ فی چکی دو قیدیوں کے حساب سے چکی خانے میں جتنے قیدیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ برقنداز اُس تعداد سے ہمیشہ دو ایک آدمی زائد ضرور رکھتا ہے، تاکہ اگر کوئی قیدی دفعتاً بیمار ہو جائے یا اور کوئی وجہ پیش آجائے تو کام بند نہ رہے۔ ان زائد آدمیوں کی نسبت برقنداز کو اختیار حاصل رہتا ہے کہ ان سے کوئی کام نہ لے یا لے بھی تو محض برائے نام۔ مثلاً کسی کمزور قیدی کی مدد کر دینا یا کسی دیر میں کام ختم کرنے والے کا آٹا چھنوا دینا وغیرہ۔ اگر مخبری کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے زائد لوگوں کے زمرے میں داخل کر لینے سے غالباً بندا کو انکار نہ ہوتا۔ لیکن نائب جیلر کے خوف سے اس غریب کو کبھی میرے ساتھ رعایت کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور رمضان شریف کا پورا مہینہ مجھ کو چکی ہی پیستے گزرا بندا اس مصیبت میں میرے ساتھ ہمدردی ضرور کرتا تھا، لیکن مخبروں کی مخبری اور نائب جیلر کی بے رحمی کے خیال سے بے چارہ بالکل مجبور تھا۔ بندا کے بعد امروہے، کے منشی ایزد بخش برقنداز ہوئے۔ انھوں نے کچھ دنوں تک تو بندا ہی کی پیروی کی، لیکن آخرکار اتنی رعایت کرنے لگے کہ جب کبھی موقع ہوتا تھا تو وہ مجھ سے کام نہ لیتے تھے۔ دسمبر کے آخری اور جنوری کے ابتدائی ہفتوں میں ان کی یہ رعایت مجھ کو بہت غنیمت معلوم ہوئی، کیوں کہ ایسی سخت سردی میں بالکل برہنہ تن ہو کر چکی پیسنے کے لیے دن بھر کھڑے رہنا کارے دارد کا مضمون تھا۔ ایزد بخش کے بعد رسول (ضلع مظفر پور) کے منشی عبدالحق آئے۔ یہ صاحب

حضرت فوقؔ کی طرح شاعر تو نہ تھے تاہم کچھ نہ کچھ شوق شعر و شاعری سے ضرور رکھتے تھے۔ ایک روز وہ اپنے ہمراہ متفرق اشعار و غزلیات کا ایک مجموعہ بھی لائے۔ جسے جیل پریس کے کسی خوش مذاق قیدی نے اپنے دل بہلانے کے لیے مرتب کیا تھا۔ اپنا کام ختم کر چکنے کے بعد جب میں ان کے قریب سے گزرا تو انھوں نے وہ بیاض مجھے بھی دکھلائی۔ ایک عرصے دراز کے بعد کتاب کی شکل دیکھ کر جتنی مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کا اندازہ کوئی آزاد شخص ہرگز نہیں لگا سکتا۔ لیکن افسوس کہ اس واقعہ کی اطلاع کسی نامعقول نے نائب جیلر کو بھی کر دی۔ چناں چہ اس نے دفعتاً کئی برقندازوں کے ہمراہ آ کر چکی خانے کا محاصرہ کر لیا اور فرداً فرداً ہر قیدی کو بالکل برہنہ کرا کر ان کی تلاشی لی مطلب تو اس کا مجھ پر الزام لگانا تھا مگر جب میرے پاس کچھ نہ نکلا تو سارا وبال غریب عبدالحق کے سر پڑا۔ انھوں نے بہت کچھ معذرت کی لیکن نائب جیلر کی فطری بے رحمی پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور اس نے دوسرے ہی دن سپرنٹنڈنٹ سے کہہ سن کر ان کی برقندازی تڑوا دی اور معمولی قیدی بنا کر آگرہ کو چالان کر دیا۔[18]

(۱۰)

جیل خانوں میں عام طور پر اتوار کے روز تعطیل کا دستور ہے لیکن الٰہ آباد سنٹرل جیل میں چکی پیسنے والے کے سوا باقی اور قیدیوں کو اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا ہے لیکن حکام جیل کی حرص قیدیوں کو ہفتے میں ایک دن کی بھی فرصت دینا گوارا نہیں کرتی۔ کیوں کہ حکومت نے قید خانوں کو اچھے خاصے کارخانوں کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے، جن کا ایک روز کے لیے بھی بند رہنا جیل کی مالی آمدنی میں کمی واقع ہونے اور اس لیے آخر سال پر حکام جیل کی حسن کارگزاری میں نقص پیدا کر دینے کا موجب ہو سکتا ہے۔

مہذب ممالک میں مجرموں کی اصلاح خصوصیت کے ساتھ مدِ نظر رہتی ہے لیکن ہندستان میں وہاں زیادہ سے زیادہ کام لینے اور ان پر کم سے کم خرچ کرنے کے سوا اور کوئی اصول پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ اتفاقی طور پر پیٹ میں درد پیدا ہو جانے یا بخار آ جانے کا عذر کر کے اگر کوئی شخص کام کرنے سے عذر کرے تو شفا خانے بھیجے جانے کے بجائے یقیناً اسے اوّل تو وارڈر اور بعد از اں نائب جیلر کے ڈنڈوں کی سخت مار برداشت کرنا پڑے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ اتوار کو بھی عموماً تقریباً کل قیدی یا تو اپنے اپنے کام کے لیے کارخانوں کو بھیج دیے جاتے ہیں یا کوئی اور بیگاری کام انھیں دے دیا جاتا ہے۔ اتوار تو اتوار عید، بقر عید، محرم وغیرہ کو بھی تعطیل کا اور جیلوں میں دستور ہو تو ہو نینی میں مسلمانوں کے ان مذہبی تہواروں کا بھی مطلق نہیں لحاظ کیا جاتا۔ چناں چہ بقر عید کو مسلمان عموماً مجبوراً نماز پڑھنے سے محروم رہے۔ صرف چند برقندازوں اور بعض مخصوص قیدیوں نے یک جا ہو کر نماز پڑھی۔ راقم حروف کو میر منظفر حسین صاحب نے خاص طور پر سفارش کر کے تھوڑی دیر کی چھٹی دلا دی تھی ورنہ میں ابھی کچھ نہ کر سکتا۔

مسلمانوں کے ساتھ تو ایسی بے اعتنائی اور عیسائیوں پر یہ مرحمت کہ بڑے دن کی تقریب میں قیدیوں کو چھٹی کے علاوہ فی کس آدھ آدھ پاؤ گڑ بھی تقسیم کیا گیا۔ یوروپین اور یوریشین قیدی یوں بھی جس آرام سے رہتے ہیں اس کا ذکر ہم کسی گزشتہ پرچے میں کر چکے ہیں[1]۔ بڑے دن کو حکام جیل کی جانب سے ان سب کی دعوت کی جاتی ہے اور طرح طرح کی مٹھائیاں میوے اور سگریٹ تقسیم کیے جاتے ہیں۔ نماز پڑھانے کے لیے پادری برابر آیا کرتا ہے۔ مسلمان غریب اگر بجائے خود بھی چاہتے ہیں تو تو اعدِ حیا و شریعت کے خلاف انھیں مجبوراً بہ حالتِ نیم برہنگی نماز ادا کرنا پڑتی

---

[1] دیکھیے ضمیمہ نمبر

ہے۔ اگر جانگیا میں صرف ایک یا دو بالشت کپڑا زیادہ لگا یا جائے تو کافی ستر پوشی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ہو تو کیوں کر ہو قیدیوں کی تو کوئی کچھ سنتا نہیں ہے رہے آزاد مسلمان ان کو انگریزوں کی خوشامد اور مسلم لیگ کے ذریعہ سے خاص رعایتیں حاصل کرنے کی کوشش سے کب فرصت ملتی ہے اور کبھی ملے بھی تو بھلا حکومت کے مقرر کردہ قواعد پر اعتراض کرنے کا گناہ ان سے کیوں سرزد ہونے لگا۔

اس موقع پر شاید ناظرین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ قیدی ان تمام ابتریوں کی شکایت افسران جیل سے کر کے انسداد کی فکر کیوں نہیں کرتے، اس کا افسانہ طول و طویل ہے۔ وارڈر یا نائب جیلر سے کسی قسم کی شکایت کرنا بالکل فضول ہے کیوں کہ جو کچھ سختیاں جیل میں ہوتی ہیں وہ یا تو خود ان کے اشارے سے ہوتی ہیں یا کم از کم ان پر انھیں کچھ اعتراض نہیں ہوتا۔ رہا سپرنٹنڈنٹ جیل، اس تک اول تو کسی کی رسائی نہیں ہوتی۔ یا اگر کبھی پریڈ وغیرہ کے موقع پر کچھ کہنے سننے کا موقع بھی ملتا ہے تو نائب جیلر کی غضب آلود نگاہ کے اثر سے "عذر" کرنے والے کے ہوش و حواس ابتدا ہی میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اس پر بھی اگر کسی نے جی مضبوط کر کے کچھ عرض کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر اس کا مطلب انگریزی میں نائب جیلر سے دریافت کرتے ہیں جو اس قیدی کی شکایت کو اپنی نشتر بجوں اور توجیہوں کے ساتھ اس شکل میں پیش کرتا ہے کہ اکثر اس غریب کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ مثلاً الہ آباد کے سبحان نے عذر کیا کہ میرے ہاتھ کا گٹا اترا ہوا ہے اس لیے مجھ کو آسان کام دیا جائے۔ نائب جیلر نے بہ حیثیت ترجمان اس بیان پر اپنی جانب سے اتنا اور بڑھا دیا کہ میرے خیال میں یہ شخص بہانہ کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چکی خانے سے اس کی مشقت تو تبدیل ہوئی نہیں البتہ ایک ماہ کے لیے بیڑیاں اس کے پیروں میں اور ڈال دی گئیں چھیری ضلع الہ آباد کے خلیل کی ایک انگلی کٹنگ مشین میں کسی طرح سے کٹ گئی

اس کی نسبت بھی نائب جیلر نے یہ بات جڑ دی کہ اس نے کام سے جان بچانے کے لیے اپنا ہاتھ خود زخمی کر لیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ بے میعادی بیڑیوں کے علاوہ تین مہینے کے لیے چکی ان کے نام لکھ دی گئی۔ بے چارے ایک ہاتھ سے چکی پیستے تھے اور نائب جیلر کی جان کو روتے تھے طرفہ تر یہ کوئی شخص بہ طور خود اپنا حال سپرنٹنڈنٹ سے انگریزی میں نہیں عرض کر سکتا۔ کیوں کہ انگریز سے انگریزی میں گفتگو کرنا گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے۔ میں نے ایک بار بہ حالت ناواقفیت نائب جیلر سے کچھ بات انگریزی میں کرنا چاہی تھی کہ ایک ہندستانی وارڈر اس کے اشارے سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ ناچار خاموشی اختیار کی شکایت کرنے والے کی پریشانیوں کا خاتمہ یہیں پر نہیں ہو جاتا بلکہ عذر کرنے کے بعد نائب جیلر یا وارڈر ہمیشہ کے لیے اس کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس کا نام قصور پیشتوں کی فہرست میں درج کر دیا جاتا ہے۔

سال میں دو بار انسپکٹر جنرل صاحب بھی جیل خانوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ ان کی فریاد رسی اور انصاف پسندی کا افسانہ اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ جیل میں آپ کی آمد کا ہنگامہ قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے سے آپ کے ملاحظے کے لیے قیدیوں کو جیل کی قواعد سکھائی جاتی ہے سلامی کی پریڈ، نہانے کی پریڈ، بارک بندی پریڈ، کھانے کی پریڈ، پاخانے کی پریڈ۔ متعدد پریڈوں کی مشق ناواقف قیدیوں کو پاگل بنا دیتی ہے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد پھر مغرب تک اس قواعد کی مصیبت سے ناک میں دم آ جاتا ہے قواعد کے دوران میں اگر کبھی نائب جیلر صاحب تشریف لے آئے تو گویا ایک اور بلا نازل ہوئی۔ ہنٹر آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور بے رحمی آپ کے دل میں۔ ذرا بھی کسی سے کوئی غلطی ہوئی کہ آپ نے بلا تکلف ایک ہنٹر رسید کیا۔ انسپکٹر جنرل کے آنے سے ایک روز قبل آپ وارڈروں کے ذریعے سے ہر بارک میں منادی کرا دیتے ہیں کہ جس کسی کو کچھ عذر کرنا ہو وہ پہلے ہم سے بیان

کرے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی نے انسپکٹر جنرل سے کسی قسم کی کوئی شکایت کی تو اس کے لیے اچھا نہ ہوگا۔ قیدی بھی عموماً جیل خانے کی راہ و رسم سے واقف ہونے کے بعد شکایت کر کے خواہ مخواہ مبتلائے مصیبت ہونے سے پرہیز کرتے ہیں اور اس طرح پر جنرل صاحب، فرض ادا کرنے کے طور پر بہ کمال تیز گامی سارے جیل کا چکر لگا جاتے ہیں اور کوئی قیدی چوں تک نہیں کرتا۔ دوسرے دن رجسٹر معائنہ میں آپ کو یہ عبارت لکھی ہوئی نظر آئے گی کہ "سب قیدی خوش ہیں کسی کو کچھ شکایت نہیں۔ انتظام سب اچھا ہے" لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص از راہِ بے باکی نائب جیلر، سپرنٹنڈنٹ جیل کی خفگی سے بے پروا ہو کر کھانے کی خرابی، وارڈر کی سختی اور حکام جیل کی بے رحمی کی داستان "جنڈیل" سے کہہ بھی سنائے تو کیا ہو، "ایں خانہ تمام آفتاب است" محکمہ جیل کے ایک ادنا ملازم سے لے کر انسپکٹر جنرل تک سب کے سب بے رحمی اور بے پروائی کے یکساں رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل کی عدیم الفرصتی اول اول تو کسی فریادی کی فریاد کو باطمینان سننے کی اجازت ہی نہیں دیتی لیکن اتفاق سے اگر آپ متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اس توجہ کا نتیجہ عموماً سوا اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ عذر کرنے والا اسی وقت کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے دن "جنڈیل" صاحب تو چل دیتے ہیں لیکن اس غریب کی شامت آ جاتی ہے کیوں کہ "جنڈیل" سے بلا اطلاع حکام عذر کرنے کے اس سے سخت بازپرس ہوتی ہے اور اس تمام جھگڑے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قیدی کسی دوسری جیل کو روانہ کر دیا جاتا ہے جہاں جاتے ہی یقینی طور پر اس کا نام شورہ پشت قیدیوں کی فہرست میں درج کر لیا جاتا ہے۔

انسپکٹر جنرل کے دورے کو زندانی اصطلاح میں جنڈیلی کہتے ہیں۔ قیدیوں کو جنڈیلی سے زحمت اور پریشانی کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ہے کہ وہ لوگ اس سے بلائے ناگہانی کی طرح لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ البتہ دوران معائنہ میں دو ایک روز کھانا نسبتاً ضرور اچھا ملتا ہے۔ یعنی معمول کے خلاف روٹیوں کا آٹا مٹی اور چونے کی آمیزش سے پاک ہوتا ہے اور شام کو چولائی کے ساگ یا ڈنٹھلوں کے بجائے ترکاری کے بھی دو چار قتلوں کی صورت نظر آتی ہے۔

مجسٹریٹ علی گڑھ نے میرے مقدمے میں سزا دہی کے سارے اختیار ختم کر دیئے تھے۔ یعنی دو سال قید سخت اور پانچ سو روپے جرمانہ۔ زیادہ کا اگر انھیں اختیار ہوتا تو شاید اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ہائی کورٹ سے قید کی میعاد گھٹ کر دو سال سے ایک ہی سال رہ گئی لیکن جرمانہ بدستور قائم رہا۔ جس کے عوض میں چھ مہینے کی قید سخت کو ملا کر گویا فی الجملہ ڈیڑھ

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ کا)

جیل والوں کی بے دردی کا یہ افسانہ خالی از مبالغہ ہے۔ ثبوت کے لیے صوبجات متحدہ کی کونسل میں اردوئے معلّٰی کے "مشاہدات زنداں" کی نسبت آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کا سوال اور حکومت کی جانب سے اس کا مہمل جواب ملاحظہ طلب ہے۔ بابو صاحب نے دریافت کیا تھا کہ آیا گورنمنٹ کی نظر سے اردوئے معلّٰی کے یہ مضامین گزرے ہیں اور آیا ان کی بابت کچھ تحقیقات کی جائے گی۔ انسپکٹر جنرل صاحب نے بہ کمال تمرد بے پرواہی جواب دیا کہ گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے اور ان کے متعلق نہ کوئی تحقیقات کی گئی ہے نہ آئندہ کی جائے گی یہ جواب جن پُر غرور الفاظ اور جس غضب ناک لہجے میں دیا گیا ہے اس پر نظر کر کے ارباب انصاف خیال کر سکتے ہیں کہ اگر خدانہ خواستہ اڈیٹر اردوئے معلّٰی یہی شکایتیں کرنل صاحب بہادر سے ایک قیدی کی حیثیت سے کرتا تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا۔ خوش قسمتی سے حسرت اس وقت آزاد اور ان کے قبضۂ اقتدار سے باہر ہے ورنہ قیدی پا کر آپ خدا جانے کیا غضب ڈھاتے! خیر آپ حاکم ہیں اور ہم لوگ محکوم، جو چاہیے کیجیے لیکن اتنا خیال رہے کہ جبر و خودسری کے ساتھ غرور و تمرد زوال کی یقینی علامتوں میں سے ہے۔ سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

برس کی سزا باقی رہی۔ حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے۔ جتنی سختی اس کے ساتھ چاہیں کریں۔ چنانچہ ابتدائے قید سے لے کر دس ماہ تک برابر چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بنا پر تھا۔ اگر یہ میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ برس برابر مجھ کو چکی پیسنا پڑتی۔ لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے بھائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت سے زرجرمانہ ادا کرنا پڑا۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو قلیل جائداد وراثتاً مجھ کو پہنچی تھی وہ بھی مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کردی جاتی۔ اور سرکاری نیلام جس بے دردی اور بے پرواہی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں لوگوں کے پیش نظر ہو چکا تھا کہ زرجرمانہ کے عوض میں اردوئے معلیٰ کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپیوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ صرف ساٹھ روپے میں برباد کردیا گیا۔

اہل حرفہ کے متعلق یہ قانون ہے کہ حکم نیلام سے ان کے پیشے کے اوزار مستثنا سمجھے جاتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اخبار نویسوں ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اس درجہ سختی کیوں روا رکھی جاتی ہے کہ ان کے نایاب اور قیمتی کتابیں ناقدردانوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کردی جاتی ہیں۔ جرمانہ اسی قدر ہونا چاہیے جس قدر ملزم سے ادا ہو سکے۔ علی گڑھ میں ہر شخص آگاہ تھا اس لیے غالباً مجسٹریٹ علی گڑھ بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ ایڈیٹر اردوئے معلیٰ ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے ایسی حالت میں اس پر ۵۰۰ روپے جرمانہ کرنا اصول انصاف اور انسانیت کے کہاں تک موافق یا مخالف ہے؟ اس کا فیصلہ ہم ناظرین کے ذمے چھوڑتے ہیں۔

اس جرمانے کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کوششوں اور محنتوں سے بہم پہنچایا تھا، جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی

نسخے و دواوین شعرا وغیرہ کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ ان سب کو پولیس کے جاہل نوجوان تھیلوں میں بھر بھر کے اس طرح سے لے گئے جیسے کہ لوگ لکڑی یا بھس لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو بہت دور تھا، کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری اس کا ذکر کرنے ہمارا دل دکھتا ہے۔ اس لیے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ اس جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے۔

سلسلۂ کلام کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اصل ذکر اس بات کا تھا کہ زرِ جرمانہ کے دفعتاً ادا ہو جانے سے قید کی میعاد صرف ایک سال رہ گئی اور اور پوری مشقت کرنے والے قیدیوں کو فی ماہ تین روز کے حساب سے حکومت کی جانب سے جو رہائی ملتی ہے اسے بھی شامل کرنے کے بعد میری رہائی میں صرف ایک ماہ بلکہ کچھ اس سے بھی کم باقی رہ گیا۔ اب تو منتظمین جیل کے کان کھڑے ہوئے اور انھیں میرے ساتھ اپنے برتاؤ کی سختی کا بھی کچھ احساس ہونے لگا چنانچہ ایک روز خلاف معمول شام کے وقت بارک بند کرنے کے موقع پر نائب جیلر نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کو کوئی دوسری مشقت دی جائے تو اسے پسند کرو گے یا نہیں؟ لوگوں کو جناب موصوف کے اس غیر معمولی اظہار لطف و کرم پر کمال تعجب تھا لیکن راقم حروف کو ان کی نیت کا حال معلوم ہو گیا تھا کہ چند روز کے لیے کسی کارخانے میں بھیجنے سے اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہے کہ مجھ سے تمام میعاد چکی پسوانے کے الزام سے بچنے کی صورت اور قسم کھانے کی گنجائش نکل آئے۔ پس میں نے تبدیلی مشقت کے اس عجیب تحفے کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔

تجربے سے ثابت ہوا کہ میرا قیاس بالکل صحیح تھا کیوں کہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں انسپکٹر جنرل جیل خانجات میرے متعلق آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کے ایک سوال کا جواب ایسے مبہم اور پُر فریب الفاظ میں دیا ہے جس

سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ممبران کونسل کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر میرے اس انکار کو بھی اپنے مفید مطلب بنانا چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "ایک موقع پر ملزم نے خود کسی دوسری مشقت کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔" انسپکٹر جنرل کا یہ مبہم جملہ اپنے پُر فریب مفہوم کے ذریعہ سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا کرانا چاہتا ہے کہ گویا اڈیٹر اردوئے معلی نے چکی کی مشقت کو از خود دوسری مشقتوں پر ترجیح دی ورنہ حکام جیل اُسے دوسرا کام دینے پر آمادہ تھے۔ حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اصل واقعہ اور انکار کا صحیح موقع وہ تھا جس کا ذکر اس مضمون میں کر دیا گیا ہے۔ کیا کرنل صاحب کی انفیشل راست بازی ہمارے اس بیان کی بھی کچھ "تاویل" کر سکتی ہے۔ کرنل صاحب نے یہ بھی گل نشانی فرمائی ہے کہ روزانہ ایک من غلہ پیسنے کا بیان غلط ہے عام قیدیوں کی طرح اڈیٹر اردوئے معلی کو بھی پندرہ سیر گیہوں ۲۰ سیر چنے پیسنے کو ملتے تھے نیز یہ کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اختیار ہے کہ جس قیدی کو جس مشقت کے لائق دیکھے اس پر لگائے

اس مختصر بیان سے کئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اوّل تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اڈیٹر اردوئے معلی کے ساتھ کوئی خاص سختی نہیں کی گئی بلکہ عام قیدیوں کی طرح چوں کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اسے صرف چکی پیسنے کے لائق سمجھا اس لیے اس سے برابر چکی ہی پسوائی گئی۔ حالاں کہ یہ سراسر غلط ہے۔ کیوں کہ کسی نیک چلن قیدی کا پوری میعاد تو کیا نصف میعاد تک بھی چکی پیسنا ناممکن ہے۔ کیوں کہ چوتھائی میعاد کے گزرنے پر عام قیدی پہرے دار اور زیادہ سے زیادہ نصف میعاد گزرنے پر برقنداز بنا دیا جاتا ہے۔ جس کا کام صرف دوسرے قیدیوں کی نگرانی کا رہ جاتا ہے۔ کیا انسپکٹر جنرل صاحب کی صداقت شعاری صوبجات متحدہ کے تمام جیلوں میں سے ایسے چند قیدیوں کے نام بھی پیش کر سکتی ہے، جن سے بلا وجہ اور بلا قصور ساری میعاد چکی پسوائی گئی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو

کرنل صاحب کا بیان یقیناً غلط سمجھا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ روزانہ ایک من غلہ پیسنے کا ذکر کرکے گویا ایڈیٹر اردوئے معلیٰ نے دروغ بیانی سے کام لیا ہے حالانکہ اس میں کچھ بھی غلطی نہیں ہے۔ غلہ تو ایک ہی من پینے کو ملتا ہے البتہ ایک چکی پر دو آدمی پیستے ہیں۔ کیوں کہ وزنی چکیاں ایک آدمی سے چل بھی نہیں سکتیں۔ اس حساب سے بے شک بہ قاعدہ ارتھمیٹک فی کس ۲۰ سیر غلہ پڑتا ہے۔ لیکن ازروئے تجربہ کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا کیوں کہ جتنی دیر میں ایک شخص بیس سیر غلہ پیستا ہے اتنی دیر میں دو شخص مل کر ۴۰ سیر نہیں پیس سکتے۔ ایک چکی پر دو قیدیوں کے کام کرنے کی تفصیل ہمارے گزشتہ مضامین میں موجود ہے جن کے مطالعے کا گورنمنٹ کو اقرار ہے لیکن اس اقرار پر بھی ایک درمیانی فقرے کو لے کر ہم کو غلط بیانی کا ملزم قرار دینا اصول دیانت کے سراسر خلاف ہے۔ رہا گیہوں کے پندرہ سیر اور چنوں کے بیس سیر ملنے کا افسانہ اس میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے۔ الہ آباد سنٹرل جیل میں گیہوں اور چنوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا بلکہ قاعدے کے خلاف گیہوں بھی فی کس ۲۰ سیر کے حساب سے ایک ہی من پینے کو ملتے ہیں جن کا پیسنا قیدیوں کے لیے عذاب جان ہو جاتا ہے کیوں کہ چنوں کی نرمی کے مقابلہ میں گیہوں کی سختی پینے والوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ ایک من گیہوؤں میں صرف پاؤ بھر چوکر باقی رکھنے کا حکم ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ پہلی اور دوسری مرتبہ آٹا چھاننے سے جتنا چوکر نکلتا ہے اسے دوبارہ اور سہ بارہ پیسنا پڑتا ہے اور اس طرح پر بلا مبالغہ ایک من کی جگہ ڈیڑھ من کے قریب پیسنا پڑ جاتا ہے کیا انسپکٹر جنرل صاحب ان واقعات کی بھی تردید کرسکتے ہیں؟ ہمارا ارادہ ان جزوی معاملات کو اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا نہ تھا لیکن کرنل صاحب کے طرز بیان سے مجبور ہوکر ہمیں بھی "دروغ گو را تا بخانہ باید رسانید" کے مقولے پر عمل کرنا پڑا۔[19]

(۱۱)

زمانہ قید کے ابتدائی ایام کی سمتی ضرب المثل ہے کہ قیدیوں کے ان چند دنوں کی بے چینی سالہا سال کے کرب و اضطراب سے کبھی بڑھ جایا کرتی ہے ابتدا میں جیل کی تکلیفوں سے نیا سابقہ پڑتا ہے اس لیے نو گرفتاران مصیبت کو کچھ روز تک مشاہدات زنداں میں عذاب دوزخ کا نمونہ نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ بہ مصداق "برسر اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد" طبیعت ان سب ذلتوں کی خوگر ہو جاتی ہے اور مایوسی قیدیوں کے دل میں ایک ایسا سکون پیدا کر دیتی ہے جس کی مدد سے مطمئن ہو جاتے ہیں ورنہ اگر ابتدائی بے قراری کا عالم بدستور قائم رہے تو ان غریبوں کی زندگی دشوار ہو جائے۔ دو سال، پانچ سال، سات سال، بلکہ چودہ سال تک کی دراز میعادیں لوگ بہ آسانی کاٹ دیتے ہیں۔ لیکن آخر میں جب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری قید کا صرف ایک مہینہ باقی ہے۔ صرف پندرہ دن باقی ہیں، صرف تین دن باقی ہیں۔ صرف ایک ہی دن باقی ہے اس وقت کسی کا صبر و سکون برقرار نہیں رہتا۔ قواعد جیل کی رو سے قیدیوں کو ٹکٹوں پر رہائی کی تاریخ کچھ روز پہلے متعین کر کے درج کر دی جاتی ہے۔ جس کے لیے قیدی خاص کر سپرنٹنڈنٹ کے روبرو طلب کیا جاتا ہے اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ صاحب از راہ کرم کبھی کبھی قیدیوں کو دو چار دن کی رہائی اپنی طرف سے بھی مرحمت فرمایا کرتے ہیں۔ راقم حروف کو چونکہ شروع ہی سے کسی قسم کی رعایت نہ ملی تھی اس لیے اس موقع پر بھی دوسرے معمولی قیدیوں کی طرح سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لطف و کرم کی بدولت تاریخ مقررہ سے قبل رہا ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خلاف معمول مجھے طلب کیے بغیر حساب کر کے ۳ر جولائی ۱۹۰۹ء تاریخ رہائی کی مقرر کر دی جس سے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہو گئی۔

راقم حروف کو بزرگان دین کی عقیدت کے ساتھ جو فطری انس ہے اس

کی بدولت زندانِ زنگ میں جیسی کچھ قلبی قوت اور روحانی آزادی اور اطمینان میسر رہا اور ضمناً جو باطنی فیوض حاصل ہوئے الفاظ کے ذریعہ سے ان کی حقیقت صحیح طور پر نہ بیان ہوسکتی ہے نہ ان کے ذکر کا یہ محل ہے اس لیے ان سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ البتہ آخر زمانہ قید کا ایک واقعہ ایسا ہے جس کے اظہار میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ردولی کا عرس شریف ماہ جمادی الثانی کی درمیانی تاریخوں میں ہوتا ہے۔ سنہ میں یہ تاریخیں ماہ جولائی کی ابتدائی تاریخوں سے مطابق واقع ہوئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے ایک روز سوتے وقت حساب کیا تو معلوم ہوا کہ میری رہائی کا دن ٹھیک اسی تاریخ کو مقرر ہوا ہے جو عرس شریف کا آخری روز ہوگا۔ مجھ کو چونکہ حاضری عرس حضرت شیخ العالم سے سعادت اندوز اور فیض پذیر ہونے کا اکثر اتفاق ہو چکا تھا۔ اس لیے بے اختیار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر رہائی کی تاریخ دو ایک روز قبل بھی مقرر ہوتی تو شرکتِ عرس کا موقع مل سکتا تھا لیکن تاریخ رہائی کی ٹکٹ پر درج ہو جانے کے بعد دوبارہ تبدیل ہوسکنے کا اس وقت میرے دل میں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ پھر بھی صبح اٹھنے پر سب سے پہلی بات جو مجھ کو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے غیر معمولی طور پر دفتر کے بجائے نئی تکلیف میں طلب کیا ہے۔ نئی تکلیف میں پہنچ کر منشی صاحب سے معلوم ہوا۔ صاحب بہادر میرے استقلال اور نیک چلنی سے بہت خوش ہیں اور اس لیے اپنے اختیار سے غالباً وقت مقررہ سے کچھ قبل ہی مجھے رہا کر دیں گے۔ اس مژدہ جاں فزا کے سننے سے مجھ کو بھی بہت مسرت ہوئی اور یقین ہو گیا کہ شب گذشتہ کی آرزو اب ضرور پوری ہوگی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی حکم دیا کہ ہم ان کو پندرہ دن کی رہائی اپنی جانب سے دیتے ہیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور میں تاریخ مقررہ سے پندرہ روز قبل رہا ہو کر شام تک الٰہ آباد میں ٹھہر کر مکان روانہ ہوا اور وہاں دس دن قیام کرنے

کے بعد بہ اطمینان تمام رودولی روانہ ہوا۔ ممکن ہے کہ اس واقعے کو لوگ حسن اتفاق پر محمول کریں۔ لیکن راقم کے نزدیک یہ سب کچھ شیخ العالم حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی رحمتہ اللہ علیہ کے باطنی تصرف اور توجہ کا نتیجہ تھا۔

الہ آباد سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ہڈسن عجیب و غریب مزاج کے شخص تھے جن کو کل قیدی ہڈسن بابا کے نام سے یاد کرتے تھے "گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بدشنامے خلعت دہند"، کے افسانے آپ کے "دربار پیشی"، کے متعلق کثر قیدیوں کی زبانی سننے میں آتے تھے۔ سخت گیری و تندخوئی ان کی ضرب المثل تھی، جس سے قیدی تو قیدی جیل کے تمام آزاد ملازم بھی ہر وقت ترساں رہتے تھے۔ لیکن ایک خاص وصف ان میں ایسا تھا جس نے ان کے جملہ عیوب کو چھپا دیا تھا وہ یہ کہ قیدیوں کو "نشانات رہائی"، عطا کرنے میں جیسی فیاضی ان سے ظاہر ہوتی تھی غالباً کسی دوسرے سپرنٹنڈنٹ سے نہ ہوتی ہوگی جن کی بدولت اکثر سات سال کے قیدی پانچ ہی پانچ سال بلکہ کچھ اس سے بھی کم میعاد کاٹ کر رہا ہو گئے۔ الہ آباد جیل کی خرابیوں اور اپنی نسبت حکام جیل کی سختیوں کے باوجود مسٹر ہڈسن کی بعض انتظامی خوبیوں کی تعریف نہ کرنا بعید از انصاف ہوگا۔ مثلاً صفائی اور ظاہری جسمانی صحت کا لحاظ جیسا الہ آباد سنٹرل جیل میں ہوتا ہے ویسا کسی دوسری جگہ نہیں ہوتا، جس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ جیل میں قیدیوں کے کپڑے موسم سرما میں بھی "جوں"، سے پاک رہتے ہیں۔ در آں حالے کہ عام طور پر "زنداں"، اور "جوں"، لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ ملازمان جیل کی زدوکوب اور سختی جو زیادہ تر قیدیوں سے حصولِ زر کی غرض سے ہوتی ہے اس کی بھی شکایتیں الہ آباد جیل میں مسٹر ہڈسن کے خوف سے بہت کم سننے میں آتیں اور میعادِ قید میں تخفیف کر دینے کا حال ہم نے پہلے ہی درج کر دیا ہے۔

قید کی تکلیفوں میں سب سے بڑی تکلیف اس روحانی بے چینی کو سمجھنا چاہیے جو ارتکابِ جرائم کے لازمی نتیجے کی صورت میں یقیناً ہر "یک بارہ"، قیدی

کے عارض حال ہوتی ہے۔ میں چوں کہ بہ عنایت ایزدی اس تکلیف سے آزاد تھا۔ اس لیے ظاہری سختیوں کے برداشت کرنے میں مجھ کو کچھ زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی اور رہا ہونے پر ایسا معلوم ہوا کہ گویا ایک سال تک مجھے کسی غیر ملک کا سفر درپیش تھا جہاں سے اب میں اپنے وطن کو واپس آرہا ہوں۔ وطن پہنچ کر جہاں اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی خواہش تھی وہیں اپنے جدید دوستوں سے جدا ہونے کا کسی قدر افسوس بھی ضرور تھا کہ ان میں سے چند کے سوا باقی سب سے پھر کبھی ملاقات ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ میرا یہ افسوس تو خبر رہائی کی خوشی سے مغلوب ہو گیا تھا۔ لیکن ان گرفتارانِ بلا کو میری جدائی نہایت شاق تھی، جن میں سے بعض کی آنکھیں تو مجھ سے جدا ہوتے وقت بے اختیار اشک افشانی میں مصروف تھیں۔ اللہ تعالےٰ ان سب کو جلد اس مصیبت سے نجات دے۔

جیل میں مختلف مقامات سے آتے ہوئے قیدیوں کے اختلافِ عادات و اخلاق، زبان و لہجہ کی دلچسپ کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر ان میں سے ہر شخص اپنے عجیب و غریب واقعات زندگی کی ایک مختصر سی تاریخ بھی رکھتا ہے جو اکثر اوقات مصنوعی کہانیوں سے بھی زیادہ دل پسند ہوا کرتی ہے۔ راقم حروف بارک بند ہونے کے بعد سے سونے کے وقت تک اپنا وقت اکثر انھیں افسانوں کے سننے میں بسر کرتا تھا۔

مرحوم عبداللہ غازی آبادا اپنے "گھی کے روزگار" کی ایسی ایسی حیرت انگیز حکایتیں بیان کرتے تھے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ ان کے پاس ایک دیگچی اور اس کے ساتھ کوئی شے اس قسم کی تھی جس کے اثر سے وہ خریدتے وقت ۵ سیر کی بجائے بہ آسانی ۶½ سیر تک گھی بغیر کسی قسم کے ظاہری فریب کے لے سکتے تھے یعنی اس میں ہاتھ کی صفائی کو مطلق دخل نہ تھا کیوں کہ خود تولتے بھی نہ تھے بلکہ بیچنے والوں ہی سے تلواتے تھے، پھر جب خود فروخت کرتے تھے

۶ سیر کی جگہ ۵ ہی سیر اسی ترکیب سے دے دیتے تھے۔ ذاکر برقنداز نے ان سے بہ قسم اقرار لیا تھا کہ رہا ہونے پر "گھی کا روزگار" ہمیں بھی سکھا دینا۔ مگر افسوس کہ ذخمدار رہائی سے صرف ایک ماہ قبل انھوں نے درخت پر سے گر کر انتقال کیا۔ انھوں نے میرے ساتھ جس انسانیت اور محبت کا برتاؤ کیا، اس کی کیفیت درج رسالہ ہو چکی ہے۔ رہا ہونے پر میں نے سب سے پہلے ان کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا چاہا، مگر افسوس کہ قبر کا صحیح نشان نہ مل سکا۔ اب بھی ہر سال شبرات کے موقع پر اپنے دیگر مرحوم اعزا و احباب کے ساتھ عبداللہ مرحوم کا فاتحہ بھی میں نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

زید پور ضلع ہمیر پور کے منشی نند لال سابق برانچ پوسٹ ماسٹر فنِ زراعت سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ وہ اکثر محکمہ ڈاک کی خفیہ کارروائیوں اور فنِ زراعت کے اصول پر طویل لکچر دیا کرتے تھے۔ اردو معمولی، ہندی خوب جانتے تھے۔ راقم حروف نے ہندی لکھنے پڑھنے کی مشق انھیں سے کی۔

ملوک پور ضلع بارہ بنکی کے گرجن کورمی پاٹن دین کے مشہور گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی بہادری کے قصے اکثر سنایا کرتے تھے۔ غریب بے کسوں اور بیواؤں کے ساتھ پاٹن دین کے سلوک کی حکایتیں بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوا کرتی تھیں۔ پاٹن دین جس کسی سے ایک بار مدد کا وعدہ کر لیا کرتے پھر اس سے کسی حالت میں روگردانی نہ کرتے تھے۔ چودھری مہدی حسن صاحب رئیس ضلع بارہ بنکی کا بھی ہم نے اکثر لوگوں کو حد سے زیادہ مداح پایا۔ چودھری صاحب کے مقدمے کے دلچسپ حالات نندا پاسی اور عبدالکریم ملازم جناب ممدوح کی زبانی سننے میں آیا کرتے تھے، جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی جانب سے ان پر ضرورت سے زیادہ سختی کی گئی۔ واللہ اعلم

ضلع پیلی بھیت کے منشی ہدایت اللہ کبوتر بازی کے فن میں کامل تھے کبوتروں کے تمام اقسام اور پھر ان سب کی خصوصیات اور حالات کے بیان

ے وہ کبھی نہ تھکتے تھے۔ میری غزلوں کو وہ بڑے شوق سے لکھ کر یاد کر لیتے تھے۔

ضلع الہ آباد کے پنڈت جگت دھاری چترال کی مہم میں شریک ہو چکے تھے ےس کے تمام مفصل حالات سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ اقوام سرحد کے افعال وعادات اور معرکہ چترال کے واقعات کا ذکر وہ نہایت جوش کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

ضلع جھانسی کا سنواں کہار مہم تبت میں شریک رہا تھا اور اپنے فوج میں بھرتی ہونے وقت سے لے کر مہم تبت کے بعد گھر واپس آنے تک کے کل حالات تھوڑے تھوڑے روز سنایا کرتا تھا۔ مہم تبت کے دوران میں سرکاری رپورٹوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انگریزوں کا نقصان بہت قلیل ہوا۔ لیکن سنواں کے قول کے مطابق تبتیوں کی بنا کردہ برف پوش خندقوں میں ، گوروں کی صفیں کی صفیں گر کر ایسی غائب ہو جاتی تھیں کہ پھر ان کا پتہ نہ لگتا تھا۔ اہل تبت کے رسم ورواج اور وہاں کی عورتوں کے دلچسپ حالات کو سنواں خاص لطف کے ساتھ بیان کیا کرتا تھا۔

امروہہ کے منشی ایزد بخش صاحب کا حال ہم لکھ چکے ہیں۔ جکّی خانے کی برقندازی سے پہلے یہ درزی خانے میں تھے جہاں کے سارے پوست کندہ حالات ان کی زبانی اکثر سننے میں آتے تھے۔

منشی نول بہاری سے غلّہ گودام کا کچھا چٹھا معلوم ہوا کرتا تھا جس کے ظاہر کرنے کی ہمت ہم میں نہیں ہے۔

کیڈ گنج الہ آباد کے گنیش اہیر روزانہ صبح کو بھجن وغیرہ گایا کرتے تھے راقم حروف کو ان کے اکثر بھجن اور ہندی گیت بہ غایت مرغوب تھے خصوصاً وہ جو سری کرشن کی تعریف میں ہوتے تھے مثلاً

دیکھو ری مائی تیرے دوار اک بالا جوگی آیا
لے بھکچھا نکلیں نند رانی موتین تھال بھر لایا
نا چاہوں میں دولت دنیا، نا چاہوں میں مایا

رنگ بھبھوت گلے مرگ چھالا سیس ناگ لپٹایا
بھکچھا لے کے لوٹ جا بابا میرا بالک دیکھ ڈرایا
اپنے گوپال کا درس دکھا دے درس ہیت میں آیا

ے موہن زکلیں نندرانی آنچل اوٹ چھپایا   پانچ پیر پیکر ماں کر کے سنگھی تا تھہ بجایا
جیہہ درشن سر، نرہن تیرسیں
جو آد.ا گو دکھلایا[۲۱]

(۱۲)

ضلع جون پور کے منشی محمد رضا سات سال کے لیے قید تھے۔ ان کی مذہبی عقیدت اور خلوص کو دیکھ کر راقم حروف کو اکثر رشک ہوا کرتا تھا۔ اس مجبوری کی حالت میں بھی ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ کو کسی نہ کسی طرح سے شیرینی منگا کر وہ حضرت غوث پاک کی نیاز ضرور دلاتے تھے۔ جیل میں باہر سے کسی چیز کو اندر لے جانے کی سخت ممانعت ہے۔ یہاں تک کہ معلوم ہو جانے پر قانون کے خلاف عمل کرنے والے کو چھ ماہ تک کی سزا ہو سکتی ہے۔ لیکن ان سب موانعات کے باوجود منشی محمد رضا نے کبھی اپنے معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ وظیفہ وظائف کا بھی ان کو بہت شوق تھا۔ اکثر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد چکی خانے میں میرے پاس آتے تھے اور ذوق و شوق کی گفتگو کے بعد نمک، ہری مرچیں، گڑ، یا شیرینی بہ طور تحفہ ضرور پیش کرتے تھے۔ نعت و منقبت کے اشعار سے انھیں نہایت محبت تھی۔ اکثر غزلیں مجھ سے سن کر زبانی یاد کر لی تھیں۔ جن کو رات کے وقت بعد نمازِ تہجد پڑھا کرتے تھے۔ حسنِ اتفاق کہ میرے رہا ہونے سے دس ہی پندرہ دن قبل ہماری بارک کا ایک برقنداز کم ہو گیا، جس کی جگہ منشی محمد رضا صاحب آئے۔ اس تبدیلی پر ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔ صبح صادق کے وقت وہ مجھے بیدار کر دیا کرتے تھے اور نمازِ فجر ہم دونوں مل کر بہ کمال شادمانی ادا کیا کرتے تھے جب کبھی وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے تو طبیعت بے چین ہو جاتی ہے کہ نمازِ صبح میں سُرورِ قلب کی وہ کیفیت کیوں کر حاصل ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے جناب رسالت مآب کی شان میں کوئی شعر پڑھا ہو اور ان کی آنکھیں

پڑ نم نہ ہوگئی ہوں :۔

وصلی اللہ علیٰ نورے کزو شد نور ہا پیدا
زمیں از حُبِ او ساکن فلک در عشق او شیدا

کالپی کے منشی عبد الحمید افسانہ گوئی کے فن میں کامل تھے چار پانچ مہینے تک ان کا ساتھ رہا روز کوئی نہ کوئی نیا قصہ وہ ضرور کہتے تھے۔ اس پر بھی ان کی کہانیوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ شاہ جہاں پور کے چپّا استاد تکلی ہانکنے کا کام جانتے تھے۔ جیل کے کاموں میں "مونج فرش" ان سے بہتر کوئی نہ بنا سکتا تھا۔ اکثر ان کو گڑ انعام ملا کرتا تھا۔ اس میں سے بہ کمالِ فراخ حوصلگی استاد میرا حصہ علاحدہ نکال رکھتے تھے اور کام سے واپس آکر نذر کیا کرتے تھے۔

سوامی شوانند بھی اسی "مونج فرش" کے کارخانے میں بان بٹا کرتے تھے اس لیے جو کچھ پیام سلام ہوا کرتا تھا وہ استاد ہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔

ضلع فیض آباد کے بابا سرجو داس ہندی کے عالم اور سنسکرت سے بھی واقف اپنے کسی چیلے کے فریب کی وجہ سے چار سال کے لیے قید تھے انھوں نے کبھی جیل میں اپنے فقیری معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ روزانہ بھجن اور سادھن وغیرہ کے علاوہ شام کو گنیش وغیرہ چند لوگوں کو رامائن کا سبق دیا کرتے تھے میں بھی اکثر ان کے درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ صفائی کا بابا صاحب کو بہت خیال تھا۔ چناں چہ روزانہ ان کے چیلے ان کے ڈھولے کے اردگرد دور تک لیپ پوت کر کے صاف کر رکھتے تھے۔ ان کے واسطے روزانہ خوراکیں بھی مقرر تھیں۔ راقم حروف کے حال پر بابا جی بہت مہربان تھے۔ یہاں تک کہ خاص اپنے چبوترے کے برابر والے چبوترے پر مجھے رہنے کی اجازت دی اور میرے مسلمان ہونے کا مطلق خیال نہ کیا تھا۔ صبح صادق سے بہت قبل اٹھ کر وہ بھی اپنے وظیفے میں مصروف ہوجاتے تھے۔

جھانسی کی طرف کے پنڈت سیتارام ماسٹر تانک کے معتقد تھے اور اس لیے

میرے بھی بڑے مداح تھے۔ ان کا کام انگریزی دفتر میں تھا جہاں سے مجھ کو اکثر پولیٹیکل خبریں انھیں کے ذریعہ سے ملا کرتی تھیں۔ مثلاً بنگال سے نو محبانِ وطن کی جلا وطنی کا مجمل حال اوّل اوّل انھیں سے معلوم ہوا۔

ضلع الہ آباد کے بہاری برقنداز کو انگریزی پڑھنے کا شوق تھا۔ روز شام کو وہ مجھ سے سبق لیا کرتے تھے۔ لہار خانے میں ان کی مشقت تھی جہاں سے روز تھوڑی سی پیاز اور نمک مرچ میرے لیے لانا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔

کوڑہ جہان آباد کے ایک اور قیدی بہاری نام نے بھی اکثر نازک موقعوں پر میری بہت مدد کی۔ مثلاً جس روز نائب جیلر نے منشی عبدالحق صاحب برقنداز چکی خانے کے ساتھ سارے چکی خانے کی بھی تلاشی لی ہے اس وقت ان کا سارا شبہ میری جانب تھا کہ یہی کچھ نہ کچھ لکھا کرتا ہے۔ اتفاق سے ایک غزل کا مسودہ میری ٹوپی میں تھا اور میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ بہاری نے مجھ سے فوراً پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی کاغذ تو نہیں ہے اگر ہو تو مجھ کو دے دیجیے کہیں اسے چھپا لوں گا اور اگر میرے پاس نکل بھی آئے گا تو میں آپ کے عوض سزا برداشت کرنے پر بخوشی راضی ہوں۔ غرض کہ وہ پرزہ اس نے لے کر معلوم نہیں کہاں غائب کیا کہ برہنہ تلاشی لیے جانے پر بھی کہیں دستیاب نہ ہوا۔ لیکن نائب جیلر کے جانے کے بعد پھر کہیں سے نکال کر مجھ کو واپس کر دیا۔

ضلع بجنور کے منشی شام سنگھ آریہ سماج کے ایک پرجوش ممبر تھے۔ مزاج ان کا نہایت گرم تھا۔ چنانچہ اسی گرم مزاج کی بدولت علی گڑھ ڈیری فارم سے ان پر مقدمہ چلا تھا۔ مجھ سے علی گڑھی ہونے کی بنا پر وہ پرانی تکلیف میں خاص کر ملنے آتے اور پھر اپنی رہائی کے وقت تک ہر قسم کی مدد کرتے رہے منشی رام سروپ اور سوامی شوانند کے ساتھ بھی انھوں نے ایسا ہی کچھ سلوک کیا۔

جیلر برقنداز قوم کا پاسی الہ آباد کا باشندہ تھا اور ذاکر کے جانے کے بعد آخر تک ہماری بارک کا برقنداز رہا۔ جیسا شریفانہ سلوک جیلر نے میرے ساتھ کیا اس پر نظر کر کے میں اکثر خیال کرتا تھا کہ طینت کی نیکی اور بدی کو ذات پات کے قیود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تعلیم کا شوق بھی جیسا میں نے جیلر میں دیکھا ویسا کسی دوسرے شخص میں نہیں دیکھا۔ باوجود بجز مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی کی ریڈروں کو پڑھ پڑھ کر اس نے اردو میں اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اکثر آموختہ مجھ کو سنایا کرتا تھا اور فارسی عربی الفاظ کے معنیٰ دریافت کیا کرتا تھا۔

غرض کہ ایک سال کے عرصے میں ہزاروں ایسے واقعات پیش آئے اور ایسے سیکڑوں لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کا مختصر حال لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوتا لیکن سلسلۂ کلام کی غیر معمولی طوالت پر نظر کر کے ہم اس داستان کو یہیں پر ختم کیے دیتے ہیں۔ البتہ ماہ آئندہ میں ہمارے نزدیک انتظام جیل میں جو جو اصلاحیں ہو سکتی ہیں، ان کو ہم مختصر طور پر درج کر دیں گے، ان کی طرف توجہ کرنا یا نہ کرنا دوسروں کا کام ہے۔[۲۲]

(۱۳)

مجرموں کو قید کرنے سے قانون کا صرف یہی منشاء نہیں ہوتا کہ ان کو جسمانی یا روحانی اذیت دی جائے بلکہ ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ آئندہ کے لیے ان کے اخلاق و عادات میں نمایاں درستی ظہور پذیر ہو اور دوران قید میں وہ کوئی نہ کوئی ہنر یا پیشہ سیکھ کر سوسائٹی کے ایک کارآمد ممبر بن جائیں۔

اگر حکام زنداں اس اصول کو پیش نظر رکھا کریں تو جیل خانوں کی بہت سی خرابیاں خود بخود رفع ہو جائیں مگر افسوس کہ ہندستان میں قید خانوں کی موجودہ حالت ان جبری کارخانوں سے ذرہ برابر بھی بہتر نہیں

جبی کے منتظمین نے اپنا صرف ایک اصول مقرر کر لیا ہو کہ اپنے پابند و مجبور مزدوروں (قیدیوں) سے زیادہ سے زیادہ کام لیں، لیکن ان پر کم سے کم خرچ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جی لگا کر بہت کم قیدی کام کرتے ہیں خوراک و پوشاک کے باب میں اگر موجودہ قواعد جیل کی پوری پابندی کی جائے تو بھی قیدیوں کو بہت کچھ آرام مل سکتا ہے مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ سزا دہی اور سختی کے جتنے قواعد ہیں ان کی تو ایک ایک حرف کی پابندی اکثر اوقات ضرورت سے زیادہ کی جاتی ہے لیکن جو قاعدے ان کے مفید مطلب ہیں ان کا کسی کو خیال تک نہیں آتا مثلاً

(۱) قیدیوں کو فی کس ۹ چھٹانک روٹی ملنا چاہیے، لیکن عام طور پر ۷ یا ۸ چھٹانک سے زیادہ کبھی نہیں ملتی اور وہ بھی زیادتی وزن کے خیال سے اکثر کچی رکھی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نادار لوگ چکی پیسنے وقت کچا غلہ یا آٹا کھا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور جن کے پاس خفیہ طور پر روپیہ پیسہ پہنچ سکتا ہے وہ باورچیوں سے زائد خوراک مقرر کرا لیتے ہیں یا کچا آٹا مول لیتے ہیں۔ جتنا آٹا اس طرح فروخت کیا جاتا ہے یا چکی خانے میں کھا یا جاتا ہے اس کے بجائے مٹی ملادی جاتی ہے۔ اب فی کس ایک یا ڈیڑھ چھٹانک کے حساب سے جو آٹا بچتا ہے وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے روٹیوں کے ساتھ فی کس آدھ پاؤ دال دیے جانے کا حکم ہے جس میں نمک مرچ اور گھی یا تیل بھی کافی مقدار میں پڑنا چاہیے لیکن دال کبھی ایک چھٹانک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور نمک مرچ یا روغن کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ جس قیدی کے حصے میں اتفاقاً کبھی کوئی مرچ آجاتی ہے وہ اپنے کو بڑا خوش قسمت خیال کرتا ہے۔ اور نہ یہ سب چیزیں دفعداروں کا حق سمجھی جاتی ہیں۔ اگر جیلر یا وارڈر ذرا سی تکلیف نگرانی کی اپنے اوپر گوارا کریں تو یہ سب شکایتیں رفع ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ان سب

باتوں سے وہ لوگ دیدہ و دانستہ چشم پوشی نہ کرتے ہوں۔

شام کے وقت دال کے بجائے چولائی کا جو ساگ ترکاری کے نام سے قیدیوں کو دیا جاتا ہے اس میں اور گھانس میں ہم کو کبھی کوئی فرق نظر نہ آیا۔ کم از کم اس کو تو ضرور موقوف کرنا اور اس کے بجائے دال جاری کرنا چاہیے۔

(۲) پوشاک کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ہر ششماہی میں ایک جوڑ کپڑا نیا ہر قیدی کو دیا جائے لیکن الہ آباد ڈسٹرکٹ جیل میں اس قاعدے کی مطلق پابندی نہیں کی جاتی اور عام طور پر قیدی چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں۔ البتہ اہل مقدرت ناجائز طور پر نئے کپڑے خرید کر کے پہنتے ہیں۔ کپڑوں میں سے کرتے اور ٹوپی میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ جانگیہ کی لمبائی البتہ کم ہوتی ہے جس کو پہن کر نماز کے لیے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی۔ کم از کم نمازی قیدیوں کو اگر پہرے والوں کے مانند جانگیا ملا کرے تو یہ شکایت بہ آسانی رفع ہو سکتی ہے۔

(۳) باہم لڑائی جھگڑے پر ہر جیل میں سخت سزائیں دی جاتی ہیں لیکن گالی گلوج کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ فحش الفاظ اور گالیاں جیل خانوں میں اس قدر رائج ہیں کہ آزاد لوگوں کی بدترین سوسائٹی میں بھی غالباً اس کی مثال نہ ملے گی۔ عیسائی قیدیوں کی طرح اگر ہندو، مسلمان، قیدیوں کی مذہبی تعلیم کا کم از کم ہفتے میں ایک بار بھی انتظام ہو سکے تو اس قسم کے بہت سے اخلاقی عیوب ضرور کم ہو جائیں۔

پھر مخبری کرنے یا چغلی کھانے پر قیدیوں کو سزا کی جگہ اکثر جو فائدہ پہنچایا جاتا ہے اسے تو یک قلم موقوف ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے ان کے اخلاق پر حد درجہ ناگوار اثر پڑتا ہے۔ خلاف قاعدہ اور اکثر بے قصور مار پیٹ سے بھی قیدیوں میں غیر معمولی بے حیائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا سد باب بھی ممکن ہے بشرطیکہ حکام جیل قیدیوں کی درستی اخلاق کو ذرہ برابر بھی اہم خیال کریں۔

(۴) بہت سے قیدیوں کو ہم نے نوشت و خواند کا اس قدر شوقین دیکھا کہ اگر ان کو کافی موقع ملتا تو رہا ہونے پر وہ اچھے خاصے لکھے پڑھے بن کر نکلتے۔ لیکن معلوم نہیں کس سبب سے کتاب تو در کنار کاغذ کا ایک پرزہ تک رکھنا جائز نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارے نزدیک اگر ہفتے میں ایک روز تعطیل کے دن یعنی اتوار کو کم سے کم مذہبی کتابیں پڑھنے پڑھانے کی اجازت مل جایا کرے تو بہت خوب ہو۔ اس کا انتظام بھی کچھ دشوار نہیں ہے۔ ہر بارک میں جو تین یا چار قیدی برقنداز مقرر کیے جاتے ہیں، ان میں سے دو ایک خواندہ ضرور ہوتے ہیں۔ لیس بہ روز تعطیل شوقین قیدیوں کی تعلیم کا اہتمام انھیں کے سپرد کر دینا چاہیے۔

(۵) بعض بعض کارخانوں میں قیدیوں سے ان کی طاقت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے مثلاً الٰہ آباد ڈسٹرکٹ جیل کے رنیڈی خانے میں قیدی طلوع آفتاب کے وقت سے لے کر اکثر اوقات غروب کے وقت تک محنت کرتے کرتے پست ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک تو لہار خانہ، بڑھئی خانہ، رنیڈی خانہ، نیز پارچہ بافی اور مونج فرش وغیرہ کے کارخانوں میں صرف چند پیسوں کی خوراک کے عوض روپیوں کا کام کرنے والے قیدیوں کے نام اگر کچھ قلیل اجرت بھی جمع ہوا کرے جو ان کو رہائی کے وقت بہ طور سرمایہ مل جایا کرے تو مجرموں کا دوبارہ وسہ بارہ قید خانے جانا یقیناً کم ہو جائے۔

(۶) پولٹیکل قیدیوں پر عام قیدیوں سے بھی زیادہ سختی کی جاتی ہے اور وہ جیل خانہ کی تمام جائز رعایتوں سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ ایسا ہونا کسی طرح قرینِ انصاف نہیں ہے اور کچھ نہیں ہو سکتا تو اس غیر معمولی سختی کے معاوضہ میں کم از کم اتنی رعایت ضرور ملنا چاہیے کہ اوقات فرصت میں انھیں کتب بینی کی اجازت ہو اور ان میں سے جس کو تصنیف و تالیف کا شوق ہو اسے اتوار کے روز ایک خاص بارک میں کسی یورپین وارڈر کی نگرانی میں قلم دوات و کاغذ کے استعمال کا بھی موقع دیا جائے۔

من آنچہ شرط بلاغ ست با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال ۲۴

فرنگی جیل خانوں میں گورے اور کالے کی تمیز

دنیا کے معمولی کاروبار میں عموماً اور ریلوے سفر میں خصوصاً اہل ہند کو اکثر اس امر کا ناگوار تجربہ ہوا ہوگا کہ صرف رنگ کے فرق نے ان کے اور یورپین یا یوریشین اصحاب کے درمیان ایک ایسا عجیب وغریب امتیاز قائم کر دیا جس کی بنا تعصب یا غرور کے سوا اور کسی جذبہ پر ہو ہی نہیں سکتی۔ افسوس ہے کہ رنگ کے اس بے جا امتیاز کا دائرہ اس قدر وسیع ہوگیا ہے کہ عدالت ایوان اور جیل کی کوٹھریاں بھی اس کے حدود کے اندر آگئی ہیں۔ عدالتوں میں فرنگیوں کے اوعائے انصاف کے خلاف گوروں کے ساتھ جو جو رعایتیں ملحوظ اور کالوں پر جو جو سختیاں جائز اور قانوناً جائز رکھی جاتی ہیں ان کی تفصیل ایک جداگانہ دفتر کی محتاج ہے۔ اس موقع پر ہم ان کے بیان سے قطع نظر کرکے صرف جیل کے حالات پر اس لیے اور بھی اکتفا کرتے ہیں کہ جیل کی کیفیت سے عام طور پر لوگ بالکل ناآشنا ہیں۔

خوراک

کالوں کے لیے صبح کو آدھ پاؤ چنے بطور ناشتہ دیے جانے کا حکم ہے۔ لیکن عموماً قیدیوں کو چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے ناشتہ کے بعد کام پر جانا ہوتا ہے؛ جہاں سے ۱۱ بجے کھانا کھانے کے لیے کچھ دیر کی فرصت ملتی ہے۔ کھانے میں جوار، باجرہ، ماش اور گیہوں کے مخلوط آٹے کی کچی روٹیاں ہوتی ہیں جس میں گیہوں کی مقدار

سے کچھ ہی کم مٹی یا آٹا ملا ہوتا ہے۔ جیل کی سخت مشقت سے مٹی تو کیا ہے کنکر پتھر بھی ہضم ہو جائیں ورنہ کسی آزاد شخص کا معدہ اس روٹی کو قبول نہیں کرسکتا۔ ان روٹیوں کو کچا رکھنے کی مصلحت یہ ہے کہ اوّل تو پکانے کے لیے پتھر کے کوئلے اس قدر کم ملتے ہیں کہ نئے دفعیوں (قیدی باورچی) کو کچی روٹی پکانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ کچھ روٹی کے بھاری ہونے کے سبب سے مقررہ وزن کی روٹیاں کم آٹے میں تیار ہو جاتی ہیں، بچا ہوا آٹا دوسرے لوگوں کے کام آتا ہے۔ پکی ہوئی روٹی نو چھٹانک ملنے کا حکم ہے لیکن عموماً آٹھ چھٹانک بلکہ کبھی کبھی سات چھٹانک سے بھی کم ملتی ہے اور کسی کو چوں و چرا کی ہمت نہیں ہوتی۔ راقم حروف نے ایک بار وارڈر وغیرہ ملازمانِ جیل کی خفگی سے بے پروا ہوکر بطور تجربہ روٹیاں تلوائیں تو وہ چھ چھٹانک سے کچھ ہی زیادہ نکلیں۔ معلوم نہیں آٹا جو اس طرح بچتا ہے وہ کہاں جاتا ہے اور وہ کس کے صرف میں آتا ہے۔ کیونکہ گودام میں روزانہ مقررہ وزن کے آٹے کا خرچ دکھلایا جاتا ہے۔ روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے دوپہر کو ابلی ہوئی بے دَلی ارہر عموماً بے روغن و مرچ ملتی ہے اور شام کو چولائی کا ساگ جس کی ادنی صفت یہ ہے کہ پھینک دیے جانے پر کتے بھی اسے نہیں سونگھتے۔ ترکاری جو مختلف قسم کی جیل میں بوئی جاتی ہے روزانہ ڈالیوں میں ملازمانِ جیل کے لیے بھیج دی جاتی ہے یا کبھی کبھی کچھ ملتی بھی ہے تو وہ پکانے والوں کے صرف میں آتی ہے عام قیدیوں کو کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھنے کو ملتی۔

برخلاف اس کے گوروں کو ناشتے کے لیے ڈبل روٹی چاء، شکر، اور کھانے کے لیے گھی، گوشت، ترکاری، چاول، دودھ غرض کہ سب کچھ ملتا ہے

اور کافی مقدار میں ملتا ہے۔

پوشاک

کالے قیدیوں کو ایک لنگوٹ، ایک جانگیا، ایک کرتا، ایک ٹاٹ، ایک کمبل، ایک ٹوپی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ جن میں سے ٹاٹ کمبل سہا لہا سال کے لیے اور جانگیا کرتا قاعدے کی رو سے چھ مہینے کے لیے۔ لیکن از روئے عمل سال بھر بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دنوں کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس درمیان میں یہ چیزیں پھٹ جائیں یا خراب ہو جائیں تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیدی بہ غرض احتیاط صرف صبح و شام کو انھیں استعمال کرتے ہیں باقی سارا دن کام صرف لنگوٹ باندھ کر کیا کرتے ہیں اگر کسی کے پاس ان کپڑوں سے زیادہ کوئی چیز پائی جائے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے گوروں کو بوٹ کے کئی جوڑے مع موزوں کے ملتے ہیں۔ پہننے کے لیے متعدد سوٹ جن کے دھونے کے لیے علاحدہ ہندستانی قیدی دھوبی کا کام کرتے ہیں۔ لیٹنے کے لیے مسہری اس پر گدا اور چادر۔ غرض کہ آرام کی تمام چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔

جائے قیام و دیگر ضروریات

کالوں کے رہنے کے لیے بارکیں ہیں جن میں برابر برابر مٹی کے دھولے یا اوٹے (چبوترے) بنے ہوتے ہیں۔ جاڑا گرمی برسات غرض کہ ہر موسم میں انھیں یہ سونا چاہیے سخت گرمی کے دنوں میں کاغذ وغیرہ کا مصنوعی پنکھا بھی رکھنا ممنوع ہے۔ رات کو پاخانے کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہوتا۔

جس سے بعض اوقات سخت تکلیف ہوتی ہے۔ صبح کو جب بارک کا دروازہ کھلتا ہے تو سب قیدی ایک ساتھ پائخانے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھے قیدیوں کو آخر تک منتظر رہنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی جب گھنٹی سے کام لیا جاتا ہے تو اور بھی زیادہ دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ گھنٹی دو یا تین منٹ سے زیادہ پائخانے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی جس کے بعد بلا توقف باہر نکل آنا چاہیے۔ عام اس سے کہ کل قیدی فارغ ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں۔ پاخانے کے بعد ہاتھ منہ دھونے کا کوئی وقت نہیں ملتا بلکہ اکثر وہاں سے سیدھے کام پر بھاگنا پڑتا ہے۔

برخلاف اس کے گوروں کے لیے فی کس ایک کمرہ علاحدہ ملتا ہے جس میں ایک آہنی پلنگ گدے دار ایک میز ایک اسٹول، ایک لیمپ اور ہر کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ اور ایک پاخانہ موجود ہوتا ہے۔ غسل خانے میں تولیہ، صابن ہر شے موجود رہتی ہے۔ رات کو لیمپ کی روشنی میں اور دن کو فرصت کے اوقات میں گورے قیدی، کتابیں اور کبھی کبھی اخبار بلا تکلف دیکھتے ہیں۔ ان کے لکھنے کو دوات قلم ہر وقت موجود رہتا ہے حالاں کہ کالوں کے لیے کتاب دیکھنا تو درکنار اگر ان کے پاس کاغذ کے ایک پرزے کا بھی شبہ ہو تو قیامت آجائے۔ چنانچہ خود راقم حروف کی ایک بار اسی شبہ میں یورپین وارڈر کے حکم سے جامہ تلاشی لی گئی اگرچہ کچھ برآمد نہیں ہوا

سب سے بڑا تماشا یہ ہے کہ ہر یورپین قیدی کے کمرے پر دو ہندستانی قیدی رات بھر پنکھا قلی کا کام دیتے ہیں۔ بارہ بجے تک ایک اور پھر صبح تک دوسرا قیدی پنکھا کھینچا کرتا ہے۔ "دنا عنبر دایا داولی اوابصار،،

فرائض مذہبی اور عام برتاؤ

گوروں کے لیے ہر ہفتہ میں ایک پادری۔ پادری صاحب آ کے وعظ

فرماتے ہیں اور ایک جگہ نماز پڑھی جاتی ہے۔ لیکن کالوں کی مذہبی ضروریات کی جانب کبھی بھول کر بھی توجہ نہیں کی جاتی۔

عام قیدیوں کی پوشاک میں جانگیا کی لمبائی اس قدر کم ہوتی ہے کہ جسم اسفل ران تک بالکل کھلا رہتا ہے اور اس طرح پر نماز کے لیے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی۔ یہ کمی ایسی ہے کہ صرف دو بالشت کپڑا زیادہ استعمال کرنے سے رفع ہو سکتی ہے۔ لیکن کوئی اس کی جانب توجہ نہیں کرتا۔ راقم حروف مجبوراً اسی حالت نیم برہنگی میں نماز پڑھا کرتا تھا۔

کالوں کے لیے مذہبی وعظ و تلقین کا انتظام تو درکنار اخلاقی جرموں کے ارتکاب پر سزا کے عوض انھیں الٹا انعام ملتا ہے اور بعض حالتوں میں تو حکام جیل ایک طرح پر انھیں ایک دوسرے کی غیبت، جاسوسی، سب و شتم، مار دھاڑ اور ظلم سختی کی ترغیب دیتے ہیں کیوں کہ غیبت یا جاسوسی کرنے والے قیدی ہر طرح کی رعایت کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں اور قیدی نمبرداروں میں تو خاص کر ایسے ہی لوگ ان کے منظور نظر ٹھہرتے ہیں جو اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ چالاک پاجی، ظالم اور بد زبان مشہور ہوں۔

مسلمانوں کے تہوار عید، بقر عید، شب برات، محرم میں شاذ و نادر ہی کسی تہوار پر تعطیل ہوتی ہے حالاں کہ گوروں کے لیے بڑے دن کے ایام میں جیلر وغیرہ کی طرف سے دعوت کا سامان کیا جاتا ہے اور ان کو ہر قسم کے میوے اور کھلونے دیے جاتے ہیں اس کے علاوہ عام برتاؤ میں گوروں کو کالوں پر ہر طرح سے فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ کام انھیں ہلکا ملتا ہے۔ اپنے عزیزوں یا دوستوں سے ملنے اور خط و کتابت کرنے میں انھیں زیادہ آسانی ہوتی ہے ہر سہ ماہی پر سپرنٹنڈنٹ جیل کا رگزار قیدیوں کو رہائی کے جو دن اپنی طرف سے دیتا ہے اس رعایت سے بھی سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ ملازمان جیل انھیں کسی طرح دِق نہیں کر سکتے۔ بلکہ اکثر موقعوں پر دیدہ و دانستہ ان کی بے ضابطگیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ غرض کہ ہر صورت سے ان کی قید کا زمانہ اس طرح سے گزرتا ہے کہ بعض آوارہ مزاج گرانیوں کو تو ہم نے یہ کہتے سنا کہ ہم کو گھر سے زیادہ تو جیل ہی میں آرام ہے۔[۳۴]

عتیق صدیقی

حسرت کی سیاسی زندگی کے آخری پچیس سال

"میرا پروگرام ہمیشہ سے امپیریلزم کو تباہ کرنے کی کوشش پر مبنی رہا ہے اور یہی رہے گا۔ اور جو پارٹی بھی اس پروگرام کو ہاتھ میں لے گی اس کے ساتھ میں تہِ دل سے شریک اور اس کا ہمدرد رہوں گا۔"[1]

یہ اقتباس حسرت موہانی کے ایک اخباری بیان سے اخذ کیا گیا ہے، جو ۲۰؍اگست ۱۹۲۴ء کو انھوں نے بمبئی میں دیا تھا۔ اس سے ایک ہی روز قبل، دو سال کی سزا بھگتنے کے بعد، یرودا سنٹرل جیل (پونا) سے وہ رہا ہوئے تھے۔ حسرت ہی کے سلسلے میں مواد کی جستجو میں مندرجہ بالا بیان سے مماثل ایک اور بیان نظر آیا، جس کا ایک اقتباس یہ ہے:

"میں نہ تو کمیونسٹ ہوں، نہ سوشلسٹ۔ میرا پروگرام فی الحال ایشیا سے انگریزوں کا استیصال ہے۔ یورپی سرمایہ داری کا میں بدترین دشمن ہوں، جس کے حقیقی نمائندے انگریز ہیں۔ اس باب میں کمیونسٹوں سے مجھے کلی اتفاق ہے، اور ہم سب ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔"[2]

حسرت کے بیان سے اتنی قریبی مماثلت رکھنے والا بیان برکت اللہ بھوپالی

۱۔ روزنامہ ہمدم (لکھنؤ): ۲۴؍اگست ۱۹۲۴ء

۲۔ ادھیکاری (مرتب): ڈاکومنٹس آف دی ہسٹری آف دی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا: پہلی جلد: ص ۱۱۸

(۱۸۵۹ء - ۱۹۲۷ء) کا ہے، جو حسرت کے دیرینہ نادیدہ دوست، یا خود حسرت ہی کے الفاظ میں، ان کے "غائبانہ کرم فرما"، اور ان کے ہم مسلک تھے۔ حسرت کے اردوئے معلٰی کے ابتدائی دور میں برکت اللہ کے متعدد مضامین بھی شائع ہوئے تھے، جن کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ وہ فارسی میں لکھے گئے تھے، اور دوسری یہ تھی کہ وہ نیویارک (امریکا) سے بھیجے گئے تھے۔ ان کا پہلا مضمون مارچ ۱۹۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پر مندرجہ ذیل ادارتی نوٹ بھی تھا، جس سے اردوئے معلٰی کی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے:

"دسمبر ۱۹۰۵ء کے پرچے میں کانگرس کے متعلق جو مضمون نکلا تھا،
اس کا ترجمہ انگریزی کے کسی اخبار میں دیکھ کر ہمارے ایک غائبانہ
کرم فرما نے نیویارک امریکا سے ایک فارسی مضمون بھیجا ہے۔"

برکت اللہ کا اسی سلسلے کا ایک دوسرا فارسی مضمون "ہندستانی مسلمان در ہندستان" کے عنوان سے اردوئے معلٰی کی مئی و جون ۱۹۰۷ء کی اشاعتوں میں ملتا ہے۔ پہلے اور دوسرے مضمون کی درمیانی مدت میں ـــ مئی ۱۹۰۶ء کے پرچے میں ـــ برکت اللہ کا ایک اردو قطعہ بھی ملتا ہے۔ اڈیٹر نے اپنے نوٹ میں اس کی جو شانِ نزول بیان کی ہے، اس سے برکت اللہ کے متعلق ایک واقعے کی نشان دہی ہوتی ہے، جس کا ان کے سوانح نگاروں کو غالباً علم نہیں ہے۔ حسرت نے لکھا تھا:

"کچھ عرصہ ہوا اکثر اخباروں میں جناب مولوی برکت اللہ صاحب
بھوپالی کی خبر وفات شائع ہوئی تھی۔ جس کی صحت پر ہم کو شبہ
تھا۔ چناں چہ خدا کا شکر ہے کہ دریافت حال پر یہ خبر غلط نکلی، اور
مولانا موصوف نے حسبِ ذیل قطعہ اسی واقعے کی نسبت اردوئے معلٰی
کے لیے تحریر فرمایا ہے۔"

قطعہ دس اشعار پر مشتمل ہے۔ چند جستہ جستہ اشعار یہ ہیں:

لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو مر گیا   کاش اٹھ جاتا یہ ہستی کا حجاب

دیس کا عاشق مرے پردیس میں — خوب فرمایا! بھلا اچھا جناب
ہند کی الفت میں یاں جیتے ہیں ہم — گرچہ ہے پردیس میں رنج و عذاب

بات کچھ دور جا پڑی ہے۔ ذکر تھا برکت اللہ کے اس بیان کا جو اوپر نقل کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں وہ ماسکو میں تھے۔ وہیں روزنامہ پیٹروگراڈ پراودا، کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے، بیدھے سادھے الفاظ میں، اپنا سیاسی مسلک انھوں نے بیان کر دیا تھا۔ حسرت کو سوویت روس کی زیارت کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا یا ہوتے ہوتے رہ گیا؟[۲] بہرکیف گمان غالب ہے کہ یہ سعادت ان کے حصے میں آئی ہوتی اور پراودا کا کوئی نامہ نگار ان کے سیاسی مسلک کے متعلق سوال کرتا تو وہ بھی اسی طرح کا، یا اس سے ملتا جلتا، جواب دیتے جو برکت اللہ نے دیا تھا۔

"انگریزوں کے استیصال" کا اپنا جو نظریہ برکت اللہ نے بیان کیا تھا، وہ اس دور میں صرف ان ہی تک، یا حسرت ہی تک، محدود نہیں تھا۔ حقیقت

۲۔ حسرت ۱۳ر اپریل ۱۹۱۶ء کو گرفتار کر کے نظربند کیے گئے۔ اس کے چند روز قبل ابوالکلام آزاد نظربند کیے جا چکے تھے۔ ان دونوں کی نظربندی کے سلسلے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے انٹلی جنس ڈپارٹمنٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہام فورڈ کا یہ دل چسپ بیان ملتا ہے کہ "انھیں اس اطلاع کی بنیاد پر نظربند کیا گیا تھا کہ برکت اللہ نے اُن دونوں کو موقتی حکومتِ ہند کی طرف سے کابل آجانے کی دعوت دی تھی۔"

ہسٹری آف دی نان کوآپریشن اینڈ خلافت موومنٹس، از ہام فورڈ: ص ۱۲۵
حسرت کو اگر کابل جانے کی مہلت مل گئی ہوتی، تو وہ بھی اور مہاجرین کی طرح وسطی ایشیا ہوتے ہوئے ماسکو پہنچ گئے ہوتے۔

یہ ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عموماً اور تیسری دہائی میں خصوصاً بیشتر ہندستانی مسلمان سیاسی مفکروں کے پیش نظر انگریزوں کے استیصال ہی کا پروگرام تھا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے ان کے اس پروگرام کی، غیر محسوس طور پر، رفتار تیز کردی تھی۔ اس انقلاب کو دبے لہجوں میں سب نے خوش آمدید کہا تھا: حسرت نے اپنی نظر بندی کے آخری ایام میں، ۱۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کو ایک مختصر سی غزل کہی تھی، جس کا یہ شعر خصوصیت سے قابل ذکر ہے:

عشاقِ منتظر کو یہ صبحِ نو مبارک
خورشید اک نرالا بالائے بام نکلا

لیکن اس نرالے خورشید کی تابانی کو دیکھ کر انھیں اپنے ملک کی محرومی بھی یاد آئی:

محروم اک ہمیں ہیں اے مقصد تمنا!
دنیا میں ورنہ کس کا تجھ سے نہ کام نکلا

حسرت کو دسمبر ۱۹۱۸ء میں نظر بندی سے رہائی ملی، اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنا سیاسی سفر اسی جگہ سے شروع کردیا، جہاں سے انھیں ڈھائی سال قبل اسے ختم کرنا پڑا تھا۔ انھوں نے کانگرس کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکوں میں حصہ لیا۔ لیکن یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے اس عمل میں وہ گرم جوشی نہیں تھی جس کا علی برادران، ابوالکلام آزاد اور دوسرے لیڈروں نے مظاہرہ کیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ حسرت کو گاندھی جی کی قیادت پر اعتماد نہیں تھا، جو اس وقت کانگرس ہی کے نہیں پورے ملک کے مسلمہ لیڈر بن چکے تھے۔ ان کی یہ بے اعتمادی روز بروز بڑھتی گئی، جو انھیں اپنے سیاسی گرو تلک سے ورثے میں ملی تھی۔ ہندستانی سیاسی افق پر گاندھی جی کے رونما ہوتے ہی انتہا پسند تلک اور اعتدال پسند گاندھی میں تصادم ہوا۔ گاندھی کھادی کو اور عدم تشدد کو ہندستان کی آزادی کی کنجی سمجھتے تھے، تلک کے نزدیک

یہ دونوں باتیں مہمل تھیں۔ لیکن تحریک ترک موالات کے شباب پر پہنچنے سے پہلے ہی تلک اس دنیا سے اٹھ گئے، جس نے گاندھی جی کی قیادت کے لیے میدان صاف کر دیا۔ تلک کی جگہ لینے کی حسرت میں صلاحیت نہیں تھی۔ تنظیمی اہلیت بھی ان کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ ان باتوں سے قطع نظر ان کو اس وقت آل انڈیا لیڈر کی حیثیت بھی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ وہ صف اول کے سیاسی کارکن، یا زیادہ سے زیادہ صوبائی حیثیت کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔

حسرت نے امرتسر کے تاریخی کانگریس اجلاس میں، جو دسمبر ۱۹۱۹ء کی آخری اور جنوری ۱۹۲۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں منعقد ہوا تھا، گاندھی جی کے خلاف آواز اٹھائی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ولایتی کپڑے کے بائی کاٹ ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہم کو برطانوی مصنوعات کا مکمل بائی کاٹ کرنا چاہیے۔ گاندھی جی کے مستند سوانح نگار ٹنڈولکر کے بیان کے مطابق امرتسر کانگریس کے موقع پر[۴] مولانا حسرت موہانی گاندھی جی کے سب سے بڑے حریف "بن گئے۔ انھوں نے کہا ہمیں کوئی ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، جو فوری طور پر کارگر ثابت ہو۔ ہمیں کوئی ایسا زود اثر اور موثر طریق کار تبانا ہے، جس کا فوری طور پر اثر ظاہر ہو۔"

اکتوبر ۱۹۲۱ء میں یو پی پولی ٹی کل کانفرنس آگرہ میں منعقد ہوئی اس کی صدارت کے لیے حسرت کا انتخاب عمل میں آیا، ان کا پورا خطبہ صدارت ہمارے سامنے نہیں ہے۔ لیکن مدینہ (بجنور) نے اپنے ایک ادارتی نوٹ میں ان کے خطبے کو "کئی حیثیتوں کی وجہ سے توجہ اور غور کے قابل" قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"صحیح یہ ہے کہ سارا خطبہ آپ کے خاص سیاسی عقیدے کی تشریح

۴۔ ٹنڈولکر: مہاتما، (انگریزی): جلد اول: ص ۳۴۳

ہے ... آپ کی رائے ہے کہ ہم کو بہرحال حریت کامل کے درپے ہونا چاہیے'...

"کانگرس کے سیاسی عقیدے کی تنقید کے بعد آپ نے حصولِ سوراج کے ذرائع پر بحث کی ہے کہ یہ جائے 'جائز و پرامن ذرائع' کے 'ہر ممکن و مناسب طریقے' کا لفظ استعمال کرنا چاہیے...

"آپ کا خیال ہے کہ بہ غرض مدافعت اگر کوئی شخص خفیف طرزِ مدافعت پر اتر آئے، تو اسے بھی جائز و پرامن کے حدود میں سمجھا جائے۔"

اس کانفرنس کی کارروائی سے گاندھی جی کو مطلع کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے شکایتاً لکھا تھا:

"حسرت موہانی ہمارے صدر تھے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں انھوں نے عدم تشدد کے مسلک سے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔[5]"

دسمبر ۱۹۲۱ کی آخری ہفتہ ہندستان کی سیاسی تاریخ کا ایک یادگار ہفتہ تھا۔ اس ہفتے میں کانگرس، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس احمد آباد کے شہر میں منعقد ہوئے۔ ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں کے بیشتر لیڈر گرفتار ہو چکے تھے، اس لیے خیال تھا کہ دسمبر کی سردی احمد آباد کے اجتماعات کی کارروائی پر بھی غالب رہے گی، لیکن حسرت نے ان تینوں سیاسی جماعتوں کے اجلاسوں میں "حریت کامل" کا نعرۂ مستانہ بلند کر کے وہ گرمی پیدا کی، جس سے گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں جیسے آزمودہ کار لیڈروں کو بھی پسینہ آگیا۔ کانگرس کے اس اجلاس میں سوبھاش چندر بوس بھی موجود تھے، جو آگے چل کر کانگرس کے صدر بنے اور گاندھی جی سے ٹکر لی، اور حسرت نے زندگی کے آخری دور

۵۔ سلکٹیڈ ورکس آف جواہر لال نہرو: جلد اول: ص ۲۰۱

میں جن کو اپنا سیاسی مرشد بنا لیا تھا۔ انھوں نے اپنے تاثرات موثر الفاظ میں قلم بند کیے ہیں:

"احمد آباد کانگرس میں ایک دل چسپ واقعہ پیش آیا۔ صوبۂ متحدہ کے ایک سربرآوردہ مسلمان لیڈر، مولانا حسرت موہانی، نے اس مضمون کی قرارداد پیش کی کہ کانگریس کے دستور میں ترمیم کر کے اس کا نصب العین جمہوریہ ــــ ریاست ہائے متحدہ ہندستان ــــ کا قیام قرار دیا جائے۔ انھوں نے بڑی مدلّل تقریر کی اور حاضرین پر اس کا جو اثر ہوا اس سے گمان ہوتا تھا کہ ان کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی جائے گی۔ . . مہاتما نے اس قرارداد کی مخالفت کی . . . اور ایوان نے اسے مسترد کر دیا۔ لیکن یہ تجویز کانگرس کے اگلے اجلاسوں میں بھی پیش کی جاتی رہی، بالآخر ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگرس کے اجلاس میں قبول کر لی گئی ــــ لاہور میں یہ قرارداد کسی اور نے نہیں، مہاتما ہی نے پیش کی تھی[۹]"

بوس کے تاثرات کی تائید گاندھی جی کی تقریر سے بھی ہوتی ہے۔ حسرت کی قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"ایسا قدم اٹھانے سے قبل اس کے عواقب پر پچاس بار غور کرنا لازم ہے، . . . جس سے ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا امکان ہو . . . ہم کو اتنے گہرے پانی میں نہ اترنا چاہیے جس کی گہرائی کا ہم کو علم نہ ہو، اور مسٹر حسرت موہانی کی قرارداد ہمیں اتنے گہرے پانی میں لے جانا چاہتی ہے، جس کی گہرائی اتھاہ ہے۔ پورے اعتماد کے ساتھ اسے مسترد کرنے کی بابت آپ سے اپیل کرتا ہوں[۱۰]"

۹۔ سوبھاش بوس: انڈین اسٹرگل: ص ۶۹

۱۰۔ انڈین اینول رجسٹر: ۱۹۲۱؛ حصہ دوم: ص ۶۵-۶۶

کانگریس کے ایوان نے بالآخر حسرت کی قرارداد مسترد کر دی تاہم بہ قول بام فورڈ "اس حقیقت کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے کہ گاندھی کی پُرزور اپیل کے بعد ہی "یہ ممکن ہو سکا۔ ورنہ ان کی اپیل سے قبل "بھاری تعداد میں لوگ حسرت کی قرارداد کے حق میں تھے[8]"

احمدآباد کانگریس کے منتخب صدر چِترنجن داس اجلاس سے قبل گرفتار کر لیے گئے تھے۔ ان کی جگہ پر حکیم اجمل خاں نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ داس کو بھی گاندھی جی کے عدم تشدد کی پالیسی اور ان کی اعتدال پسندی سے اتفاق نہیں تھا۔ انھوں نے احمدآباد کانگریس کی صدارت کی ہوتی تو ممکن تھا کہ حسرت کی قرارداد کو ان کی حمایت بھی حاصل ہوتی۔

حسرت نے حریت کامل کی قرارداد خلافت کانفرنس کے اجلاس احمدآباد میں بھی پیش کی جس سے وہاں، بہ قول قاضی عبدالغفار:

"بہت سخت کشمکش پیدا ہوئی۔ سبجکٹ کمیٹی میں یہ تجویز کثرت رائے سے منظور کر لی گئی۔ لیکن حکیم [اجمل خاں] صاحب نہیں چاہتے کہ جو تجویز کانگریس نے نہیں منظور کی وہ خلافت کانفرنس میں منظور کر لی جائے ... چناں چہ خلافت کانفرنس کے کھلے اجلاس میں جب یہ تجویز آئی تو انھوں نے صدارت کے اختیارات سے کام لے کر اس کے پیش ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے اس طرزِ عمل پر ملک کے بہت سے گوشوں، خصوصاً مسلمانوں کے انتہاپسند حلقوں میں بہت اعتراض کیے گئے[9]..."

مسلم لیگ کے اجلاس احمدآباد کی صدارت حسرت ہی کے حصے میں آئی تھی۔ وہاں انھوں نے حریت کامل کی قرارداد آزاد سبحانی سے پیش کرائی، جو ان سے کم سر

۸۔ بام فورڈ: متذکرہ: ص ۴۷۔ ۴۸

۹۔ حیات اجمل: ص ۲۶۲

بپھرے نہیں تھے۔ یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ وہاں سبجکٹ کمیٹی ہی میں اسے مسترد کر دیا گیا۔ لیکن حسرت نے اپنی صدارتی اختیارات کو استعمال کر کے اس شرط کے ساتھ کھلے اجلاس میں اس قرار داد پر بحث کی اجازت دے دی کہ اس پر ووٹنگ نہ ہو اور اسے مسترد سمجھا جائے[۱۰]۔"

لیکن مسلم لیگ میں انھوں نے جو صدارتی خطبہ پیش کیا وہ اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ اس میں انھوں نے بعض ایسی باتیں بھی کہیں جنھیں کانگرس اور خلافت کے اجلاسوں میں کھل کر کہنے کا شاید انھیں موقع نہیں ملا تھا۔ یہ خطبہ اردو میں تھا، جو مسلم لیگ کے لیے ایک نئی اور انوکھی بات تھی۔ افسوس ہے کہ اس کا متن راقم کو مل نہیں سکا ہے، لیکن ایک اردو اخبار ہی کی وساطت سے اس کے مواد کا ہمیں علم ہوتا ہے:

"۳۰ دسمبر [۱۹۲۱ء] کو مسلم لیگ کا چودھواں اجلاس مولانا حسرت موہانی کی صدارت میں منعقد ہوا... انھوں نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ از ابتدا تا انتہا اس تجویز پر مبنی تھا کہ ہندستان میں ایک جمہوری حکومت قائم کی جائے، جس کا یکم جنوری ۱۹۲۲ء سے آغاز ہو، اور اسے ممالک متحدۂ ہندستان کے نام سے موسوم کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تمام ممکن اور معقول ذرائع استعمال کیے جائیں۔ حتیٰ کہ اگر گورنمنٹ مارشل لا کا اعلان کر دے تو اس صورت میں ہم کو متفرق ٹولیوں میں منتشر ہو کر گورنمنٹ کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

... مارشل لا کا اعلان ہو جانے کے بعد غیر اشتداد [عدم تشدد] کے اصول سے کام نہیں چل سکتا۔

۱۰۔ شریف الدین پیرزادہ: فاؤنڈیشن آف پاکستان: جلد اول: ص ۵۶۵

اس وقت انھیں مجبوراً متفرق جماعتوں میں منتشر ہو کر گورنمنٹ کا اسلحہ سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔

"مولانا کی رائے میں ایک گورنمنٹ کو بدلنے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اسے تلوار کی مدد سے تباہ و برباد کر دیا جائے، اور یہی صورت تمام دنیا میں رائج ہے۔ یا پھر یہ ہو کہ ہم اس گورنمنٹ کے جواب میں اپنی گورنمنٹ علاحدہ قائم کر لیں... اس گورنمنٹ کی سپاہ علاحدہ ہو، اس کی پارلیمنٹ بھی ہو اور اسی قسم کے اور محکمے بھی ہوں...[11]"

مندرجہ بالا اقتباس میں حسرت نے "متفرق جماعتوں میں منتشر ہو کر گورنمنٹ کا اسلحہ سے مقابلہ کرنے کے لیے" گوریلا طرزِ جنگ" کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ ہام فورڈ نے اپنی رپورٹ میں یہی اصطلاح حسرت سے منسوب کی ہے[12]۔ اس کی تائید ایک معاصر ماخذ "مرقع اجتماعات احمد آباد" سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے مرتب زاہد نعمانی قادری کے بیان کے مطابق حسرت نے اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے "اعلان مارشل لا کے جواب میں گوریلا طرزِ جنگ ــ ٹکڑیاں بنا کر ــ لڑنا چاہیے] جو عام طور پر اسی نام سے مشہور ہے۔ یا قرآن مجید کی آیت "قتلوھم حیث وجدتموھم (جہاں تم ان کو پاؤ قتل کر ڈالو)[13]"

حسرت نے احمد آباد میں حریت کامل کی، برطانیہ سے کلی قطع تعلق کی اور جمہوریہ ہند کے فوری قیام کی جو قراردادیں پیش کی تھیں اور جو تقریریں کی تھیں، ان کی "پاداش میں تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مئی ۱۹۲۲ء میں مقدمہ چلایا گیا اور دو سال کی سزا دی گئی۔" لیکن یہ قطعاً حیرت ناک نہیں ہے کہ اس سزا کا حسرت پر

۱۱۔ مدینہ: ۵ جنوری ۱۹۲۲ء

۱۲۔ ہام فورڈ: متذکرہ: ص ۸۱ - ۱۸۰

۱۳۔ بحوالہ احمر لاری: حسرت موہانی، حیات اور کارنامے۔ ص ۱۰۹

کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور رہا ہوتے ہی انھوں نے وہ بیان دیا، جس کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے۔ مضمون کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے اس جگہ بھی نقل کیا جا رہا ہے:

"میرا پروگرام ہمیشہ سے امپیریلزم کو تباہ کرنے کی کوشش پر مبنی رہا ہے اور یہی رہے گا۔ اور جو پارٹی بھی اس پروگرام کو ہاتھ میں لے گی اس کے ساتھ میں تہِ دل سے شریک اور اس کا ہمدرد رہوں گا۔"[۱۴]

حسرت کی احمد آباد کی سرگرمیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد بام فورڈ کو "ایک ایسی پارٹی کے علانیہ ظہور کے" "آثار نظر آئے تھے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لیے" تشدد کے ذرائع بھی اختیار کرنے کے حق میں" تھی۔ بام فورڈ کا تجزیہ غلط نہیں تھا۔ حسرت نے جب پوری شدت اور ایمان و ایقان کے ساتھ حریت کامل کی قرارداد پیش کی تھی اور اس کے حصول کے لیے گوریلا جنگ کے ذرائع استعمال کرنے کے عزم کا اعلان کیا تھا، اس وقت بھی ان کے ذہن میں ایک نئی پارٹی کے قیام کی اسکیم ضرور رہی ہوگی، کیوں کہ ان سے زیادہ اور کوئی اس حقیقت سے واقف نہ رہا ہوگا کہ گاندھی جی اور ان کے فلسفے کو اس وقت جو مقبولیت حاصل تھی اس کے پیش نظر ملک کی کوئی بھی پارٹی ان کی اسکیم کو ہاتھ میں لینے کی ہمت نہ کرے گی۔ دو سال کی سزا بھگتنے کے بعد رہا ہوتے ہی انھوں نے جو پہلا بیان دیا اسے اگر بین السطور میں پڑھا جائے تو اس میں بھی ایک نئی پارٹی کے قیام کے جراثیم ضرور نظر آئیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ یروداجیل سے نکلنے کے بعد حسرت نے سرگرمی کے ساتھ ایک نئی پارٹی کی داغ بیل ڈالنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی دستاویزوں سے ہماری معلومات میں یہ قابل قدر اضافہ ہوتا ہے کہ ۱۹۲۴ء میں بعض مزدور لیڈروں کے ساتھ مل کر:

۱۴۔ روزنامہ ہمدم (لکھنؤ): ۱۴ر اگست ۱۹۲۴

،حسرت موہانی نیشنل کمیونسٹ پارٹی کے قیام کے درپے تھے۔"[15]

اس کا اگرچہ واضح طور پر ہمیں علم نہیں ہوتا کہ نیشنل کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا تصور ان کے ذہن میں کیوں کر، یا کیسے، پیدا ہوا تھا؛ تاہم اس کے محرکات کا پتہ لگانا چنداں دشوار نہیں ہے۔ انقلاب روس اور اس کی کامیابیوں سے حسرت کلی طور پر واقف تھے، اور اس کی طرف ان کا جو رویہ تھا اس کا اندازہ ایک دلچسپ واقعے سے ہوتا ہے۔ نان کواپریشن کی تحریک کے ابتدائی زمانے میں ہندستان پر افغانستان کے حملے کی پھلجھڑی انگریزوں نے چھوڑی تھی۔ کسی نے اس سلسلے میں مولانا محمد علی سے سوال کر دیا۔ انھوں نے جو جواب دیا اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ افغانستان کے حملے کی حالت میں مسلمانوں کو افغانستان کا ساتھ دینا چاہیے۔ اسے ملک کے ٹوڈی طبقے نے اس قدر اچھالا کہ ملک میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اس سلسلے میں متعدد اجتماعات ہوئے۔ اسی نوع کی ایک میٹنگ تیج بہادر سپرو نے بھی بلائی جس میں حسرت بھی مدعو تھے۔ انھوں نے، غالباً ارادی طور پر، بحث کا رخ سوویت روس کی طرف موڑ دیا۔

کیا آپ نہیں جانتے، بحث میں حصہ لیتے ہوئے حسرت نے کہا، افغانستان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہندستان پر وہ حملہ کرے؛ یہ کہیے کہ روس نے حملہ کیا تو کیا ہوگا؟
اچھا مولانا یہ بتلائیے، تیج بہادر سپرو نے سوال کیا، اس حالت میں آپ کیا کریں گے؟
میں تو شاعر ہوں، قصیدہ لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ ان کا خیر مقدم کروں گا۔
لیکن مولانا وہ لوگ کان پور میں آپ کی دکان لوٹ لیں گے۔ آپ انھیں کیوں بلانا چاہتے ہیں۔
بلا سے لوٹ لیں گے! ملک تو آزاد ہو جائے گا۔ وہ جہاں بھی گئے ہیں ملکوں کو آزاد کیا ہے۔ انگریزوں کی طرح غلام نہیں بنایا ہے۔[16]

۱۵۔ ادھیکاری: متذکرہ: جلد دوم: ص ۳۷۴

۱۶۔ یہ سوال و جواب خود حسرت کا بیان کردہ ہے جسے قاضی عدیل عباسی نے حسرت پر اپنے طویل مضمون 'شعلۂ تند رمقبول لاری' میں اور دوسرے مضامین میں بھی درج کیا ہے۔

خود حسرت کا بیان کردہ یہ مکالمہ قاضی عدیل عباسی کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے جو ان دنوں حسرت ہی کی کانپور کی دوکان سے وابستہ تھے۔ اس داستان سے انقلاب روس کے بارے میں حسرت کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

احمد آباد کے اجتماعات (۱۹۲۱ء) میں حسرت نے حریت کامل کی قرارداد جب پیش کی تھی، اور اس کے حصول کے لیے گوریلا طرز جنگ کا نسخہ تجویز کیا تھا تو اس وقت بھی ان کے ذہن کی پشت پر انقلاب روس اور اس کے جلو میں پیدا ہونے والے واقعات ضرور رہے ہوں گے۔ انھیں اس کا علم بھی یقیناً رہا ہوگا کہ ہجرت کر کے افغانستان جانے والے مسلمانوں میں سے کچھ لوگ افغانستان کی سرحد پار کر کے سوویٹ وسطی ایشیا جا پہنچے ہیں اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لیے سوویٹ حکومت کی امداد حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ وہ اس سے بھی قطعاً واقف رہے ہوں گے کہ تاشقند میں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "۱۹۲۱ء میں دائیں بازو کے انقلابی ہندستان میں بھی پیدا ہو چکے تھے جو انقلاب روس سے متاثر ہو کر آگے آئے تھے۔ ان ہی میں پر جوش خلافتی حسرت موہانی بھی تھے، ... جو آگے چل کر کانپور میں منعقد ہونے والی پہلی کمیونسٹ کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر بنے..."[۱۷] حسرت پہلی کمیونسٹ کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ہی نہیں، اس کے روح رواں بھی تھے اور بڑی حد تک ان ہی کی کوششوں سے اس کا انعقاد ہوا تھا۔

حسرت نے اس موقع پر جو استقبالیہ خطبہ پڑھا تھا اس کا مطالعہ، حسرت کے مطالعے کے سلسلے میں بہت مدد و معاون ہوتا ہے۔ اس کا متن ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے جو اردوئے معلیٰ کی اشاعت بابت، اپریل، مئی، و جون ۱۹۲۶ء سے اخذ کیا گیا ہے:

۱۷۔ ادھیکاری: متذکرہ؛ جلد اول: ص ۲۸۱

پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس دکان پور
میں
حسرت موہانی کا استقبالیہ خطبہ

(۱) شکریہ و دعا

دوستو! استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے میں آپ سب کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور سب کو اس دعا میں شریک کرنا چاہتا ہوں کہ ہندستان میں حقیقی اخوت و مساوات کی جو تحریک آج باقاعدہ طور سے شروع کی جاتی ہے اس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو اور بہت جلد یہ تحریک سارے ملک میں پھیل کر ہندستان کی واحد سیاسی اور اقتصادی تحریک بن جائے۔

(۲) کمیونزم کے نام سے گھبرانے کی بنا غلط فہمیوں پر ہے

کمیونزم کی تحریک کاشت کاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے اس تحریک کے اصول اور اغراض و مقاصد سے جمہور اہل ہند عموماً اتفاق کرتے ہیں۔ البتہ بعض صریح غلط فہمیوں کی بناء پر کمیونزم کے نام سے بعض کم زور اور وہمی طبیعت کے لوگ گھبراتے ہیں۔ حالاں کہ یہ غلط فہمیاں سب سرمایہ داروں اور دوسرے بدخواہوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ مثلاً بعض لوگ سمجھتے ہیں کمیونزم اور خون ریزی و فساد لازم و ملزوم ہیں۔ حالاں کہ اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف ضرورت اور مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں۔ اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بہ طور اصول لازم قرار نہیں دیتے۔ نیز بعض احمق یا شریر لوگ یہ بھی بکتے پھرتے ہیں کہ کمیونزم اور "جو تیرا سو میرا"، دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ حالاں کہ واقعہ

یہ ہے کہ ہمارے یہاں جائیداد وملکیت کی دو قسمیں مقرر ہیں۔ ایک ذاتی جس کو انگریزی میں پرسنل کہتے ہیں، مثلاً گھڑی، چھتری، لوٹا، بستر، کپڑے، مکان وغیرہ۔ دوسرے شخصی جس کو انگریزی میں پرائیوٹ کہتے ہیں، مثلاً زمین، کارخانے وغیرہ۔ اور کمیونسٹ اصول کا عمل ذاتی جائیداد پر نہیں ہوتا صرف شخصی پر ہوتا ہے۔

(۳) ہمارے اصول

تفصیل کا موقع نہیں، مجملاً یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارے اصول میں سرمایہ داری اور شخصی جائیداد کی مطلق گنجائش نہیں۔ زبان عوام میں یہ بات یوں بھی ادا کی جا سکتی ہے کہ زمین بھی ہوا اور پانی کی طرح عطیہ الٰہی ہے، جس پر کسی کی ملکیت مقرر نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس کو انسان حسب ضرورت اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکتا ہے اور اس باب میں بدنظمی کو روکنے اور اپنی آزادی وآرام کو قائم رکھنے کی غرض سے ہر مقام کے لوگ اپنے کل معاملات کا انتظام جمہوری اصولوں پر خود کر سکتے ہیں۔ اسی کا نام سوویٹ گورن منٹ ہے۔

(۴) ہمارے اغراض ومقاصد

ہماری پارٹی کا تفصیلی لائحہ عمل جو سوویٹ کانسٹی ٹیوشن سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ ہماری اس پہلی کانفرنس میں پیش ہو کر پاس ہوگا۔ ہمارے اغراض و مقاصد یہ ہیں۔

(۱) ہندستان میں سوراج یعنی آزادیٔ کامل کا کل جائز ذریعوں سے قائم کرنا۔

(۲) سوراج کے قائم ہونے پر یہ دیکھنا کہ اس سوراج کی ہیئت سوویٹ ری پبلک ہو جہاں کمیونزم کے کل اصولوں پر عمل کیا جائے۔

(۳) سوراج کے قائم ہونے تک کاشت کاروں اور مزدوروں کی فلاح و آزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس ضمن میں ہندستان کی ہر سیاسی

جماعت کے ساتھ اس حد تک اشتراک عمل کو جائز رکھنا جس حد تک وہ جماعت ہمارے مذکورۂ بالا اغراض و مقاصد کی تائید کرے۔

(۴) کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو اپنا ہم خیال بنانا تاکہ سوراج کے قیام کے ساتھ فوراً ان پر عمل شروع ہو سکے۔

(۵) ہماری جماعت صرف ہندوستان کی جماعت ہے۔

اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ کم از کم فی الحال ہماری جماعت کا دائرۂ عمل صرف ہندوستان تک محدود ہے۔ دیگر ممالک کی جماعتوں سے ہمارا تعلق صرف ہمدردی و ہم خیالی کا ہے۔ اس راہ میں ہم ان سب کے عموماً اور تیسری انٹرنیشنل کے خصوصاً ہم عصر ضرور ہیں۔ ماتحت نہیں۔ نہ ہم ان کو کوئی عملی مدد دیتے ہیں اور نہ وہ ہماری کوئی مالی اعانت کرتے ہیں۔

(۶) کمیونزم اور مذہب

بعض بد باطن لوگ کمیونزم پر ایک یہ بے جا تہمت لگاتے ہیں کہ وہ لازمی طور پر مذہب کی دشمن ہے حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ مذہب کے معاملے میں انتہا درجے کی رواداری کو مناسب سمجھتے ہیں۔ جو شخص ہمارے اصولوں کو مانے وہ ہمارے فریق [کذا۔ فرقے] میں داخل ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا بودھ، مذہبی شخص ہو یا لامذہب، بہ الفاظ دیگر ہم ہر مذہب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک لامذہبی بھی ایک مذہب ہے۔

(۷) کمیونزم اور اسلام

ہمارے بعض مسلمان لیڈر بلا وجہ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں حالاں کہ حقیقت حال اس کے بالکل برخلاف ہے۔ مثلاً کم از کم سرمایہ داری کے خلاف تو اسلام کا نیصد شاید کمیونسٹی عقیدے سے بھی زیادہ سخت ہے اور فریضۂ زکوٰۃ کا منشا بھی زیادہ تر یہی ہے کہ خلق خدا میں جب تک

ایک شخص بھی بھوکا رہے اس وقت تک مالداروں کو عیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قرآن میں نماز کے بعد سب سے زیادہ زور زکوٰۃ ہی پر دیا گیا ہے اور خلیفۂ اوّل نے زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کے خلاف جہاد کا حکم دیا تھا۔

(۸) زکوٰۃ دراصل ایک ٹیکس ہے جو سرمائے پر لیا جاتا ہے

منافع کے بجائے اصل سرمائے پر ٹیکس لگانے کا مسئلہ ہنوز ممالک یورپ میں زیر بحث ہے لیکن اسلام میں اس کا رواج ابتدائے عہد ہی سے جاری ہے۔ اس لیے کہ رقم زکوٰۃ کا تعین سالانہ منافع کے لحاظ سے نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ کل سرمائے کا چالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں سود کے قطعی حرام ہونے کا بھی یہی سبب ہے کہ سود خوار صرف اپنے سرمایہ سے بغیر محنت کے فائدہ اٹھایا کرتا ہے اور یہ بات اصولِ اسلام کے اسی طرح منافی ہے جس طرح اصول کمیونزم کے خلاف ہے۔

(۹) کمیونزم سیاست کی بہترین اور آخرترین شکل ہے

غرضے کہ جس حیثیت سے دیکھیے معلوم ہوگا کمیونزم پالٹیکس کی آخر ترین اور بہترین شکل ہے اور اس لیے اگر ہمیں اپنے فرسودہ پروگرام کو ترک کر کے کوئی نئی راہ عمل اختیار کرنا ہے تو اسی کو کیوں نہ کریں جو بہترین اور آخرترین ہے۔

حسرت کے اس خطبۂ استقبالیہ کی چند خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ اردو میں پڑھا گیا تھا۔ دوسرے ان کے سابقہ خطبات کے مقابلے میں یہ نسبتاً نہایت مختصر تھا۔ اسی کی تیسری اور سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس سے کمیونزم کے فلسفے سے حسرت کی واقفیت کے حدود کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔
اردوئے معلّی میں اس خطبے کے شائع ہونے سے قبل ہی کانفرنس کے

دفتر نے اس کا انگریزی ترجمہ اشاعت کے لیے جاری کر دیا تھا۔ یہی ترجمہ تمام
کمال انڈین اینول رجسٹر: (جلد دوم: ۱۹۲۵ء) میں نقل کیا گیا۔ قاضی نذرالاسلام نے
بنگلہ ہفت روزہ لنگل (ہل) کی ۲۱ر جنوری ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں اور کام
سنتوسنگھ کے پنجابی ہفتہ وار کرتی کے شمارے میں کمیونسٹ کانفرنس کی
کارروائی کے ساتھ چھاپا گیا۔

حسرت نے اس پہلی کمیونسٹ کانفرنس کو "ہندستان میں حقیقی اخوت
و مساوات" کی تحریک کے آغاز سے تعبیر کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ "بہت
جلد یہ تحریک سارے ملک میں پھیل کر ہندستان کی واحد سیاسی اور اقتصادی
تحریک بن جائے گی۔"

حسرت نے ارادی طور پر کمیونزم کا فلسفہ بیان کرنے سے احتراز کیا تھا
تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، مجملاً یہ سمجھ لیجیے کہ:

"کمیونزم کاشت کاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے...

"ہم لوگ عدم تشدد کو صرف ضرورت اور مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں...

"ہمارے اصول میں سرمایہ داری اور شخصی جائیداد کی مطلق گنجائش نہیں...

"لوگ اپنے کل معاملات کا انتظام جمہوری اصولوں پر خود کر سکتے ہیں۔ اسی کا نام سوویت گورنمنٹ ہے۔"

حسرت کو اس کا بھی کلی احساس تھا کہ مسلمانوں کو کمیونزم کے فلسفے سے اور سوویت
روس کے بارے میں شدید غلط فہمیاں ہی نہیں ہیں بلکہ وہ کمیونزم کو اسلام
کے منافی اور سوویت روس کو اسلام دشمن گردانتے ہیں۔ ان کا یہ خیال غلط
بھی نہیں تھا۔ اس دور کے مسلم اخبارات اسی نوع کے خیالات ظاہر کرتے تھے
اس کی بہت اچھی مثال پہلی کمیونسٹ کانفرنس ہے۔ لکھنؤ کے ممتاز روزنامہ ہمدم

میں خبر تو شائع نہیں ہوئی، لیکن اس کی اشاعت مورخہ ۲۹ دسمبر میں ایک اداریتی نوٹ ضرور ملتا ہے:

"۲۶ دسمبر کو کمیونسٹ کانفرنس کا پہلا اجلاس تلک نگر (کانپور) میں مسٹر سنگارلو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر استقبالیہ نے اپنی تقریر میں کمیونزم کے خلاف بعض غلط فہمیوں کی تردید کی، اور اسے سیاسیات کی بہترین اور تازہ ترین صورت بتائی...

"اس کانفرنس میں کانگرس اور خلافت کا کوئی ممتاز رکن شریک نہ تھا"

اس نوٹ میں صدر کانفرنس کا نام تو لیا گیا تھا، لیکن مصلحتاً، صدر استقبالیہ کا نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا، اور سارا زور اس پر تھا کہ کوئی ممتاز کانگریسی یا خلافتی اس میں شریک نہیں ہوا تھا۔ ان حالات میں حسرت کا اپنے خطبہ استقبالیہ میں کمیونزم اور سوویت یونین کے بارے میں مسلمانوں کے شکوک کو رفع کرنے کی کوشش بے محل نہیں تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

"ہمارے بعض مسلمان لیڈر بلا وجہ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ مثلاً کم ازکم سرمایہ داری کے خلاف تو اسلام کا فیصلہ شاید کمیونسٹی عقیدے سے بھی زیادہ سخت ہے، اور فریضۂ زکوٰۃ کا منشاء بھی تو زیادہ تر یہی ہے کہ... مال داروں کو عیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قرآن میں نماز کے بعد سب سے زیادہ زور زکوٰۃ ہی پر دیا گیا ہے..."

حسرت نے اسلام اور کمیونزم کی مماثلت کے بارے میں جو باتیں کہی تھیں، آگے چل کر ان ہی خیالات کا اظہار واضح تر الفاظ میں اقبال نے بھی کیا۔ ۱۹۳۰ء میں تو انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ کمیونزم میں اگر خدا کا تصور داخل کر لیا جائے، تو کمیونزم بہ مشرف اسلام ہو جائے گی۔[۱۸]

۱۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب: اقبال — جادوگرِ ہندی نژاد: ص ۱۰۱ تا ۱۱۹

بہرکیف حسرت کی تصریح سے مسلمانوں کی غلط فہمیاں تو دور نہ ہوسکیں
اس سے کمیونسٹ حلقوں میں خود ان کے بارے میں غلط فہمیاں، بلکہ بدگم
پیدا ہوگئیں، اور وہ نکتہ چینیوں کا نشانہ بنے۔
ایم۔ این۔ رائے جو بین الاقوامی کمیونسٹ انٹرنیشنل سے وابستہ تھے، اا
خیال تھا کہ حسرت کے خطبے نے بین الاقوامی کمیونسٹ حلقوں کو مایوس کیا۔
نہایت واضح اور شدید تر ردّعمل کامریڈ مظفر احمد کا تھا، جو اس کانفرنس
شریک بھی ہوئے تھے اور نذرالاسلام کے اخبار لنگل سے قریبی تعلق رکھتے
انھوں نے اسی اخبار میں کانفرنس کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ
"مسلمانوں کو کمیونزم کی طرف راغب کرنے کی کوشش میں حسرت موہانی نے کم
کے مقابلے میں اسلام کو برتر مقام دیا ہے۔[19] آگے چل کر انھوں نے اپنی خود نو
میں بھی حسرت کے خطبے پر تنقید کرتے ہوئے اسے "رجعت پسندانہ گردانا[20]
ان حالات میں یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ کانفرنس کے فوراً بعد ۲ د
۱۹۲۶ء کو، اس کی سنٹرل اکزیکٹو کمیٹی نے اپنے پہلے جلسے میں عہدے دار
جو انتخاب کیا، اس میں حسرت کے حصے میں کوئی عہدہ نہیں آیا، اگرچہ اس
میں کامریڈ آزاد سبحانی، کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ البتہ علاقائی آرگنائز
کی فہرست میں، یو پی کے جو چار نام نظر آتے ہیں، ان میں ایک نام: کامریڈ
کا بھی تھا۔[21] لیکن حسرت جس مزاج و قماش کے انسان تھے اس کے پیش نظ
سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ اس طرز عمل کا انھوں نے کوئی خاص اثر تو نہ لیا ہ
لیکن اس سے انھوں نے غالباً یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہوگا کہ کمیونزم اور اس

۱۹۔ ادھیکاری: متذکرہ: جلد دوم: ص ۶۱۳، ۶۱۵، ۶۲۵

۲۰۔ مظفر احمد: مائی سلف اینڈ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا: ص ۴۸

۲۱۔ ادھیکاری متذکرہ: ص ۶۲۷

میں جو مماثلت ان کو نظر آتی ہے وہ شاید حقیقی نہیں ہے، اور ان کو اس کا بھی احساس ہو گیا ہوگا کہ اپنے خطبۂ استقبالیہ میں جن خیالات کا انھوں نے اظہار کیا تھا، وہ ان کے ہم سفروں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے، نیز یہ کہ ان خیالات کو لے کر کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ وہ زیادہ دور تک نہ جا سکیں گے۔ چناں چہ ایک ماخذ کے مطابق، ۱۹۲۷ء میں حسرت نے کمیونسٹ پارٹی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔[۲۲]

حسرت کے متلون سیاسی مزاج کے پیشِ نظر تو یہ حیرت ناک نہیں ہے، لیکن یہ ضرور تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی سے علاحدگی کے بعد ان کے سیاسی مزاج کا توازن اس درجہ برہم ہوا کہ اپنے پچیس سالہ انقلابی ماضی کو یک سر نظر انداز کر کے انھوں نے مسلم لیگ سے علاحدگی اختیار کرنے والے اس ٹوڈی گروپ کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر لیا جس نے شفیع لیگ کا نام اختیار کیا تھا، اور جو سائمن کمیشن کی آمد کے اعلان کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ اس کے صدر سر محمد شفیع اور جنرل سکریٹری سر محمد اقبال تھے۔ حسرت کو جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔[۲۳]

شفیع لیگ سے حسرت کی وابستگی ان کی سیاسی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے، جس کی کوئی تاویل ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیگ میں معمولی سا عہدہ قبول کرنے کے علاوہ انھوں نے اپنی انتہا پسند فطرت کے عین مطابق سائمن کمیشن کے استقبال میں بڑے بڑے ٹوڈیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ مولانا جمال میاں جو حسرت کے مرشد زادے ہونے کے علاوہ ان سے حد درجہ قریب تھے، ان کا بیان ہے کہ

مولانا [حسرت سائمن] کمیشن کے بائیکاٹ کے مخالف تھے۔ گاندھی جی

۲۲۔

۲۳۔ شریف المجاہد۔: قائد اعظم جناح (انگریزی) ص ۹۰۔

نے [کمیشن کی آمد کے خلاف] مظاہروں کی تنظیم کے لیے سارے ملک کا دورہ کیا اور زور و شور سے "سائمن واپس جاؤ" کے نعرے کی تبلیغ کی۔ رائے عامہ گاندھی جی کے ساتھ ہو گئی۔ دورہ کرتے ہوئے گاندھی جی جب کان پور پہنچے تو مولانا حسرت نے گنتی کے چند آدمیوں کے ساتھ کالے جھنڈوں کا مظاہرہ کیا اور "سائمن گو بیک" کے توڑ پر وہ نعرہ بلند کر رہے تھے، "گاندھی جی گو بیک"۔[۲۴]

یہ طرزِ عمل حسرت نے اس وقت اختیار کیا تھا جب ملک کی وہ تمام سربرآوردہ پارٹیاں۔ کانگرس، مسلم لیگ، خلافت کانفرنس، جمعیتہ العلماء۔ جن سے حسرت وابستہ رہ چکے تھے، سائمن کمیشن کی آمد کے خلاف متحدہ طور پر صف آراء تھیں، اور کمیونسٹ بھی ان کے ساتھ تھے۔

آگے چل کر حسرت میں ایک اور عجیب و غریب رجحان پیدا ہوا، اور وہ یہ تھا کہ ایک ہی وقت میں متضاد سیاسی مکتبہ فکر سے وہ تعلق قائم کرنے لگے تھے اس کی دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں، بلکہ ایک ہی وقت میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوئے اور مسلم لیگ سے بھی اپنے تعلق کی تجدید کی۔ اس وقت یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھیں۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اس کی پہلی کانفرنس میں بہت سے آزاد خیال مصنفین نے شرکت کی، لیکن اس کے حقیقی داعی نوجوان کمیونسٹ تھے، جن میں سجاد ظہیر کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، جو زندگی کے آخری لمحے تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے روحِ رواں رہے۔ معمولی سا، یا رسمی، دعوت نامہ موصول ہونے پر بلا اطلاع دیئے

۲۴۔ مولانا جمال میاں: مقدمہ کلیاتِ حسرت (دہلی اڈیشن)، ص ۳۳، ۳۴

ہوئے بلکہ منتظمین کی توقع کے خلاف، حسرت بھی کانفرنس میں شریک ہوئے اور تقریر بھی کی، جس میں انھوں نے کہا:

"ہمارے ادب کو... سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہیے... جدید ادب کو سوشلزم بلکہ کمیونزم کی بھی تلقین کرنا چاہیے..."[۲۵]

اس کے ساتھ ہی مولانا جمال میاں کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"۱۹۳۶ء میں مولانا حسرت مسلم لیگ کی تنظیم جدید سے وابستہ ہوئے ... کانگرس کی طرف سے کہا جاتا تھا کہ مسلم لیگ صرف نوابوں اور آرام طلبوں کی جماعت ہے مسلم لیگ کی جانب سے مولانا کا نام ان اعتراضات کا مسکت جواب تھا۔"[۲۶]

حسرت کے اس متضاد سیاسی طرزِ عمل کی تاویل اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ:

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کے سیاسی کردار کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ جس پارٹی میں بھی رہے، اس کے لیے کسی نہ کسی منزل پر دردِ سر ضرور بنے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہی، نہ مسلم لیگ۔ جس طرح ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے اجتماعات میں "حریتِ کامل" کی قرارداد پیش کر کے گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں کے لیے نازک صورتِ حال پیدا کر دی تھی، اسی طرح ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ حیدر آباد میں سجاد ظہیر اور کانفرنس کے دوسرے کارکرتاؤں کے لیے مشکل صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ ادب میں عریاں نگاری کا رجحان اس

۲۵۔ بحوالہ سجاد ظہیر: ہماری زبان (علی گڑھ): یکم جنوری ۱۹۶۷ء

۲۶۔ مولانا جمال میاں: متذکرہ

دور میں بڑھ رہا تھا۔ اس کا سلسلہ غالباً حسن عسکری کے افسانے "چائے کی پیالی" سے شروع ہوا تھا جو غالباً ۱۹۳۹ء کے اواخر یا ۱۹۴۰ء کے شروع میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ترجمان "نیا ادب" (لکھنؤ) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ہی عصمت کا افسانہ "لحاف" کسی اور رسالے میں چھپا، جو حسن عسکری کے نہلے پر دہلا تھا۔ عصمت بھی ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھیں اس لیے ان کے افسانے کا ناتا ترقی پسند تحریک ہی سے جوڑا گیا۔ اسی دور میں سعادت حسین منٹو بھی سامنے آئے جو آگے چل کر عریاں نگاروں کے قافلے کے امام سمجھے جانے لگے۔

ان حالات نے ادب میں ترقی پسندی کی تحریک کو خاصا بدنام کر دیا تھا۔ چناں چہ حیدر آباد کی متذکرہ بالا کانفرنس میں اس مضمون کی ایک باضابطہ قرار داد پیش کی گئی کہ فحاشی اور عریاں نگاری کو ترقی پسند تحریک سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ جو افسانہ نگار یا ادیب عریاں نگاری کو اپنا مسلک بناتے ہیں وہ ترقی پسند نہیں ہیں۔ کانفرنس کے جس اجلاس میں یہ قرار داد پیش ہوئی اس کی صدارت پروفیسر احتشام حسین کر رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ "تجویز کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز جو بلند ہوئی وہ مولانا [حسرت] کی تھی[۲۷] اور اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے کسی طرح وہ آمادہ نہ ہوئے۔ بالآخر اس قرار داد پہ بحث ملتوی کرنی پڑی۔"

اسی طرح کی صورت حال حسرت مسلم لیگ میں بھی پیدا کرتے رہے، لیکن وہاں ان کی کبھی چل نہیں پائی۔ ان کی ماضی کی قربانیوں کے پیش نظر جناح صاحب ان کا احترام ضرور کرتے تھے، مگر ان کی کسی قرار داد یا ان کی کسی ترمیم کو انھوں نے مان کے نہ دیا۔

تقسیم ہند کے وقت تک حسرت مسلم لیگ میں رہے۔ مسلم لیگ ہی کی

۲۷۔ احتشام حسین: حسرت کا رنگ تغزل نگار (لکھنؤ) حسرت نمبر: حاشیہ ص ۶۶

ٹکٹ پر ۱۹۴۶ء میں یو پی اسمبلی کے ممبر اور پھر دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسی دور میں ان کی سیاسی زندگی کا عظیم ترین تضاد سامنے آیا۔ مسلم لیگ سے وابستگی کے ساتھ ساتھ انھوں نے سوبھاش بوس سے اپنا ذہنی ربط پیدا کر لیا، اور یہ عین اس وقت کا واقعہ ہے جب دوسری عالمی جنگ کے دوران میں مسلم لیگ برطانیہ کی حلیف بن گئی تھی اور دوسری طرف سوبھاش چندر بوس ہندستان پر حملہ کرنے کے لیے "آزاد ہند فوج" کے نام سے ان ہندستانی سپاہیوں کی فوج مرتب کر رہے تھے جو مشرقی محاذ جنگ پر جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے اور ان کی قید میں تھے۔ حسرت کے ایک قریبی عزیز نے اپنے ایک نجی خط میں راقم کو لکھا ہے کہ:

> "دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں حسرت حیدرآباد میں رہے۔ میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے سی کلاس کے مکان میں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ سوبھاش بوس آزاد ہند فوج کے ساتھ جب ہندستان آئیں گے تو اس وقت ہماری ضرورت ہوگی۔ اس لیے ان ہی کی ہدایت پر ہم یہاں [حیدرآباد میں] ہیں۔ برٹش انڈیا میں رہیں گے تو گرفتار کر لیے جائیں گے۔ یہاں محفوظ ہیں"[۲۸]

نیتاجی سوبھاش چندر بوس ہوائی جہاز کے حادثے میں ختم ہو گئے، لیکن حسرت ان لوگوں میں تھے، جن کو ان کی موت کا یقین نہیں تھا۔ حبیب احمد صدیقی جو ان دنوں کانپور میں سول سپلائی آفیسر تھے اور حسرت سے قریبی تعلقات پیدا کر لیے تھے ان کا بیان ہے کہ حصول آزادی کے بعد تک حسرت کو

> "پورا یقین تھا کہ بوس زندہ ہیں، اور جلد رو نما ہو کر ملک کی سیاست کا رخ بدل دیں گے۔ میں مولانا کی سادہ دلی پر حیران ہوتا اور بار بار

۲۸۔ مکتوب سید اختر حسن۔ اسسٹنٹ سکریٹری، آندھرا پردیش اردو اکیڈمی۔

پوچھتا کہ اگر بوس کے زندہ ہونے کے قرائن کیا ہیں۔ میرے متعدد سوالات پر کہ کیا وہ ہندستان میں ہیں اور اپنے احباب، معاونین یا عزیز دل سے ملے ہیں؟ کیا خود مولانا نے ان سے ملاقات کی ہے؟ اگر زندہ ہیں تو ان کے رونما ہونے کا کون سا وقت آئے گا؟ کیا وطن کی تقسیم کا مسئلہ اتنا اہم نہ تھا کہ یہ وطن کا شیدائی رونما ہونے پر مجبور ہوتا؟ پہلے تو مولانا نہایت شد و مد سے یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ واقعی بوس زندہ ہیں، اور ادھر ادھر کے سنے سنائے قصے بیان کرتے۔ مگر جب لاجواب ہونے لگتے تو کہتے کہ کیا میں اپنی پارٹی کا اہم ترین راز ایک سرکاری ملازم پر ظاہر کر دوں جو فوراً لکھنؤ یا دہلی جاکر جاسوسی کر دے اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دے۔ بس زیادہ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ عنقریب خود اپنی آنکھ سے دیکھ لینا![۲۹]،،

حسرت کی کانگرس سے علاحدگی، کمیونزم سے گہری دلچسپی، مسلم لیگ میں دوبارہ شمولیت، سو بھاش چندر بوس سے والہانہ عقیدت اور فارورڈ بلاک سے پرجوش وابستگی کو ان کی بے مقصد سیاسی صحرانوردی ہی سے تعبیر کرنا صحیح نہ ہوگا۔ حقیقتاً ان کے لاشعور میں گاندھی جی کے مقابلے میں ناکامی کا احساس چھپا ہوا تھا، اور جہاں بھی ان کو گاندھی جی کی مخالفت کا شائبہ نظر آتا تھا، وہاں وہ پہنچ جاتے تھے

گاندھی جی کے فلسفے کو دو ہی آدمیوں نے چیلنج کیا تھا، جناح نے اور حسرت نے۔ جناح کی مخالفت میں ان کی اعتدال پسندی کو دخل تھا، جو انھیں گوکھلے سے ملی تھی، جن کی قیادت میں اپنی سیاسی زندگی کا انھوں نے آغاز کیا تھا جن کو نمونہ بنا کر ابتدائی دور میں، ،،مسلم گوکھلے،، بننے کے وہ آرزومند رہے تھے۔ حسرت کی مخالفت ان کی انتہا پسندی کی دین تھی، جو تلک سے ان کو ملی

۲۹۔ حبیب احمد صدیقی: حسرت موہانی: اردو ادب حسرت نمبر: ص ۵۷

تھی، جن کی پیروی کو وہ اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھتے تھے:

نازتیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو

جناح کی اعتدال پسندی گاندھی جی کی مخالفت میں ان کو زیادہ دور نہ لے جا سکی اور جلد ہی وہ میدان چھوڑ گئے۔ لیکن حسرت دوسری مٹی کے بنے تھے، چند برسوں تک وہ اڑے رہے۔ خود گاندھی جی کو ایک موقع پر اعتراف کرنا پڑا کہ "حسرت کس غضب کے لڑنے والے ہیں!"

جناح نے ۱۹۲۱ء میں اور حسرت نے ۱۹۲۶ء میں کانگرس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اس کے بعد نہ تو جناح اور گاندھی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ نہ حسرت اور گاندھی۔ جناح اور حسرت دونوں کے دلوں میں گاندھی جی کی طرف سے جو گرہ پڑ گئی تھی، وہ کبھی کھل نہ سکی بلکہ زمانہ جوں جوں گزرتا گیا، وہ مضبوط تر ہوتی گئی۔

جناح وقت شناس ہونے کے ساتھ ساتھ قیادت کی اہلیت اور تنظیمی صلاحیت کے بھی مالک تھے۔ حسرت ان صفات سے محروم تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جناح موقع پاکر جب دوسری بار گاندھی جی کی مخالفت کے لیے میدان میں آئے تو حسرت بھی جاکر ان ہی کے جھنڈے تلے کھڑے ہوگئے۔

یوں تو ۱۹۲۵ء کے بعد کمیونزم اور اسلام میں مماثلت کے اپنے عقیدے سے حسرت کبھی بھی دست کش نہیں ہوئے، تاہم مسلم لیگ سے وابستگی کے دورِ ثانی (۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء) میں اس کی لے مدھم سی رہی اور سوشلزم کو نصب العین بنانے کا مسلم لیگ سے انھوں نے کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ لیکن حصول آزادی کے بعد سوشلزم سے ان کی دیرینہ وابستگی کی رگوں میں نئے خون کی گردش شروع ہوئی۔ چناں چہ آئین ساز اسمبلی میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ سوشلزم کے اصولوں پر ہندستان کا آئین مرتب کیا جائے۔ ان کی آواز جب صدا بہ صحرا ثابت ہوئی تو احتجاجاً آئین کے مسودے پر دستخط کرنے سے انھوں نے انکار

کر دیا۔ انھیں اس امر کا یقین تھا کہ:

لازم ہے یہاں غلبۂ آئین سویت
وہ ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

ان کا یہ یقین غلط بھی نہیں تھا۔ آئین کے نفاذ کے "دس بیس برس" کے اندر ہی ملک نے سوشلسٹ طرزِ زندگی کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا۔

بیسویں صدی کے ہندستان کی سیاسی تاریخ نے چند ہی ایسی شخصیتیں پیدا کی ہیں جن کے سیاسی مزاج کے چڑھاؤ اور اتار کا مطالعہ اتنا دلچسپ ہوگا جتنا کہ حسرت کا ہے۔ وہ ایک انوکھی سیاسی شخصیت کے مالک، بلکہ آپ اپنی مثال تھے وہ نہ تو کسی کے پیرو تھے، اور نہ ان کا کوئی پیرو تھا۔ حسرت جیسی شخصیت کے لیے یہ بات عجیب سی معلوم ہوگی، مگر ہے حقیقت پر مبنی کہ ان کا مقلد، یا ان کے افکار سے کلی اتفاق رکھنے والا، علاوہ بیگم حسرت کے، اور کوئی نہیں تھا۔ اور بیگم حسرت کی وفات کے بعد حسرت یکہ و تنہا رہ گئے تھے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب تر ہے کہ ملک کے قوم پرست سیاسی حلقوں میں حسرت کو ہمیشہ قدر و احترام کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حسرت نے اپنی سیاسی زندگی کے نصف اول (۱۹۰۳ء تا ۱۹۲۶ء) میں بڑی استقامت کے ساتھ جہدِ آزادی میں حصہ لیا تھا، اور اسی جرم میں برطانوی ہند کے جیل خانوں میں جس غیر انسانی سلوک سے وہ دو چار ہوئے تھے، اس کا اندازہ "مشاہداتِ زنداں" سے ہوتا ہے۔ حسرت کی بیٹی نعیمہ کا بیان ہے کہ:

"گھر میں گاہے گاہے پرانی باتوں کا ذکر بھی آجایا کرتا تھا، تو مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ لوگ اب جیل جانا بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اب تو وہ صرف ایک پابندی ہے، اگر جیل میں چند معاملات بھی ایسے پیش آ دیں، ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں [جو] ان پر [؟] گزر چکے ہیں تو لوگوں

کو پتہ چلے کہ جیل کیا چیز ہے۔"[30]

حسرت کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے اور یقیناً یہ ان کی وہ سیاسی پونجی تھی، جو ان کی سیاسی زندگی کے دوسرے دور (۱۹۲۷ء تا ۱۹۵۱ء) میں ان کے بہت آڑے آئی۔ اسی سلسلے میں ان کا ایک اور سابقہ اقدام بھی قابلِ ذکر ہے، جس نے ان کی سیاسی پونجی میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا۔ یہ تھا ان کا مکمل آزادی کا مطالبہ جسے انھوں نے سب سے پہلے پیش کیا تھا، اور جس کا ہندستان کی جدوجہد آزادی کے ہر تذکرہ نگار نے اعتراف کیا ہے، خواہ وہ چند ہی سطروں میں کیوں نہ ہو۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندستان کی آئین ساز اسمبلی میں جب پہلی بار تقریر کرنے کے لیے حسرت کھڑے ہوئے، تو پورے ایوان نے تالیاں بجا بجا کر ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اس وقت آئین ساز اسمبلی کے نائب صدر۔ آر۔ سی۔ مکرجی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے حسرت کے اس پرتپاک خیر مقدم کو دیکھ کر کہا تھا:

> "مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ یہ ایوان اس ملک کے عظیم مولانا حسرت موہانی کی عظیم الشان قربانیوں کو بھولا نہیں ہے۔ موصوف پہلے شخص تھے، جنھوں نے مادرِ وطن کے لیے آزادیٔ کامل کا مطالبہ کیا تھا۔"

حسرت کی سیاسی زندگی کا دوسرا اور آخری دور ۱۹۲۷ء سے شروع ہو کر ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء کو ان کی وفات پر ختم ہو گیا۔ ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے اس موقع پر جس انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اس پر حسرت ہی کا یہ مقطع صادق آتا ہے:

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا
وہ وضع پارسا اس کی، وہ عشقِ پاکباز اس کا

۳۰۔ حسرت موہانی کی کہانی نعیمہ کی زبانی: ص ۳۱

گل کرسٹ اور اس کا عہد

(بعد ترمیم و اضافہ)

مولف: عتیق صدیقی

یہ دوسرا اڈیشن آفسٹ پر چھپا ہے۔ اس میں بعض ایسی معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے جو پہلی اشاعت کے وقت مصنف کے سامنے نہیں آئی تھیں عتیق صاحب کی اس کتاب کو علمی و تدریسی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ کتاب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

قیمت عام ایڈیشن ۲۰ روپے

لائبریری ایڈیشن: ۲۵ روپے

:- ناشر :-

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی

صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات

(۱۸۵۳ء — ۱۹۴۸ء)

مرتب: عتیق صدیقی

صوبہ شمالی و مغربی کے دیسی مطابع کی یہ کچھ برسوں کی سرگذشت جو ایک سو ساٹھ مطبوعہ صفحات پر پھیلی ہے اترپردیش، دلی اور پنجاب کے ان علاقوں کی جو اس وقت صوبہ شمالی و مغربی کے حدود میں شامل تھے صحافتی و ادبی تاریخ کے بیش بہا اور مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، ان میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، وہ یقیناً ہمارے لیے قابل قدر ہیں۔

قیمت: پندرہ روپے

ناشر

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی

حواشی وحوالے

۱۔ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کا اجلاس سورت میں منعقد ہوا تھا۔ وہیں پہلی بار کانگریس دو گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک کے لیڈر تلک تھے۔ اس کو گرم دل کہا جاتا تھا اور دوسرے کے لیڈر گوکھلے تھے، جو نرم دل کے نام سے موسوم کیا جانے لگا تھا۔ اول الذکر دل کے پرجوش حامی حسرت بھی تھے، اور انھوں نے بھی تلک کے ساتھ عارضی طور پر کانگریس سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔

۲۔ اردوئے معلّی: جلد ۱۰ نمبر ۷: دسمبر ۱۹۰۹: ص ۹ و ۱۰

۳۔ اگست ۱۹۰۸ء کے ماہنامہ زمانہ (کانپور) میں " ہندو مسلمانوں میں اتفاق " کے عنوان سے ایک مضمون ملتا ہے جس کے مصنف کا نام " لالہ لال چند تلک سابق ایڈیٹر تہ کاری ،، لکھا گیا ہے۔ اس سے، نیز حسرت کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر ہونے کے علاوہ فلک ان کے ہم مشرب صحافی بھی تھے اور ۱۹۰۷ء سے قبل لاہور کے اس مشہور جیل کی بھی دو ہوا کھا چکے تھے، جو آگے چل کر بہت سے انقلابیوں کے سفر کی بھی منزل بنا۔

فلک دوارکا پرشاد افق لکھنوی کے شاگرد تھے۔ افق کی صد سالہ برسی (۱۹۶۴) کے موقع پر " لمعات افق ،، کے نام سے ایک یادگاری مجموعہ شائع ہوا تھا، جس میں ان کے شاگردوں کے مختصر حالات بھی قلم بند کیے گئے تھے۔ اس مجموعے کی وساطت سے فلک کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات کا ہمیں علم ہوتا ہے:

" کسی زمانے میں پنجاب کے سرفروش قومی شاعر تھے... لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ کے ساتھ کام کرنے والوں میں تھے۔ کئی مرتبہ جیل گئے اور آخری بار عمر قید کی سزا ہوئی۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں جیل

سے رہا ہوگئے۔ رہا ہونے کے بعد ان کی ادبی و سیاسی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔
"آج کل [۱۹۶۴ء میں] دہلی میں مقیم ہیں۔
"غالباً اپنا اخبار بھی نکالا تھا۔ پہلے کچھ اور تخلص تھا افق صاحب
کی شاگردی نے انھیں فلک بنا دیا۔ کسی زمانے میں اقبال نے فلک
کے بارے میں کہا تھا:

"بلندی تو فلک کا خاصہ ہے

"ظفر علی خاں بھی ان کے مداح تھے... کسی زمانے میں فلک کی شاعری
سے تمام ہند کی فضا گونجتی تھی...

بھوک سے کیوں کر نہ تڑپیں ہند کے بچے فلک
کھینچ کر ریلی برا دردانہ دانہ لے گیا

"پنجاب کے کورس میں بھی ان کا کلام شامل کیا جا چکا ہے۔ کلام فلک،
دجام فلک، [اور] 'پیام فلک' کے نام سے کلام کے کئی مجموعے شائع
ہو چکے ہیں۔ لاہور میں نیاس لیتکالہ کے مالک بھی رہے۔ ۱۹۱۷ء سے
۱۹۱۹ء تک رسالہ نظارہ نکالا۔ مہا بھارت ناول کے پیرائے میں لکھی
پنجابی میں بھی شعر کہتے تھے...

۔ لمعات افق: ص ۱۰۴ تا ۱۰۶

۴۔ حسرت کے بڑے بھائی کا نام سید روح الحسن تھا۔ "ضلع ناندیر ریاست حیدرآباد
میں ممتاز وکیل تھے۔"

۔ حسرت موہانی کی کہانی نعیم کی زبانی: ص ۱۰۹

۵۔ اردوئے معلّٰی: جلد ۱۱ نمبر ۱: جنوری ۱۹۱۰ء: ص ۹، ۱۰

۶۔ ایضاً: جلد ۱۱ نمبر ۲: فروری ۱۹۱۰ء: ص ۹، ۱۰

۷۔ ایضاً: جلد ۱۱ نمبر ۳: مارچ ۱۹۱۰ء: ص ۸، ۹

۸۔ حسرت کے والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔

۹۔ 'سوامی شوانند' کے عنوان سے حسرت نے حسب ذیل مضمون لکھا تھا۔

—— سڈیشن کے مقدمات اور تعلیم یافتہ اخبار نویسوں کے مبتلائے مصیبت ہونے کے واقعات گذشتہ دو سال کے عرصے میں اس قدر کثرت سے پیش آئے کہ لوگوں نے بالعموم ان کی جانب زیادہ توجہ کرنا ہی ترک کر دیا۔ حب وطن کے جرم میں سزایاب کتنے ہی نوجوان آج فرنگی قید خانوں میں اس تکلیف اور کس مپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں کہ ان کے چند اعزا و اقربا کے سوا اور کسی شخص کو کبھی یاد تک نہ آتی ہوگی، جس طرح موت سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مرنے والے کی یاد دلوں سے فراموش ہو جاتی ہے اسی طرح سے ان گرفتارانِ بلا کو بھی لوگوں نے گویا مردہ سمجھ لیا ہے حالاں کہ ان میں سے بعض مردانِ خدا اس درجہ کے لوگ ہیں کہ صفاتِ انسانی ان کی ذات پاک کے ساتھ نسبت رکھنے پر یقیناً فخر کرتے ہوں گے۔ وطن پرستی، حریت پسندی، آزاد خیالی، بلند حوصلگی، بے تعصبی، خلوص اور خدا آگاہی ان جملہ صفات کا مجموعہ کسی ایک شخص کی ذات میں یقینی طور پر بہ آسانی مل سکتا ہے تو وہ سوامی شوانند کی ذات ہے جس کی نسبت قید ہونے کے بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ آج کل بنارس کے سنٹرل جیل میں معتکف ہیں۔

راقم حروف کو قیدِ فرنگ سے اضطراری طور پر جتنے ظاہری اور باطنی و روحانی فوائد حاصل ہوئے ان میں سوامی جی سے حصولِ ملاقات کی عزت بھی ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے، حق یہ ہے کہ ایسے برگزیدہ لوگوں سے ربط و ارتباط محبت و اتحاد پیدا کرنے کے عوض ایک سال کیا سالہا سال کی قید بھی کوئی چیز نہیں۔ کیوں کہ قید کی تکلیف تو عارضی ہوتی ہے اور زمانۂ قید کے ساتھ ختم ہو جایا کرتی ہے لیکن خاصانِ خدا کی صحبت و معیت سے روح کو جو لازوال صفائی اور بلندی حاصل ہو جاتی ہے اس کا اثر تمام عمر یقیناً باقی رہ جاتا ہے

۔ سوامی جی ماہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں بہ مقام امراد تی سڈیشن قانون کا شکار ہوئے اور صرف ایک یاد و قومی نظموں کی اشاعت کے جرم میں سات سال عبور دریائے شور کی سزا لے کر امراد تی سے ناگ پور اور ناگ پور میں کچھ روز رہنے کے بعد الہ آباد سنٹرل جیل میں تبدیل ہو کر اسی شب کو پہنچے جس کی صبح کو راقم مضمون بھی علی گڑھ سے الہ آباد پہنچا۔ جیل میں نئے آنے والے قیدیوں کا ہر صبح کو ملاحظہ ہوا کرتا ہے۔ چناں چہ اس تقریب سے پہلے ہی ہم دونوں کو یک جائی کا موقع حاصل ہوا۔ اور ہم خیالی وہم رنگی کی تاثیر نے ہمارے دلوں میں خلوص و یک جہتی کا ایسا جذبہ منٹوں اور گھنٹوں میں پیدا کر دیا جس کے لیے دنیائے محبت میں سالہا سال کی مدت بھی قلیل شمار کی جاتی ہے۔

پہلے ملاحظہ کے بعد دوسرا ملاحظہ مستقل جائے قیام اور قسم مشقت کی تجویز کے لیے دس بارہ روز کے بعد ہوتا ہے۔ کیوں کہ قیدیوں کی زیادتی کے باعث نئے آنے والوں کا نمبر اس سے قبل نہیں آسکتا۔ یہ درمیانی ایام ہم لوگوں نے "پرانی تکلیف" کے دوسرے نمبر میں محض اتفاقی طور پر یک جا بسر کیے۔ کیوں کہ دو پولٹیکل قیدیوں کے ایک جگہ نہ رکھنے کی پالیسی پر اگر حکام زنداں پہلے ہی سے کاربند ہوتے، جیسا کہ دس ہی بارہ دن کے بعد ہوئے تو اس یک جائی کی بھی نوبت نہیں آتی، پرانی تکلیف، کا دوسرا نمبر دہ مقام ہے جس کی سلاخ دار کوٹھریوں میں شورہ پشت اور قوی ہیکل قیدی رکھے جاتے ہیں۔ لوگ وہاں جانے سے گھبراتے ہیں، لیکن ہم نے اس نمبر کو پسند کیا۔ کیوں کہ عام قیدیوں کی طرح بڑے بڑے ڈاکوؤں اور بد معاش قیدیوں کے اخلاق و عادات ذلیل نہیں ہوتے اور جو شخص ان لوگوں کے درمیان رہتا ہے اسے ملازمان جیل بھی زیادہ تنگ کرنے سے ڈرتے ہیں۔

سوامی شوانند مسٹر تلک کے سچے پیرو ہیں اور ایک عرصہ سے ترک دنیا کر کے

طریق نقرا اختیار کر چکے ہیں۔ چناں چہ نوعیت جرم کے مقابلے میں زیادتی سزا کے وجوہ میں غالباً آپ کے سنیاس کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ سوامی جی برہمن ہیں لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ راقم کو بھی مسٹر تلک کی پیروی کا فخر حاصل ہے تو انھوں نے مذہب عشق کے اصول کے مطابق تیو ذات در واج کو خیرباد کہہ کر اخوت و مروت کی ایسی مثال پیش کی جس کی تقلید ہر وطن پرست پر فرض ہے۔

جب تک ہم دونوں ساتھ رہے ہمارا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا بھی یک جا رہا یہاں تک کہ باوجود اختلاف مذہب ہمارے اس قلبی اتحاد کو دیکھ کر لوگ حیرت کرتے تھے۔ سوامی جی اپنی مادری زبان مرہٹی کے علاوہ انگریزی ہندی اور سنسکرت میں بھی معقول استعداد رکھتے ہیں اور فن موسیقی میں تو انھیں کامل کہنا بے جا نہ ہوگا۔ شعر و شاعری سے ان کے دل و دماغ کو طبعی مناسبت تھی۔ چناں چہ جس نظم پر انھیں سزا ہوئی وہ بھی خود ان ہی کی تصنیف تھی۔ مسٹر تلک کی شان میں انھوں نے مرہٹی اور ہندی کی بہت سی چیزیں کہی ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے درد انگیز لہجے میں ان اشعار کو سناتے تھے تو تمام سننے والوں کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ اب بھی جب اس عہد دل فریب کی یاد آتی ہے تو بے اختیار دل سے آہ نکل جاتی ہے۔

عہد یک عمر فراغت سے بھی بہتر گذرا
وہ جو ایک لحظہ تیری یاد میں ہم پر گذرا

بابو اربند دگھوش نے جیل سے نکل کر شری کرشن مہاراج کے درشن کا جو حال ظاہر کیا ہے اسے بعض کور باطن محض ایک فرضی افسانہ قرار دیتے ہیں لیکن ہم کو ان کے بیان کی صحت میں مطلق شبہ نہیں اس لیے کہ ہم نے بہ ذات خود اس عجیب و غریب اثر کو محسوس کیا جو سری کرشن کا نام آتے ہی فوری طور پر سوامی جی کے قلب پر اور بطور عکس تمام حاضرین کے دل

پر یقیناً طاری ہو جاتا تھا۔
اس سرچشمۂ محبت کی شان میں سوامی جی کی نغمہ سنجی کا پر لطف اثر ابھی تک راقم کے دل میں موجود ہے اور غالباً مدت العمر موجود رہے گا۔

سانورے دبنواری موکو آسا تہاری

رات کو سونے سے قبل ہم دونوں مسٹر تلک کے ساتھ اپنی اپنی ارادت مندیوں کی کیفیت اور اپنی اپنی پولٹیکل زندگی کے دیگر حالات بیان کر کے اکثر دل میں سوچا کرتے تھے کہ اگر ہمارے قید کا زمانہ اسی صورت سے برابر بسر ہو تو ایسی گرفتاری ہزار آزادیوں سے بہتر ہے، لیکن افسوس ہے وہ صحبت بہت جلد برہم ہو گئی اور دس دن کے بعد ہم دونوں اس طرح سے علاحدہ علاحدہ رکھے گئے کہ پھر کبھی الہ آباد جیل میں نہ مل سکے۔

دوسرے قیدیوں کے ذریعے سے سلسلہ سلام و پیام البتہ جاری رہا، یہاں تک کہ ایک دن معلوم ہوا کہ دفعتاً سوامی جی الہ آباد سے بنارس بھیج دیے گئے، بنارس میں بھی سوامی جی کا وہی رنگ وہی حال ہے چناں چہ ماہ گذشتہ میں بہ تقاضائے محبت جب راقم ان سے ملنے کے لیے بنارس گیا تو انھیں بدستور راضی برضائے الٰہی و بادۂ محبت وطن پرستی سے سرشار پایا۔

۱۰۔ اردوئے معلّٰی: جلد ۱۱ نمبر ۴: اپریل ۱۹۱۰: ص ۷ تا ۱۰

۱۱۔ ایضاً : جلد ۱۱ نمبر ۵: مئی ۱۹۱۰ : ص ۱۳، ۱۴

۱۲۔ انسان کو جس چیز سے منع کیا جاتا ہے، اسی کی اس کو خواہش ہوتی ہے۔

۱۳۔ یہ سات اشعار کی مسلسل غزل ہے جو کلیات حسرت (حصہ اول) میں ملتی ہے۔ اس کے تین شعر یہ ہیں

الوداع اے ماہِ رمضاں الوداع الوداع اے مونسِ جاں الوداع
تجھ سے روشن تھا سوادِ ملکِ جاں اے چراغِ نورِ ایماں الوداع

عین راحت تجھ سے تھی تکلیفِ قید   اے انیسِ اہلِ زنداں الوداع

۱۴۔ اردوئے معلّٰی : جلد ۱۱ نمبر ۶ : جون ۱۹۱۰ : ص ۱۴ تا ۱۸

۱۵۔ ایضاً : جلد ۱۱ نمبر ۷ : جولائی ۱۹۱۰ : ص ۱۶/۱۷

۱۶۔ یہ غزل کلیات میں نہیں ہے۔ غالباً نذرِ زنداں ہوگئی تھی۔

۱۷۔ اردوئے معلّٰی : جلد ۱۱ نمبر ۸ : اگست ۱۹۱۰ء : ص ۸۔۱۱

آلہ سننے کا شوق عرصے تک باقی رہا۔ دوسری قید کے دوران میں جب کھونٹے میں نظر بند کیے گئے "تو اکثر گاؤں کے تمام بچوں کو اکٹھا کر کے قدیم رزمیہ قصے، جس کو الہ کہتے ہیں سننے سنانے کا انتظام کرتے"

—— رابعہ بیگم : حسرت کی خانگی زندگی : اردو ادب حسرت نمبر

۱۸۔ اردوئے معلّٰی : جلد ۱۱ نمبر ۹ : ستمبر ۱۹۱۰ : ص ۹،

۱۹۔ ایضاً : جلد ۱۱ نمبر ۱۰ : اکتوبر ۱۹۱۰ء : ۹ تا ۱۶

اس جگہ ایک طویل حاشیہ تھا، جسے عبارت کا جزو بنا دیا گیا ہے۔

۲۰۔ ردولی پہنچ کر حسرت نے شاہ مصطفےٰ احمد مرحوم کے یہاں قیام کیا، جو راقم کے والد کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور علی گڑھ کالج میں حسرت کے ہم عصر اور دوست تھے۔ وہ ان دنوں علی گڑھ ہی میں ملازم تھے۔ علی گڑھ واپسی پر ڈاکٹر ضیاء الدین نے اس امر کی ان سے جواب طلبی کی تھی کہ حسرت کو انھوں نے اپنا مہمان کیوں بنایا تھا۔

۲۱۔ اردوئے معلّٰی : جلد ۱۱ نمبر ۱۱ : نومبر ۱۹۱۰ : ص ۱۱ تا ۱۶

۲۲۔ ایضاً : جلد ۱۱ نمبر ۱۲ : دسمبر ۱۹۱۰ : ص ۱۳ تا ۱۵

۲۳۔ ایضاً : جلد ۱۲ نمبر ۱ : جنوری ۱۹۱۱ء : ص ۱۱ تا ۱۳

اس شمارے کی فہرست مضامین میں اس قسط کو آخری قسط لکھا گیا ہے گویا اس جگہ مشاہدات زنداں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

۲۴۔ اردوئے معلّٰی : جلد ۱۱ نمبر ۴ : اپریل ۱۹۱۰ : ص ۱۲ تا ۱۵

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

مولانا حسرت موہانی

ایک مجاہدِ آزادی

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے تین پہلو ہیں۔ ایک تو حسرت چوٹی کے شاعر، غزل کے امام اور اردو شاعری کو نشاۃ ثانیہ کے دور میں ایک نیا موڑ دینے اور اردو غزل کو نیا لہجہ اور اردو ادب کو نئی جہت عطا کرنے والے ایک عظیم ادیب کی حیثیت سے اونچے مقام پر نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کا دوسرا انتہائی نمایاں پہلو اسلام پر ان کا مستحکم ایقان ہے۔ وہ ایک زبردست مجتہد، عالم اور راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے آسمانِ مذہب پر چھائے ہوئے ہیں، اور تیسرا پہلو غاصب مفادات سے عدم مفاہمت پر مبنی ان کی انسان دوست سیاست ہے۔ وہ صوفی بھی تھے اور باغی بھی۔

مولانا کی پیدائش یو۔ پی کے ضلع اناؤ میں، موضع موہان میں ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ یہ علاقہ علم و فضل کے اعتبار سے یو۔ پی کا "خطۂ یونان" سمجھا جاتا تھا۔ خود مولانا کے اہلِ خاندان اور عورتیں بھی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ ذوق کی حامل تھیں۔ دوسرے مولانا کا بچپن ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کا زمانہ ہے۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ میں سر سید نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو علی گڈھ تحریک کی ابتدا تھی۔

ملک میں اب تک ایک پڑھا لکھا متوسط طبقہ پیدا ہو گیا تھا، اور ملک سیاسی، تہذیبی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں لاہور سے نکلنے والے اخبار میں اب ایسی نظمیں شائع ہونے لگی تھیں ــــ

اے ساکنانِ خطۂ ہندوستاں بڑھو
آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں بڑھو
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو
کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو

اسی بیچ میں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ ۱۸۹۴ء میں حسرت موہانی نے اردو مڈل کامیاب کیا اور فتح پور گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ حاصل کر لیا بس یہیں سے حسرت نے شاعری شروع کی، اور حسرت تخلص اختیار کیا۔ اس زمانہ میں ایک طرف برطانوی حکمراں ہندوستان کی صنعتوں کو کچلنے کے لیے ان پر کمر توڑ دینے والے ٹیکس لگا رہے تھے، تو دوسری طرف محبِ وطن قوتیں ان کے خلاف آواز بھی اٹھانے لگی تھیں۔

چنانچہ دسمبر ۱۸۹۴ء میں مدراس کانگریس نے ان ٹیکسوں کے خلاف احتجاج کیا اور عوام سے اپیل کی کہ دیسی کپڑا استعمال کریں۔ مختلف ٹیکسوں کے خلاف احتجاج اب کانگریس کا رویہ ہو گیا اور سودیشی کے خیالات پروان چڑھنے لگے۔ مولانا حسرت موہانی کے نوجوان اور حساس ذہن پر ان تحریکوں کے اثرات پڑ رہے تھے۔

۱۸۹۷ء میں بال گنگا دھر تلک کو ان کی ایک تقریر کی اشاعت پر "سرکار دشمن" قرار دیا گیا اور انھیں ۱۸ مہینوں کی سزا ہوئی۔ اور یہ تقریر ایک تعلیمی سوسائٹی کے قیام کے موقع پر کی گئی تھی۔ سودیشی کے ساتھ ساتھ قومی تعلیم کا رجحان پیدا ہو چلا تھا۔ دارالعلوم ندوہ بھی اسی زمانہ میں ۱۸۹۸ء میں قائم ہوا۔ اسی سال بنارس میں ایک مدرسہ قائم ہوا جو آگے چل کر بنارس یونیورسٹی بن گیا۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا حسرت نے اول درجہ سے میٹرک کامیاب کیا اور ڈاکٹر ضیاءالدین نے ان کی ذہانت کو پرکھ لیا اور علی گڑھ بلا لیا۔

یہیں سے حسرت نے شاعری کے ساتھ سیاست کی طرف بھی مائل ہونا شروع کیا۔

۱۹۰۲ء تک حسرت کی سیاسی سرگرمیاں اتنی بڑھ چکی تھیں، اور آزادیٔ وطن کا جذبہ اس قدر تیز ہو گیا تھا کہ وہ تین بار آزادی کا نعرہ لگانے پر ایم۔ اے۔ او کالج سے نکالے جا چکے تھے۔ لیکن انھوں نے بہرحال امتحان دیا اور ۱۹۰۳ء میں بی اے پاس کیا پھر علی گڑھ ہی

ہو رہے، اور یہیں سے ایک رسالہ "اردوئے معلّٰی" جاری کیا۔ یہ ادبی کے ساتھ ایک سیاسی رسالہ بھی تھا۔

حسرت پر اس زمانہ کے "گرم سیاست داں" اور مجاہد رہنما بال گنگا دھر تلک کا بہت اثر تھا۔ تلک کو حسرت اپنا گرو مانتے تھے اور ان ہی کی رہنمائی پر ۱۹۰۴ء میں کانگریس میں باقاعدہ شریک ہو گئے اور یہی ۱۹۰۵ء میں بمبئی میں منعقدہ کانگریس کے اجلاس میں بحیثیت مندوب شریک بھی ہوئے۔

مولانا حسرت، بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور اروبندو گھوش سبھی گرم دل کے سیاست داں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہیں سے مولانا حسرت بدیسی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی تحریک کے حامی اور مبلغ بن گئے۔ علی گڈھ میں سودیشی اسٹور قائم کیا۔ "اردوئے معلّٰی" میں سودیشی تحریک پر خوب مضامین لکھے اور کانگریس کے نرم دل کے رہنماؤں گوکھلے اور موتی لعل نہرو پر بے لاگ نکتہ چینی کی۔ ۱۹۰۸ء میں "اردوئے معلّٰی" میں انگریزوں کے خلاف ایک سخت مضمون شائع ہوا۔ یہ مضمون تھا "مصری حریت پسند مصطفےٰ کامل کی موت پر"۔ اس مضمون نگار کا نام نہیں چھپا تھا۔ مضمون انگریزوں کو بہت ناگوار گزرا۔ چناں چہ پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ مولانا نے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لی حالاں کہ یہ مضمون اعظم گڑھ کے ایک وکیل اور مشہور قوم پرست رہنما اقبال سہیل کے موئے قلم کا نتیجہ تھا۔ مولانا پر "سیڈیشن" (بغاوت) کا جرم عاید ہوا اور ۴ اگست ۱۹۰۸ء کو دو سال کی قید بامشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ کی سزا ہو گئی۔ اس کے متعلق کہتے ہیں:-

"۔۔۔۔ جب تک ہندوستان میں مجسٹریٹ پولیس کے ہی اعلیٰ افسر رہیں گے اور خفیہ پولیس کی ان جھوٹی رپورٹوں کو سن کر جن کی تردید کا ملزم کو کوئی موقع نہ ملتا ہے نہ مل سکتا ہے، فیصلہ مقدمہ سے قبل ہی رائے قائم کر لیا کریں گے، جب تک وہ خود ایک شخص پر الزام لگائیں، وارنٹ جاری کریں گے اور خود ہی اس کا انصاف کرنے بیٹھیں گے، اس وقت تک فوجداری کے اکثر

مقدمات میں عموماً اور پولیٹیکل مقدمات میں خصوصاً انصاف یا رہائی کی امید کرنا
اول درجہ کی حماقت ہے۔"

قیدی زندگی کی تلخیوں کو حسرت نے ان مضامین میں بیان کر دیا ہے، جو بعد میں "قید فرنگ"
کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اپنے مضمون "گرفتاری" میں کہتے ہیں کہ بوقتِ گرفتاری حسرت کی شیر خوار لڑکی نعیمہ سخت
علیل تھی لیکن بیگم حسرت نے حسرت کو لکھا

"تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق
خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔"

اپنے مضمون "آغاز قید" میں لکھتے ہیں:۔

"کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیہ اور کرتہ اور ٹوپی پہننے کے لیے،
ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا۔
ایک چھوٹا ایک حملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔"

جیل کی صعوبتوں کا ذکر کیا کیا جائے۔ مولانا سے عینک چھین لی گئی۔ اخبارات اور کتابیں
لے لی گئیں۔ سوائے دیوان حافظ کے باقی ساری کتابیں جلا دی گئیں۔

جب وہ الٰہ آباد جیل لے جائے جا رہے تھے تو کس طرح احباب نے انھیں علی گڈھ
گونڈا یا اور اسٹیشنوں پر دیکھ لیا تھا۔ اور انھوں نے حسرت کے والد کو خبر کر دی۔ وہ حسرت سے
ملنے جیل آئے، لیکن جیل والوں نے انھیں حسرت سے نہیں ملنے دیا۔ حسرت کے والد کو اس
اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ ان کی صحت خراب تو تھی ہی، وہ رحلت فرما گئے اور حسرت کو دیدار
تک نصیب نہ ہوا۔

ادھر علی گڈھ میں جرمانے کی رقم وصول کرنے کے لیے حسرت کا سارا کتب خانہ نیلام
رکھ کر بازار میں لایا گیا اور انتہائی بے رحمی سے تباہ کر دیا گیا۔

جیل میں حسرت کو روزانہ ایک من گیہوں اور چنا پینا پڑتا۔ دوسرے قیدیوں کو تو بیرایت
تھی کہ کچھ مہینوں کی اس مشقت کے بعد ان کا کام بدل دیا جاتا۔ لیکن حسرت کو جیل کی ساری مدت

اسی مشقت میں گزارنی پڑی۔ حالانکہ اتنا چھوٹا تھا کہ جسم اسقل کا بیشتر حصہ ننگا ہوتا اور نماز نہیں پڑھی جا سکتی تھی۔ لیکن مولانا حسرت اسی حالت میں نماز پڑھتے۔ چارہ نہیں تھا۔ روٹی جو ملتی اس کا یہ حال تھا :۔

"روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے دوپہر کو ابلی ہوئی بے ذائقہ ارہر عموماً اور بے روغن و مرچ ملتی ہے اور شام کو چولائی کا ساگ جس کی ادنیٰ صفت یہ ہے کہ جانور بھی جانے پر کوے بھی اسے نہیں سونگھنے۔"

اس کے برخلاف گورے قیدیوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک ہوتا کہ انہیں علیحدہ کمروں میں رکھا جاتا جس سے لگا ہوا بیت الخلا ہوتا، فرنیچر، صابن اور تولیہ اتا۔ کپڑے دھونے اور پنکھا جھلنے کے لیے ہندوستانی قیدی مقرر ہوتے۔

جیل ہی میں جب یہ اطلاع ملی کہ جج دادر نے تلک کو سزا دی ہے تو یہ رباعی کہی :۔

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور
کیا خاک انھیں داد گری کا ہو شعور
انصاف کے دشمنوں کا دادر ہے لقب
برعکس نہند نام زنگی کا فور

اپنی ہی جیل کی زندگی کے بارے میں حسرت نے کہا ہے :۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

جیل میں جو کچھ کہا ہے، اس سے ان کی بلند ہمتی، اور اولوالعزمی ظاہر ہوتی ہے۔

میں غلبۂ اعدا سے ہراساں نہیں حسرت
ہے مدِ نظر شیوہ حسینؓ ابنِ علیؓ کا

روح آزاد ہے، خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بیکار

جورِ پیہم نہ کرے شان توجہ پیدا
دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

ہم قول کے صادق ہیں، اگر جان بھی جاتی ہو
واللہ کبھی خدمتِ انگریز نہیں کرتے

رسمِ وفا دیکھئے کامیاب کب تک ہے
حبِّ وطن مستِ خواب کب تک ہے

حق سے بہ عذرِ مصلحتِ وقت یہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر

مولانا حسرت موہانی کو عوام پر بھرپور اعتماد تھا اور ان لوگوں پر کس کر طنز کرتے تھے جو عوام کو جاہل اور سیاست فہمی کے لیے نااہل سمجھتے تھے۔ جیل میں ساتھی قیدیوں سے بات کرتے تھے۔ "قیدِ فرنگ" میں شامل اپنے مضمون "قیدیوں کی نفسیات" میں کہتے ہیں۔

"خواص کا غرور اور عوام کے انکسار کی بدولت دونوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کی نوبت ہی نہیں آنے پاتی۔ ورنہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ جمہورِ اہلِ ہند میں سیاسی اصول کو سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد کافی مقدار میں موجود ہے۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر کہتے ہیں۔

"سودیشی، بائیکاٹ، قومی تعلیم اور پنچایت کے اصولوں کو عوام نے بلا تکلف سمجھا اور پسند کیا۔ برخلاف اس کے موجودہ نظامِ حکومت کی اصلاح اور عرض و معروض کی پالیسی کو ان سب نے بالاتفاق مہمل قرار دیا اور اس

قسم کے غلط اصول کی پیروی خبط اور تضیع اوقات سے تعبیر کیا۔"
حسرت کو تلک سے بے پناہ عقیدت تھی اور تلک ہی کے وہ سیاسی پیرو تھے۔ تلک پر ایک نظم میں کہتے ہیں۔

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبِّ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادی جذبات کی
تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و صفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ ہند
خدمتِ ہندوستاں میں کلفتِ قید و محن
ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی
تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن
تو نے خودداری کا پھونکا تلک ایسا افسوں
اک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن
ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِّ ذوالمنن

۱۹۱۰ء میں حسرت رہا ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس شروع ہوئی۔ اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ ترکوں اور عربوں نے متحد ہو کر اٹلی کا مقابلہ کیا۔ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت بڑھنے لگی کہ وہ اٹلی کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ حسرت کہتے ہیں۔

قبضۂ یثرب کا سودا دشمن کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبر میں ہے
جورِ یورپ ہے بنا بیداریِ اسلام کی
خیر ہے در اصل یہ با آنکہ شکلِ شر میں ہے

بھی نہیں۔ مولانا حسرت موہانی اس زمانے میں علی برادران کے ساتھ "انجمن خدامِ کعبہ" اور "ہلالِ احمر" کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ وہ ملک بھر میں آزادیِ وطن پر تقریریں کرتے تھے۔

۱۹۱۲ء میں جنگِ بلقان شروع ہوئی۔ مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں۔ مولانا حسرت، مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ ترکی کی حمایت میں جلسے منعقد کرنے اور چندے جمع کرنے میں پیش پیش تھے۔ اسی زمانے میں مولانا نے کہا :-

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
سمجھتے ہیں سب اہلِ مغرب کی چالیں
مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بیکار ہو کر
ابھی ہم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب
بتا دو ذرا انھیں گرمِ پیکار ہو کر
فریب و دغا کے مقابل ہیں ہم بھی
نکل آؤ بے رحم و خونخوار ہو کر

مولانا حسرت کی سرگرمیاں انگریز حکمرانوں کو کانٹا بن کر کھٹک رہی تھیں۔ چناں چہ ۱۲ رمئی ۱۹۱۳ء کو حسرت کو پریس نوٹس ملی کہ تین ہزار کی ضمانت جمع کرائی جائے۔ مولانا کے لیے یہ ممکن نہیں تھا اور ۱۹ رمئی ۱۹۱۳ء کو پریس کی کاپیاں پتھر سب ضبط کر لیے گئے اور تین ہزار روپوں کے لیے ساری ملکیت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مولانا آزاد نے "الہلال" میں تین ہزار کی ضمانت طلبی کو سخت زیادتی بتاتے ہوئے تحریر فرمایا :-

"گورنمنٹ اس سے بے خبر نہیں کہ اردو پریس اور اس کے مالک کی حالت کیا ہے۔ حسرت موہانی جب قید سے رہا ہو کر آیا تو کوئی چیز اس دنیا میں باقی نہ تھی جو اس کے لیے ذریعۂ تقویتِ مال ہوتی۔ دو ڈیڑھ روپیہ ماہوار کا ایک جھونپڑا

ہے، اور اندر ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے .... اندر وہ فقیرِ حریت معہ اپنی
کوہ عزم ثبات بیوی کے رہتا ہے اور باہر کاٹھ کا دستی پریس اور دو چار
پتھر ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اُردوئے
معلّٰی کی کاپیاں لکھی ہیں، خود ہی پتھر پر جمائی ہیں اور خود ہی پریس چلا کر
چھاپا ہے۔ .... اور اس سے دو وقت کی روٹی کھا کر
نشۂ آزادی کی بے خودی اور دولتِ لازوالِ حق و صداقت کے غنائے
غیر فانی سے مست رہتا ہے۔"

اگست ۱۹۱۳ء میں کان پور کی مسجد کی شہادت کا المیہ ہوا جب کہ سڑک کو سیدھی کرنے کے بہانے میونسپلٹی نے انگریز گورنر کی شہ پا کر مسجد کے ایک حصے کو شہید کر دیا، ہزاروں مسلمان مردوں اور عورتوں اور بچوں نے منہدم حصے کو اینٹوں سے چننا شروع کر دیا اور ساتھ ہی وہی دعا پڑھتے جاتے تھے جو تعمیرِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر تھی۔ اس نہتے مجمع پر فائرنگ کا حکم ہوا، اور ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے شہید ہوئے۔ اس واقعہ نے مسلمانوں میں زبردست غصے کی لہر پیدا کر دی اور احتجاجی تحریک چل پڑی۔ شبلی کی نظم "ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں" اور "الہلال" میں سید سلیمان ندوی کا لرزہ خیز مضمون آج بھی یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی سال مسلمانوں کے اندر سر آغا خاں کی بزم سیاست سے بیزار ہو کر گرم دل کے رہنماؤں نے مجلسِ احرار کی بنا ڈالی۔ علی برادران، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی اور دوسرے اس کے رہنماؤں میں تھے۔ اسی وقت سے مولانا حسرت موہانی کو "سید الاحرار" کہا جانے لگا۔

۱۹۱۴ء میں آزادی اور سوراج کی تحریک میں زور پیدا ہو رہا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے حکومتِ برطانیہ کا تختہ اُلٹنے کے "سُرخ رومال" تحریک شروع کر رکھی تھی جس راجہ مہندر پرتاپ، مولوی برکت اللہ بھوپالی اور دہر دیال جیسے نامی لوگ موجود تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی دونوں مکہ شریف میں رہنے لگے۔

لیکن جب انگریزوں کی شہ پاکر شریف مکہ حسین نے امیر اردون فیصل کے ساتھ ترکی کے خلاف بغاوت کردی اور شیخ الہند کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کردیا تو شیخ الاسلام نے بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا، اور ان دونوں کو جزیرۂ مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔

۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی اور ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت رہنماؤں کو دھڑا دھڑ گرفتار کیا جانے لگا۔ مولانا آزاد رانچی میں قید تھے۔ علی برادران چھندواڑہ جیل میں نظر بند تھے۔ مولانا حسرت گرفتاری سے بچ گئے اور علی گڑھ میں احرار کی رہنمائی کرنے لگے۔ مگر ۱۹۱۶ء میں وہ بھی للت پور میں گرفتار کر لیے گئے اور الزام یہ تھا کہ وہ غیر ممالک سے ساز باز کیے ہوئے ہیں۔ یہاں سے وہ جھانسی جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ یہاں سے الہ آباد، پھر پرتاپ گڈھ، اس کے بعد لکھنؤ اور پھر فیض آباد جیل میں منتقل کر دیے گئے لیکن فوراً ہی میرٹھ بھیج دیے گئے، اس پر حسرت نے کہا:

کیا وہ اب نادم ہیں اپنے جور کی روداد سے
لائے ہیں میرٹھ جو آخر مجھ کو فیض آباد سے

اسی زمانے میں مولانا حسرت نے مارکس کی تعلیمات پر نظر کی اور ان پر تبصرہ کیا۔ اسی تبصرہ پر کلکتہ کے برطانیہ نواز اخبار "اسٹیٹسمین" نے اپنی ۷ / مارچ ۱۹۱۸ء کی اشاعت میں لکھا کہ وہ علمی مقالہ نہیں بلکہ سازش کرنے والوں کی ایک آواز ہے جو سلطنت برطانیہ کی فولادی دیواروں سے ٹکرانا چاہتی ہے۔ یہ آواز بلند ہونے سے پہلے ہی ختم ہونی چاہیے کیونکہ یہ آواز ایک ایسے مسلمان کی ہے، جو سلطنت برطانیہ کے وفادار مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

"اسٹیٹسمین" کی اس بوکھلاہٹ پر الہ آباد کے "پائنیر" نے لکھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ آواز ہندستان کی آواز نہیں، یہ محض ایک شخص کی آواز ہے، جو صدا بصحرا ثابت ہو کر رہ جائے گی۔

۱۹۱۸ء میں لارڈ چیمسفورڈ نے ہوم رول کی تجویز پیش کی جسے اعتدال پسندوں نے

تو قبول کر لیا، لیکن آزادی کی تحریک کے انتہا پسندوں نے اسے رَد کر دیا۔ حسرت نے کہا :-

کاغذ کے سمجھے پھول ان کو
جن میں نہیں نام کو بھی خوش بُو

اُے ہندی سادہ دل خبردار
ہرگز نہ چلے تجھ پہ یہ جادو

۱۹۱۹ء میں رسوائے زمانہ رولٹ ایکٹ منظور ہوا جس سے حکومت کو چاہے کسی کو گرفتار کرنے اور جیل میں ٹھونسنے کا اختیار ملا۔ اس کے خلاف ملک بھر میں احتجاج شروع ہوا۔ اپریل کے مہینے میں دہلی میں گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا پھر پنجاب میں ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو گرفتار ہوئے۔ دہلی سے لے کر گجرانوالہ، قصور اور امرت سر تک زبردست مظاہرے ہوئے اور جلیان والا باغ میں ۱۳ اپریل کو جنرل ڈائر نے خون کی ہولی کھیلی۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرت سر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی تھا۔ مولانا حسرت نے لیگ کے اجلاس میں شرکت کی اور برطانیہ کی دل آزار پالیسی کے خلاف جد و جہد میں تیزی پیدا کرنے کے لیے تجویز کو جاندار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ اسی زمانے میں خلافت کانفرنس، جمعیۃ العلماء اور کانگریس کا مشترکہ جلسہ بھی ہوا۔

غرض ہندستان میں اتحاد بھی بڑھ رہا تھا اور فضا بھی گرم ہو رہی تھی۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کے مشورہ پر مسلم زعما کا ایک وفد وائسرائے سے ملنے گیا۔ اس میں حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔ مولانا عبدالباری وغیرہ شامل تھے۔ مولانا آزاد نے وفد میں شرکت سے انکار کر دیا۔ حسرت وفد میں شامل ضرور ہوئے، لیکن جب وائسرائے سے مصافحہ کا وقت آیا تو پیچھے سے کترا کر بغیر مصافحہ کیے چلے آئے۔

اس کے بعد ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی، جو ہندستان کی آزادی کی تحریک میں خلافت تحریک کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس تحریک کے دوران ہندو مسلم اتحاد کے وہ عروج پرور نظارے دیکھے گئے جن سے انگریزی سرکار دہل گئی۔ مولانا حسرت موہانی اس تحریک کے زبردست حامی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ناگپور کانگریس میں جہاں ترک موالات کی تحریک منظور ہوئی تھی، حسرت اور بیگم حسرت دونوں ہی شریک تھے۔

پرنس آف ویلز کی ہندستان میں آمد کی خبر تھی۔ محبانِ وطن اس کے خلاف سنے۔ ملک بھر میں جلسے ہو رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی اس سفر کی مخالفت کی، اور کہا، جہاں بھی پرنس آف ویلز جائے وہاں ہڑتال کرادی جائے۔ یہیں سے مولانا کے سیاسی رجحان میں یہ عنصر بھی ملتا ہے کہ وہ مزدور طبقہ کو جہادِ آزادی میں شریک کرنا چاہتے ہیں اور ہڑتالوں کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنے کے حق میں ہیں۔ چناں چہ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا حسرت اور بیگم حسرت ۱۹۲۵ء کے کان پور والے کانگریس کے اجلاس میں مزدوروں کا ایک جلوس لے کر کانگریس کے پنڈال میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ کسی نے جواہر لال نہرو کو یہ باور کرایا تھا کہ حسرت کانگریس کے اجلاس میں گڑبڑ کرنا چاہتے ہیں۔ جواہر لال نہرو جلوس کے سامنے آکر دونوں ہاتھ اوپر کرکے کھڑے ہوگئے اور اُسے روکنا چاہا۔ بیگم حسرت نے جواہر لال نہرو کو ایک چانٹا لگا دیا۔ نہرو کو معلوم ہوگیا کہ انھیں غلط باور کرایا گیا تھا، اور انھوں نے ضبط سے کام لیا اور بات ختم ہوگئی۔

۱۹۲۰ء میں حسرت موہانی اور بیگم حسرت نے کانپور میں رہائش اختیار کرلی تھی، اور علی گڑھ چھوڑ دیا تھا۔ بیگم حسرت، مولانا حسرت کا ہاتھ بٹاتی تھیں، اور کانگریس کی مجلس عاملہ کی رکن بھی تھیں۔

۱۹۲۱ء میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے "استقلال مکمل آزادی کی تجویز پیش کردی۔ سید سلیمان ندوی جو اس اجلاس میں موجود تھے، کہتے ہیں

" اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے دو والنٹیر آئے، اور گاندھی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا، جلدی چلئے سبجکٹ

کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال (انڈی پنڈنس) کی تجویز پیش کر دی ہے، اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں، فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بجلی کا گولہ گر پڑا ہے۔ چناں چہ گاندھی جی وغیرہ بھی گھبرائے ہوئے جلسے سے اٹھ کر سبجکٹ کمیٹی میں چلے گئے۔ مگر حسرت کا

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

حسرت موہانی بدستور اپنی بات پر جمے رہے اور نوٹس دیا کہ وہ اس کو کھلے اجلاس میں پیش کریں گے۔"

اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی مکمل آزادی کی تجویز آگے چل کر ۱۹۲۷ء میں مدراس کانگریس میں منظور ہوئی۔ لیکن پھر بھی گاندھی جی کو موقع دیا کہ اس سے کم ڈومینین اسٹیٹس ہی سہی حاصل کرنے کی سعی جاری رکھیں۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس میں مکمل آزادی کی تحریک منظور ہوئی اور طے ہوا کہ ۲۶ جنوری کو ہر سال "یوم مکمل آزادی" منایا جائے۔

مولانا حسرت مسلم لیگ کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوئے اور اسے مکمل آزادی کے قریب لانے کی سعی کرتے رہے، لیکن بعد میں مولانا کانگریس سے ہٹ گئے اور مسلم لیگ کے ممبر ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کے اکثر چوٹی کے مسلم رہنماؤں کو جن میں عبیداللہ سندھی، حسرت موہانی شامل ہیں، گاندھی جی کی رہنمائی میں کانگریس کی تین خامیاں کھٹکتی تھیں، ایک اس کی ہندوئیت (جس کے بارے میں جواہر لال نہرو نے کہا کہ یہ ایسی قوم پرستی تھی جو ہندوئیت لیے ہوئے تھی)، دوسرے حکمرانوں سے اس کی مفاہمت پسندی اور تیسرے سرمایہ داروں کی طرف اس کا جھکاؤ۔ کانگریس سے ہٹ کر مسلم لیگ میں مولانا گئے ضرور لیکن وہاں بھی ان کی اپنی تنہا آواز ہوتی، اور بے باکی سے اپنی بات رکھتے، چناں چہ جب مولانا ۱۹۳۵ء میں حج کے لیے گئے تھے، تو حرم شریف میں مولانا عبیداللہ سندھی نے ان کا گلا دبوچ لیا۔ مولانا نے جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑایا اور دور کھڑے ہو گئے، اور مولانا عبیداللہ سندھی سے پوچھا کہ وہ یہ کیا کر رہے ہیں

اس پر مولانا سندھی نے کہا کہ حسرت جو سامراج دشمن باغی ہیں، وہ سرکار پرستوں کی جماعت مسلم لیگ میں کیوں شریک ہوئے؟ اس پر مولانا حسرت نے کہا کہ "شیر اپنی ہی راہ پر گامزن ہے، اور برٹش چاپلوسی روباہوں کا کام ہے۔" اس جواب سے حسرت کا رویہ ظاہر ہے۔

۱۹۲۰ء کے بعد سے ملک میں مزدور تحریک میں اُبھار شروع ہوا۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس اسی سال قائم ہوئی جس کے تاسیسی اجلاس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی۔ مزدور طبقہ کا اثر ملک کی سیاسی فضا پر بڑھنے لگا۔ ایسے میں جب کانپور میں ۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کی بنا پڑی تو اس کے پہلے اجلاس کے صدر استقبالیہ حسرت موہانی ہی تھے۔ انھوں نے اپنے اس استقبالیہ خطبے میں کمیونزم پر ناسمجھی سے یا شرارت سے حملے کیے جاتے ہیں، ان کا مسکت جواب دیا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کمیونزم کا مطلب ہے "جو تیرا سو میرا" ان کو مولانا نے جواب دیا:۔

"واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جائیداد اور ملکیت کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک ذاتی جسے انگریزی میں پرسنل کہتے ہیں۔ مثلاً گھڑی یا چھتری، لوٹا، بستر، کپڑے، مکان وغیرہ۔ دوسرے شخصی انگریزی میں پرائیویٹ کہتے ہیں۔ مثلاً زمین، کارخانے وغیرہ۔ اور کمیونسٹ اصول کا عمل ذاتی جائیداد پر نہیں ہوتا، صرف شخصی پر ہوتا ہے۔"

جو لوگ کمیونزم کو بدیسی تحریک اور کمیونسٹوں کو دوسرے ملکوں سے وابستہ سمجھتے ہیں ان سے مولانا نے کہا:۔

"ہماری جماعت کا دائرۂ عمل صرف ہندستان تک محدود ہے۔ دیگر ممالک کی جماعتوں سے ہمارا تعلق صرف ہمدردی و ہم خیالی کا ہے۔ اس راہ میں ہم ان سب کے عموماً اور تیسری انٹرنیشنل کے خصوصاً ہم عصر ضرور ہیں، ماتحت نہیں....."

یا پھر ـــ

"ہم لوگ مذہب کے معاملے میں انتہا درجے کی رواداری کو مناسب

سمجھتے ہیں۔"

مولانا حسرت موہانی کی انسان دوستی اور اسلام کے مساوات وغیرہ کے بنیادی نظریہ پر ان کے بھرپور اعتقاد نے بھی انھیں سرمایہ سے نفرت اور مزدور سے محبت کا سبق سکھایا اور یہی کمیونزم کی ان کی حمایت کا راز اور جواز ہے۔

سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں کیوں نہ ہوں؟
معلوم سب کو قوتِ مزدور ہو چکی

مولانا یہ اصرار کرتے تھے کہ روسی لفظ "سوویٹ" اصل میں عربی لفظ "سویت" ہے جس کے معنی ہیں برابری۔ سوویٹ یونین کا استقبال کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

ہدایت کا زمانہ تھا، اہلِ سوویٹ نے
دکھائی سب کو راہ بے خوف دیں ہو کر

ہندستان میں سوشلزم کے مساوات کے نظام کے بہر حال کامیاب ہونے کا ان کو یقین ہے۔

لازم ہے یاں غلبہ آئینِ سویت
دو اک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

خود اپنے سیاسی عقائد کے بارے میں کہتے ہیں:۔

سویت آپ کا مقصد بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

حسرت کی زندگی مذہب اسلام پر بے پناہ عقیدہ، غزل سے انتہائی لگاؤ، اور ایک گہری انسان دوستی پر مبنی سیاست سے وابستگی کا حسین امتزاج ہے۔ حسرت مظلوم عوام کے دوست، اور غاصب مفادات کے کٹر مخالف۔ یہی حسرت کی عظمت کا راز ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۲۴ سے آگے)

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

وہ شاعری جس میں سیاسی افکار کا اظہار ہوتا ہے، بہت جلد ذہنوں سے محو ہو جاتی ہے۔ بچتی وہی ہے جس میں شعری حُسن ہوتا ہے۔ حسرت کے مقابلے میں شبلی کی سیاسی شاعری انداز لب لہجہ اور ادائیگی کے لحاظ سے زیادہ جاندار ہے۔

شبلی کی ایک چھوٹی سی نظم ملاحظہ ہو:۔

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لمِ یزل
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعوئ غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اگر تاریخِ ادبِ اُردو میں یہ نظم زندہ رہے گی تو اس لیے نہیں کہ شبلی نے ایک سیاسی

(بقیہ صفحہ ۱۹۲ پر)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

حسرت کی غزل گوئی

"... وہ غزل گوئی کہ غزل کا معیار حسرت ہی رہیں گے۔"

(رشید احمد صدیقی)

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی اُردو کے وہ چوٹی کے غزل گو ہیں جنھوں نے رشید احمد صدیقی کے مطابق "غزل کی آبرو اس زمانے میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف سے نرغے میں تھی۔"

۱۸۵۷ء کے آس پاس کے زمانے تک تغزل ولی دکنی سے لے کر غالب، میر، مومن تک مسلسل ارتقاء کے زینے طے کرتی ہوئی اپنی بلندی پر پہنچ چکی تھی۔ لیکن دورِ مغلیہ کے زوال اور انحطاط کے ساتھ اُردو غزل کا دربار بھی سرد پڑتا گیا، اور یہاں بھی انحطاط کے آثار پیدا و نمایاں تھے۔ عروج سے ضدِ عروج کی طرف اُردو غزل کا یہ زوال تاریخ ادب کا ایک المناک سانحہ ہے۔ ایسے میں خواجہ الطاف حسین حالی نے نہ صرف اس اُردو کی غزل پر فردِ جرم لگائی بلکہ اس کی اصلاح کا راستہ بھی دکھایا۔

انیسویں صدی کی اپنی آخری چوتھائی میں سر سیّد کا علی گڑھ میں مدرسے کی بنیاد رکھنا اُردو زبان و ادب کے نشاۃ ثانیہ کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور حُسنِ اتفاق دیکھیے کہ ۱۸۷۵ء میں جس سال علی گڑھ مدرسے کی بنیاد رکھی گئی، اسی سال یو۔ پی ہی کے ایک اور ضلع اُناؤ کے موضع موہان میں مولانا حسرت موہانی پیدا ہوئے۔ اور یہ یو۔ پی کا وہ علاقہ ہے، جسے "خطۂ یونان" کہا جاتا تھا۔ کہ یہ علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ مولانا کے گھر کی عورتیں تک تعلیم یافتہ تھیں، اور اردو ادب کا اعلیٰ

ذوق رکھتی تھیں۔

یہ تھی وہ علمی فضا، اور یہ تھا وہ زمانہ جب کہ ملک بھر میں علم و ادب ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا، اور حسرت نے آنکھیں کھولیں، اور اس ماحول میں مولانا کے ادبی ذوق اور تخلیقی صلاحیتوں کی نمو ہوئی۔

اُردو غزل کے انحطاط کا یہ عالم تھا کہ غزل گویوں کے نزدیک معشوق انتہائی عیّار، دغا باز، اور حیلہ ساز تھا۔ اس کی "بازاری حرکات و سکنات" اور "عاشق کی ہوسکارانہ دل بستگیوں" کو بے حجابی کے ساتھ بیان کر دینا، غزل کا مقصد ہو گیا تھا۔ مجنوں گورکھپوری تو اس قسم کے اشعار کو سرے ہی سے شاعری کے قلمرو سے خارج سمجھتے ہیں۔

جمنا میں کل نہا کر، جب اس نے بال باندھے   ہم نے بھی اپنے دل میں، کیا کیا خیال باندھے

(مصحفی)

غیر سے سینہ بہ سینہ ہوئے آپ   چھاتی پر سانپ یہاں لوٹ گیا

(رضا علی خاں جلال)

آج کل ہیں داغ ہوں گے کامیاب   کیوں مرے جاتے ہو دو دن کے لیے

(داغ دہلوی)

امیر اتنا نہ چھیڑ اس کو سرِ شام   کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے

(امیر مینائی)

ہاتھا پائی سے یہی مطلب تو تھا   کوئی منہ چومے کلائی تھام کے

آدمی کو جبلتوں کی غلامی سے چھڑا کر، تہذیب ہی نے انسان بنایا ہے، اور پھر جبلتوں کی اندھی حکمرانی کے دور میں چلا جانا، انتہا درجہ کی رجعت پسندی ہے، ابتذال ہے۔ فراق گورکھپوری نے صحیح کہا ہے کہ:

"جنسیت کے اندھے طوفان کو توازن بخشنا، یعنی تہذیب حقیت، تاریخ کا بہت بڑا کارنامہ ہے"۔ (غزل کی ماہیت و ہیئت۔ نگار جنوری فروری، ۵۰ء)

لیکن جب امیر اور داغ جیسے شاعروں کی زبان سے ہم وہ شعر سنتے ہیں، جن کے نمونے
اوپر دیے گئے ہیں، تو سر شرم سے جھک جاتے ہیں" اور حالی کے ہم مشکور ہوتے ہیں کہ
انھوں نے اس رکاکت اور ابتذال پر کس کر وار کیا۔

ایسے میں حسرت غزل کے میدان میں وارد ہوتے ہیں، تو مجنوں گورکھپوری
ہی کے الفاظ میں ـــ

"ہمارے اندر ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے، اور ہم چونک پڑتے
ہیں، ہم کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں سے اردو غزل میں نئی
توانائی آگئی ہے۔ اب اس نے ایک نئی اور خوش آئند سمت میں
قدم اٹھایا ہے" (حسرت کی غزل، نگار، جنوری فروری ۱۹۵۲ء)

جنسی زندگی، انسان کا معمول ہے اور کوئی گناہ نہیں، اور نہ ہی ادب میں اس
کا ذکر کوئی جرم ہے۔ لیکن اس کے لیے ذہنی خلوص اور پاکیزگی ضروری ہے۔ ادب میں جنسی
ذکر کی ادبی حدیں ہوتی ہیں۔ اس سے پڑھنے والے میں جنسی ہیجان پیدا نہ ہو، اسفل جذبات
کو تحریک نہ ہو، اور حسرت کے مطابق یہیں سے "فاسقانہ" اور "فاحشانہ" شاعری کا فرق
ہو جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے:

"حسرت وہ آخری حد متعین کر دیتے ہیں، جہاں تک ہم جنسی جذبات
کے اظہار میں جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد جنسی جذبات کا اظہار نہیں رہ جاتا،
ارتکاب شروع ہو جاتا ہے۔"

("کچھ حسرت کے بارے میں" نگار، جنوری فروری ۱۹۵۲ء)

خود حسرت نے اس مسئلہ کی طرف اپنے رویے کی وضاحت "نکاتِ سخن"
میں کر دی ہے۔ کہتے ہیں:۔

"حقیقی شاعری کے لیے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعاتِ
محبت کے بیان میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو، اور جذبات کی صحیح ترجمانی
کی گئی ہو۔ جذبات علوی ہوں یا سفلی۔ اگر جذبات عالی ہوں گے تو

شاعری جذبہ نگاری اور واقعہ نگاری کی شکل اختیار کرلے گی، ورنہ معاملہ بندی ہو جائے گی۔"

(بحوالہ احتشام حسین "حسرت کا رنگ سخن"۔ نگار جولائی فروری ۱۹۵۲ء)

اور پھر آگے چل کر کہتے ہیں:۔

"فاسقانہ شاعری (یعنی کمتر درجہ کے جذبات ہوس کی مصوری، لیکن صحیح مصوری) کو بد مذاقی پر محمول کرنا، سوقیانہ و مبتذل قرار دینا، انصاف کا خون کرنا ہے ....

البتہ اس ضمن میں حدِ اعتدال سے گزرنا بے شک قابلِ اعتراض ہے۔"

اقبال کو اس نوع کے مبتذل شعراء پر بجا طور پر اعتراض تھا کہ ان کے "اعصاب پر عورت ہے سوار"، حسرت شاعری کو اس دلدل سے نکالتے ہیں، اور غزل کو اس الزام سے بچا لیتے ہیں۔ حسرت جہاں "معاملہ بندی" کی شاعری کرتے ہیں، وہاں بھی "تنگ ظرفی" کا احساس نہیں ہوتا، وہ تہذیب کا دامن نہیں چھوڑتے۔ "عشق میں احتیاط" اور "اظہار رکھ رکھاؤ" ہوتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:۔

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر   ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

دیارِ شوق میں برپا ہے ماتم مرگ حسرت پر   وہ وضع پارسا اس کی، وہ عشق پاکباز اس کا

اِس قیدِ غم پہ قرباں حسرت   عالی جنابی، گردوں رکابی

یہی "عالی جنابی، اور گردوں رکابی" حسرت کی غزل کو اردو کی ہماری عظیم کلاسیکی غزل کا حرفِ آخر بنا دیتی ہے۔

فراق نے اپنے مضمون "حسرت موہانی" میں کہا ہے:۔

"آج سے پچاس برس پہلے حسرت نے ایک نئی دھن میں غزل سرائی شروع کر دی، جس میں کچھ وہ پرانی دھنیں بھی ملی ہوئی تھیں جنھیں ہمارے

کان بھول چکے تھے، اس طرح گویا اُردو غزل کی ڈھائی سو برس کی تاریخ
میں حسرت کا تغزل ایک نشاۃ ثانیہ کی حیثیت رکھتا ہے"
(نگار، جنوری فروری ۱۹۵۲ء)

یہ نئی اور پرانی ذہنوں کا امتزاج کیا ہے؟ حسرت کی غزل گوئی کا تانا بانا کن عوامل
سے بنتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری اپنے مضمون "حسرت کی عشقیہ شاعری" میں کہتے ہیں
"حسرت کی غزل گوئی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے" "ترقی پسندی اور واقعیت" کی
آمیزش حسرت کی شاعری کو منفرد بناتی ہے۔

اور یہ ترقی پسندی اور واقعیت" حسرت کو اپنے دور اور اس کے افعل تھیل سے
حاصل ہوئی۔ انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے پہلے دس سال ہندوستان
کے لیے یوں اہم ہیں کہ اسی زمانے میں بعد کی آزادی کی تحریک کی بنیادیں پڑیں ۔
انفرا اسٹرکچر (INER ASTRUCTURE) تیار ہوا۔ ادب اور زبان نے
نئی کروٹ لی۔ جذبہ وطنیت اور حوصلہ آزادی کے لیے سازگار ماحول بنا، اور
ہمارے اندر جدید سیاسی شعور کی باضابطہ شروعات اسی زمانے میں ہوئی۔

حسرت اور ان کی شاعری کو ان تاریخی قوتوں، تحریکوں اور عوامل سے الگ
کر کے نہیں سمجھا جا سکتا

حسرت کی زندگی میں عمل اور آدرش کی زبردست ہم آہنگی ملے گی۔ وہ ایک
راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اور جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے:

"میں قدامت پرست سنّی اور صوفی ہوں۔ تصوف کو مذہب کا جوہر
سمجھتا ہوں، اور تصوف کا ماحصل میرے نزدیک عشق ہے"
(بحوالہ نیاز فتحپوری "حسرت کی خصوصیاتِ شاعری" نگار جنوری فروری ۱۹۵۲ء)

حسرت بہت بڑے محبِ وطن اور آزادی کے مجاہد تھے۔ اس کے لیے انھوں
نے کوڑے کھائے۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ "چکی کی مشقت" جیل میں ان کا مقدر تھی۔
وہ اُردو کے، بلکہ یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان کے پہلے شاعر و ادیب ہیں جنھیں راہِ آزادی

میں جیل جانا نصیب ہوا۔ حسرت اپنے عزائم اور اپنے نصب العین پر مضبوطی سے قائم اور ان کے پابند رہے۔ ان کے عمل اور ان کے مقاصد میں زبردست ہم آہنگی ہے، اور کوئی تضاد نہیں۔ وہ، وہ نہیں، جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ:۔

چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

خود حسرت نے کہا ہے —

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اور پھر —

سو بیت آپ کا مقصد، بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

کچھ تنقید نگاروں کو حسرت، "مذہب"، "بغاوت" اور "غزل خوانی" کے تین الگ الگ کمپارٹمنٹوں میں نظر آتے ہیں، جن کا ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس بات کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔

اسلوب احمد انصاری کو اعتراف ہے کہ حسرت ..... کے فیضان کے سرچشمے خود ان کے گوناگوں تجربات اور ان پر جذباتی ردِّ عمل سے پھوٹتے ہیں۔" آخر وہ کیا تجربات ہیں، جن کی چکی میں سے حسرت نکلے تھے؟

مجنوں گورکھپوری اپنے مضمون "حسرت کی غزل" میں رقم طراز ہیں:۔

"ان کی شاعری نے "چکی کی مشقت" کو ان کے لیے سرمایۂ رحمت بنایا۔ اور "چکی کی مشقت" نے ان کی شاعری کے مزاج اور اس کی ہیئت کو متعین کیا۔ قید فرنگ میں حسرت نے بیٹھ پر جو کوڑے کھائے ہیں، وہ ان کے تغزل کی تربیت اور تہذیب میں ترکیبی عناصر کی طرح داخل ہیں۔ حسرت کی غزل میں جو رچا ہوا سوز و گداز ہے، وہ اس پُرآشوب بغاوت کا محض ایک بدلہ ہوا روپ ہے جس کا دوسری سمتوں میں وہ اس خطرناک

بلند آہنگیوں کے ساتھ مظاہرہ کر رہے تھے۔"

حسرت کا سیاسی کلام براہ راست انداز کا سیاسی تکلم ضرور ہے۔ مثلاً جب جج داور نے تلک کو سزا سنائی تو حسرت نے کہا :-

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور
کیا خاک انھیں گرمی کا ہو شعور
انصاف کے دشمنوں کا داور ہے لقب
برعکس نہند نام زنگی کا فور

یا پھر ان کے غزل کے انداز میں کہی ہوئی نظم ہے :-

رسمِ جفا دیکھیے کامیاب کب تک رہے
حبِّ وطن مستِ خواب دیکھیے کب تک رہے — وغیرہ

تلک کو وہ اپنا سیاسی گرو مانتے تھے اور ان پر ایک نظم کہی ہے

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبِّ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن

وغیرہ۔ اور پھر یہ شعر دیکھیے :-

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
ابھی ہم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب
بتا دو انھیں گرم پیکار ہو کر — وغیرہ

حسرت کا براہ راست سیاسی کلام بس یہی کچھ ہے۔ یقیناً ہم جس سیاسی غزل گوئی سے آج آشنا ہیں، رمز و کنایہ کی زبان میں عصری سیاسی اور سماجی کشمکش کی جو صدائے بازگشت ان غزلوں میں ملتی ہے، جو ترقی پسند شاعروں کا امتیاز رہی ہیں، اور جس میں فراق، فیض، مجروح جیسے جید غزل گو آتے ہیں، حسرت کے پاس اس قسم کی شاعری کی تلاش بے سود ہے۔ یہ بعد کے زمانے کی چیز ہے۔ جو اپنے مزاج

اور ماحول کے اعتبار سے حسرت کے دور سے الگ ہے۔

پھر بھی حسرت کے یہ اشعار ہمیں چونکا ضرور دیتے ہیں کہ کہیں ان میں سیاسی اشارے تو نہیں

اس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت　　آئینِ وفا مدِ نظر لے کے گئی ہے

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی　　جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

جو یہ تہیہ نہ کرے شانِ توجہ پیدا　　دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

حسرت کی تمام غزلوں کی تعداد ۱۱۰۰ ہوتی ہے جس میں ۳۸۳ غزلیں قید یا نظربندی کے عالم میں کہی گئی ہیں۔ عشق کے ساتھ ساتھ قید و بند کا یہ تجربہ بھی حسرت کے فیضان کا سرچشمہ ہے اور اس تجربہ کی زیریں رو حسرت کی شاعری کے نرم و نازک گداز میں جھلکتی ہے۔

حسرت کی شاعری بنیادی طور پر نشاطِ عشق کی شاعری ہے۔ فراق گورکھپوری نے اپنے مضمون "غزل کی ماہیت و ہیئت" میں غزل کو انتہاؤں کا ایک سلسلہ A SERIES OF CLIMAXES کہا ہے۔ کہتے ہیں "غزل کے مضمون ۔ ۔ ۔ ۔ میں بیک وقت ہم اپنی جبلتوں اور ارتقائے حیات و تہذیب سے حاصل شدہ کیفیتوں، لطافتوں اور صلاحیتوں کی جھنکار سنتے ہیں، اور نوائے غزل میں ہمیں" ہمارے شعور، تحت الشعور، اور لاشعور کی تہ در تہ جھنکاریں سنائی دیتی ہیں۔

"یہ شعور، تحت الشعور، اور لاشعور" کی تہ در تہ جھنکاریں کیا ہیں؟ یہی تو ہمارے تجربات ہماری آرزوؤں اور تمناؤں، ناآسودہ خواہشوں اور ایک خوش آیند مستقبل کے دھندلے تصورات کے نقوش ہیں۔ اور "عشق" جو غزل کا جذباتی مرکز ہے، اپنے وسیع ابعاد میں اس "شعور، تحت الشعو

ورلا شعور" کا ربط باہمی بن جاتا ہے۔ فراق ہی کہتے ہیں ۔

"جنسیت جب داخلی وغیبی (یا خارجی ا۔ ب۔ گ) تحریکوں سے عشق بن جاتی ہے تو اس عشق کے لامحدود دائرہ کائنات کی طرف اس عشق کے ذریعہ تعمیر انسانیت کی طرف، غزل اشارہ کرتی ہے۔ عشق کا پہلا محرک محبوب کی شخصیت ہے۔ پھر یہی عشق حیات وکائنات سے ایک ایسا والہانہ لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ جنسیت کے حدود سے گزر کر عشق ایک ہمہ گیر حقیقت بن جاتا ہے ":

اور فراق نے پھر کہا ۔۔

"وہ اشعار جو عاشق ومعشوق کے باہمی تعلقات کی مصوری یا ترجمانی کرتے ہیں، حقیقت میں تمام انسانوں کے باہمی تعلقات کی مصوری و ترجمانی ہوتے ہیں۔ محبوب کی شخصیت تو ان تعلقات کا محض نکتۂ آغاز ہوتا ہے "

ایڈورڈ اشپرنگر نے کہا تھا ۔" اگر انسان میں عشق کا احساس نہ ہوتا تو اسے خبر نہ ہوتی کہ نصب العین کیا چیز ہے ۔گویا عشق ہی ہے جو گویا "غم حیات" کے ڈانڈے "غم کائنات" سے ملاتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نزدیک "حسرت کا تغزل"۔ نگار جنوری فروری ۱۹۵۲ء)

حسرت کا ادب تین ادبی رجحانات کا امتزاج ہے۔ سر سید کی ادبی تحریک سے انھیں واقعیت پرستی اور حقیقت پسندی ملی ۔ امیر اور داغ سے انھوں نے غزل کا لوچ اور اس کا بانکپن حاصل کیا، اور لکھنؤ مکتب کی شاعری کے ایک ردِ عمل کے نتیجے میں "حسرت کی شاعری میں شگفتگی، لطافت، زندہ دلی، بے تکلفی، سادگی اور نفاست کی خصوصیات پیدا ہوئیں"۔ لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی کی نظر سے وہ سیاسی عوامل اوجھل رہے جنھوں نے حسرت کے اشعار کو وہ مخصوص گداز عطا کیا جو ان ہی کا حصہ ہے۔

حسرت کے تغزل میں جیالی خصوصیات کچھ ان کی اپنی افتاد طبع کی وجہ سے ہیں اور کچھ ان کے زمانے کی مغربی ادبیات کی وہ رومانی تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہیں جن کا پرچم شیلی کیٹس اور بائرن اٹھائے ہوئے ہیں ۔ پھر حسرت کا شعری مطالعہ بہت وسیع تھا۔

انھوں نے سعدی، شمس تبریز، فغانی، حافظ، جامی، نظیری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اُردو کے کلاسیکی شعری ادب کو تو انھوں نے چاٹ ڈالا تھا۔

یہیں وہ راز کھلتا ہے کہ حسرت کی دُھنوں میں نئی اور پرانی دُھنوں کا امتزاج ملتا ہے۔ اور وہ روایتی عشقیہ شاعری کے آخری شاعر ہیں اور اس عنوان ان کی شاعری حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہے تو وہ جدید ترقی پسند شاعری کا نکتۂ آغاز بھی ہیں۔

انھوں نے خود اپنی شاعری پر میر، مصحفی، غالب، مومن، جرأت، تسلیم اور نسیم دہلوی کے اثر کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن فراق کا کہنا ہے کہ حسرت کے ہاتھوں مصحفی، جرأت اور مومن کے رنگ کی تغزل کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ ان کے دلوں کے جوہر حسرت کی غزل میں اُبھر آئے۔ حسرت ان تینوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ بیان حسن اور اظہارِ عشق میں وہ مصحفی کی یاد دلاتے ہیں تو وابندی میں جرأت سے متاثر ہیں اور داخلی اور نفسیاتی امور کی طرف اشارہ کرنے کرنے میں وہ مومن سے اکتساب کرتے ہیں۔ حسرت کی غزل نے اس سمت میں اتنی ترقی کی کہ اب اس رنگ کی شاعری میں اور ترقی کی گنجائش نہ رہی۔

حسرت کے پاس اگر سوت پر بھی کوئی قوت فتح پا سکتی ہے تو وہ عشق ہے۔

قوتِ عشق بھی کیا شے ہے کہ ہو کر مایوس
جب کبھی گرنے لگا ہوں میں سنبھالا ہے مجھے

حسرت نے اظہارِ عشق کو ابتذال اور جنسی تلذذ کے دلدل سے نکال کر اسے شرافت بخشی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا خیال ہے کہ غالب کا عشق اگر امیرانہ تھا، میر کا عشق فقیرانہ تھا تو حسرت کا عشق شریفانہ تھا اور حسرت کا کارنامہ یہ ہے کہ عشق کو ان گندہ ہاتھوں سے چھڑا لیا جنھوں نے اسے "فاحشانہ" بنا رکھا تھا۔ طرب وصل ہو کہ رنج فرقت حسرت کے یہاں جذبہ کی پاکیزگی اور عشق کی شدت نے اظہار کو خلوص بیان کو نکھار دیا اور شعر کے ماحول کو ایک معصومیت بخشی ہے۔ وہ حسرت ہی تھے جنھوں نے "شانِ رسوائی" کو قابلِ اعتبار بلکہ قابلِ احترام بنا دیا۔

تو نے کی حسرت عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا۔

حسرتؔ جب معاملاتِ عشق بیان کرتے ہیں تو تہذیب کا دامن نہیں چھوڑتے۔ رکھ رکھاؤ دیکھئے:۔

دیکھا جو کہیں گرمِ نظر بزمِ عدو میں — وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے — ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

راہ میں ملئے کبھی مجھ سے تو ازراہِ ستم — ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے

میں کیا کہوں کہ تم سے کیسے جھکا کے سر — پوچھا انھوں نے حسرتِ بیمار کا مزاج

برابر سے گزرتے ہوئے ملکے سے ڈانٹ جانا۔ اغیار کی محفل میں آہستہ ہاتھ دبانا، ہونٹ کاٹ کر فوراً الگ ہو جانا۔ شرم سے سر جھکا کر مزاج پرسی کرنا، یہ سب مہذب اندازِ بیان نہیں بلکہ ظرف کھینچا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسرتؔ آرزو کے اظہار سے زیادہ آرزو کی یاد کو عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے تحت شعور میں یادوں کا ایک ہجوم ہے، اور یادؔ ان کے اشعار میں ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے — ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق — تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

وغیرہ

یاد ہیں اب تک وہ عیشِ بافراغت کے مزے — دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

یاد ہیں وہ حسنِ والفت کی نرالی شوخیاں — التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں — الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی — تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آج کل

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغازِ محبت میں — نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری

حسرت کے رکھ رکھاؤ کا دوسرے شاعروں کی بے حجابی سے مقابلہ کرکے دیکھیے تو حسرت کی عظمت ظاہر ہوگی۔ ایک شعر ہے :۔

صبح کو آئے ہو بھولے شام کے
جاؤ بھی، اب تم رہے کس کام کے

لفظ "کام" نے شاعر کی حقیقت کو اور اس کے جذباتِ سفلی کو آشکارا کر دیا ہے۔ یا یہ شعر :۔

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے — چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

یہاں "گرے ہوتے" اور "گھبرائے ہوئے" الفاظ چغلی کھاتے ہیں کہ معشوق کہاں سے اور تکمیلِ شوق کی کس منزل سے ہو کر آ رہا ہے۔ لیکن حسرت کی آواز سنیے :۔

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انھیں
کہتے بنا نہ کچھ، وہ قسم کھا کے رہ گئے

"بزمِ غیر" نے شعر کی تہذیب کی سرحدوں پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ اظہار کا رکھ رکھاؤ ہے، جو حسرت کی شانِ امتیاز ہے۔

حسرت کے یہ شعر انھیں اپنے ہم عصر غزل گو شعرا میں ایک انفرادیت بخشتے ہیں

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں — دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

خاطرِ مایوس میں نقشِ امیدِ وصلِ یار — نور ہے صحرا میں گویا اک چراغ دور کا

رونقِ دل یوں بڑھائی جائے گی　　غم کی اک دنیا بسائی جائے گی

سادگی ہائے تمنا کے مزے جاتے رہے　　ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خود آرا ہو گیا

ان کے خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال　　کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار

نگاہِ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے　　تغافل ہائے بیجا میں نوازش ہائے پنہاں ہیں

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے　　بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں　　کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں　　مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا　　یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے

تم جو افسردہ ہوئے سن کے مرا حال سو کیوں؟　　سرسری طور سے باتوں میں اڑا دینا تھا

یاس کا دل پہ کچھ اثر نہ ہوا　　قصۂ شوق مختصر نہ ہوا

شوق کا حسنِ عقیدت دیکھنا اکثر ہوا　　سکونِ یاس ملا اضطراب کے بدلے

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن　　　آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے　　　تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

سیرِ گل خوش نہیں آتی کسی عنوان ہمیں　　　جا کے لوٹ آتے ہیں دیوارِ گلستاں کے قریب

رائیگاں حسرت نہ جائے گا مرا مشتِ غبار　　　کچھ زمیں لے جائے گی کچھ آسماں لے جائے گا

خو سمجھ میں نہیں آتی ترے دیوانوں کی　　　دامنوں کی نہ خبر ہے، نہ گریبانوں کی

کیا ہو یہ آج پوچھیں گے اس نازنیں سے ہم　　　تجھ سا جو کوئی ڈھونڈ نکالیں کہیں سے ہم

یہ ہیں حسرت جنھیں بجا طور پر "سید الاحرار" کے ساتھ "رئیس المتغزلین" بھی کہا گیا ہے حسرت صوفی منش تو تھے ہی، اولیاء اور صوفیا کے درباروں میں برابر حاضری دیتے تصوف کو اصل مذہب سمجھتے تھے۔ ان کا کچھ اس طرز کا کلام بھی ہے لیکن حسرت اصغر نہیں تھے اور اس نوع کی صوفیانہ شاعری ان کا میدان تھا، نہ میلان۔

پھر بھی ایسے شعر مل جاتے ہیں جہاں تصوف جھانکتا محسوس ہوتا ہے۔

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا　　　ساغر کو رنگِ بادہ نے پرنور کر دیا

مجھ کو خبر نہیں کہ مرا مرتبہ ہے کیا　　　یہ تیرے التفات نے آخر کیا ہے کیا
دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں　　　تیری محل سرا کا یہی راستہ ہے کیا

تم پر مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے　　　ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

مایوس نہ یوں ہوتے، تو دُور اگر ہوتا　　ہم کچھ نہ تجھے کہتے، مجبور اگر ہوتا

صرفِ عصیاں ہوا، وہ لحظۂ عمر　　جو تیری یاد میں بسر نہ ہوا

قصہ مختصر، بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں :۔

"حسرت زندگی کے امکانوں پر یقین رکھتے ہیں، اور اس سبب سے ان کے تغزل میں اُمید و نشاط کی آمیزش ہے۔"

("حسرت اور ان کی شاعری")

حسرت کی شاعری جذبات کی شاعری ہے، تصورات کی نہیں۔ اور جذبات تجربات کی گہرائی سے نمو پاتے ہیں۔

غالب کا شعر ہے :۔

قید میں ہے تیرے وحشی کو وہی زُلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

قید ہے، قید میں محبوب کے زُلف کی یاد ستاتی ہے، اور قید میں گرانباری زنجیر کا "کچھ اک" حد تک رنج بھی ہے، اس قید کا حسرت کو کتنا گہرا تجربہ ہے اور سلاست بیان کے ساتھ احساس کی شدت اور تلخی ملاحظہ ہو :۔

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

حسرت کی غزل میں ایک طرب و نشاط ضرور رچا ہوا ہے۔ ساتھ ہی فراق کو دکھیوں گیتے ہیں، ایک "حزن خفی" کا عنصر بھی گھلا ملا ہوا ہے

یہ طرب و حزن دونوں ہی زندگی میں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں، امید و یاس کا بقائے باہم نہیں، تصادم ہے۔ اس تصادم سے وہ بھوٹتی ہے جو شاعر کو اپنے سُننے اور پڑھنے والوں سے جوڑتی ہے، اور دونوں میں جذباتی ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ تب ہی تو شعر سُنتے ہی دل میں اتر جاتا ہے۔ حسرت نے کہا ہے :۔

شعر دراصل ہیں وہی حسرت　　سُنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

(بقیہ صفحہ ۱۷۶ سے آگے)

واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا، بلکہ اس لیے کہ اس نظم میں غالب کے شعر سے بہترین فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ پوری نظم میں اظہارِ خیال کے ساتھ طرزِ ادا نے شعری حسن بھی پیدا کر رکھا ہے۔ حسرت غزل کے شاعر تھے۔ انھوں نے "ساغر و مینا" کے پردے میں بعض سیاسی افکار کا اظہار کیا ہوگا، ایسے تمام کی تو نہیں، ہاں چند اشعار کی نشان دہی ممکن ہے۔ ایک غزل کے تین شعر ملاحظہ فرمایئے یہ غزل جیل میں کہی گئی تھی، اور چونکہ مقطع میں قیدِ فرنگ کا ذکر ہے، اس لیے باقی اشعار میں بھی اہلِ فرنگ کی جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں۔

وہ جرمِ آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری

ستم تم چھوڑ دو میں شکوہ سنجی ہائے ناچاری
کہ فرض عین ہے کیشِ محبت میں رواداری

خوشی سے ختم کرلے سختیاں قیدِ فرنگ اپنی
کہ ہم آزاد ہیں بیگانۂ رنجِ دل آزاری

اسی قبیل کے کچھ شعر اور سنیئے:۔

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

اپنا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اب میں حسرت کے کچھ ایسے سیاسی اشعار پیش کرتا ہوں جن میں صداقت ہے سچائی ہے لیکن جن میں تجربے اور مشاہدے کی ہم آہنگی احساسِ لطیف پر گراں گزرتی ہے ان میں سے بیشتر اشعار ہمارے ذہنوں میں نہیں، بلکہ کلیاتِ حسرت میں محفوظ ہیں، اور آج ہم ان اشعار کا ذکر صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اردو کے صفِ اول کے غزل گو کے اشعار ہیں۔

رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حبِّ وطن مستِ خواب دیکھیے کب تک رہے

(بقیہ صفحہ ۲۸۶ پر)

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

حسرت کا تصورِ عشق

حسرت کے بارے میں اپنے پہلے مقالے "حسرت کا شاعرانہ مرتبہ" میں میں نے اُن کی شاعری کی حدبندیوں اور اس کے بارے میں موجود تنقید کی نارسائیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد یہ سوال اُٹھایا تھا کہ آخر اُردو شاعری میں اُن کی کیا حیثیت ہے، کیا اُن کو ایک روایتی اور تقلیدی شاعر قرار دیا جائے۔ یا اُن کے شعری ذہن کی کسی ایسی خصوصیت کو تسلیم کیا جائے جو اُنھیں اُردو شاعری کی تاریخ میں زندہ رکھنے کی ضامن ہو، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے اجمالاً جو باتیں کہی تھیں، اُن میں پہلی بات یہ تھی کہ اُن کی شاعری میں بعض ایسے اشعار ضرور ملتے ہیں جن میں اُن کا تصورِ عشق روایت کے اثرات سے پاک و صاف ہو کر انفرادیت کا احساس دلاتا ہے اور ان کی شعری اہمیت کی اساس فراہم کرتا ہے۔

آئیے، اس نشست میں اس پہلو کا قدرے تفصیلی جائزہ لیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ایک پُرآشوب دور میں سانس لینے، اور شخصی زندگی میں بھی نشیب و فراز سے گذرنے کے باوجود، حسرت تخلیقی عمل میں خارجی حقائق سے راست اثر پذیری سے انحراف کرتے رہے۔ انھوں نے اقبال یا جوش کی طرح اپنے عہد کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر انحصار نہ کیا، نتیجے میں اُن کی شاعری معاصر شعور کی پیچیدگی، تابناکی اور توسیع سے محروم رہی۔ عملی سیاست میں شرکت کے باوجود اور ملک میں صدیوں کے فکری انجماد کے اُٹھنے والی آتشیں لہروں کا مشاہدہ کرنے کے باوجود، وہ ذہنی علیحدگی پر قانع رہے، یہ وہ علیحدگی نہ تھی، جو زندگی کے متشکلانہ شعور کا ایک اظہار بن جاتی ہے، یہ ایک ایسی علیحدگی ہے، جو خارج کی دہشت ناک حقیقتوں سے صرفِ نظر

کرنے اور ایک تخیلی دُنیا آباد کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ایک چھوٹی سی رنگین، منور اور معطر دُنیا، جس میں کاروبارِ شوق کی فرصتیں مہیا ہیں، میں اس بات سے ناخوش نہیں ہوں کہ حسرت نے خارجی حقیقت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، تخلیقی نقطۂ نظر سے انھوں نے ایسا کرتے ہوئے خارجی حقیقت کی بے بضاعتی کا اثبات کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تخلیقِ فن کے اس بنیادی راز سے آگاہ ہیں کہ خارجی حقیقت کمتر ذہنوں کے لیے چراگاہ کا کام کرتی ہے، سچّا فن کار اپنے خونِ جگر سے اپنی نوا کی پرورش کرتا ہے، اور اپنا جہان خود پیدا کرتا ہے۔ حسرت نے بھی یہ کام انجام دیا ہے، لیکن ایک بات تردّد آمیز ضرور ہے کہ حسرت کی تخیلی دُنیا اپنے واضح حدود رکھتی ہے، جب کہ بڑے شعرا مثلاً غالؔب کی دنیا بے کرانی کا احساس دلاتی ہے، اُن کی دُنیا میں نور و سایہ کی لہریں جذب و کشش کے باوجود، وہ علامتی اسراریت خلق نہیں کر پاتیں، جو میرؔ یا غالؔب کا خاصہ ہے۔

اُن کی دُنیا حسن و عشق کی دنیا ہے، صنفِ نازک کے جسمانی حُسن کے رنگا رنگ جلوؤں سے معمور دُنیا، ایک ناظورۂ جمال سامنے آتی ہے — حیا پرور، تغافل آشنا، سراپا ناز، وہ عاشق کی مرکزِ نگاہ ہے، اور وصل و فراق کی مختلف کیفیات کی آفریدگار، ان کیفیات سے یہ التباس آسانی سے پیدا ہوتا ہے کہ حسرت نے عشق کے ہزار رنگ بکھیر دیئے ہیں، رنگوں کے اسی اژدحام کو دیکھ اُردو کی بزرگ نسل کے نقادوں، مثلاً نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، مجنوں اور آل احمد سرور نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے، مجنوں تو یہاں تک لکھتے ہیں :۔

"حسرت نے بڑی وسیع المشرب اور ہمہ گیر طبیعت پائی تھی، اس لیے اُن کے کلام میں رنگ اور طرز کا جیسا تنوع پایا جاتا ہے، اس کی مثال کسی دوسرے اُردو شاعر کے کلام میں شاید ہی ملے"

لیکن اُن کے تصورِ عشق کی تفہیم و تحسین کا مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہیں ہے جتنا بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ عشقیہ جذبات کا منظوم اظہار ہی کسی شاعر کی عظمت تو درکنار، اس کے شاعر ہونے کا ضامن ہو سکتا ہے، حسرت کی عشقیہ شاعری کا محاکمہ کرتے ہوئے اس بات کو پیشِ نظر رکھنا ہے کہ اُن کے یہاں عشقیہ کیفیات کا منظوم ہوا ہے، اور بہت ہوا ہے، اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ بات بھی ہے کہ اُن کی عشقیہ شاعری کا معتد بہ حصہ محض تکرار ہی اور

روایتی نوعیت کا ہے، اسے مجنوں گورکھپوری نے بجا طور پر "استادانہ تقلید" کا نام دیا ہے، انھوں نے فانی کی طرح اساتذہ کا تتبع کرنے میں خاصا وقت برباد کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ عشق عامتہ الورود جذبات کا بیان، خواہ کتنی ہی مشاقی اور لذتیت سے کیوں نہ کیا گیا ہو اعلیٰ شاعری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا، ایسی شاعری جو عامیانہ تجربات کو تعمیمی انداز میں پیش کرتی ہے، اردو میں بہت ہوتی ہے، مشاعراتی شاعری اس کی بین مثال ہے، اس نوع کی شاعری عوامی سطح پر وقتی تفریح کا سامان تو کرتی ہے، مگر ذوق کی تہذیب نہیں کرتی اور نہ ہی فکر و نظر کی روشنی عام کرتی ہے، شاعری مانوس د موجود حقائق، یا عمومی سطح پر محسوس کئے گئے جذبات سے تعلق نہیں رکھتی، یہ نادیدہ، تحیر زا، اور انکشافی وقوعات کی مصوری کرتی ہے، اس کا اطلاق بے کم و کاست عشقیہ تصورات پر بھی ہوتا ہے، حسرت کے تصور عشق کے بہ کہہ کے گن گاتا کہ یہ ایک حقیقی اور جانی پہچانی محبوبہ سے متعلق ہے اور عام انسانی جذبات پر محیط ہے (جیسا کہ بیشتر نقادوں نے کیا ہے) حسرت ناشناسی کے ساتھ ساتھ شعر ناشناسی کے رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے "حسرت نے عورت اور اس کے حسن کو عام زندگی سے مطابقت پیدا کی ہے۔" نیاز فتح پوری کے نزدیک "حسرت کی شاعری بالکل انسانی سطح پر اور انسانی جذبات کی شاعری ہے۔" ظاہر ہے کہ اس نوع کی تنقید حسرت کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں کرتی۔ یوں بھی دیکھا جائے تو صنف لطیف کی تفصیلات — جسم کا رنگ، روپ، آواز کی حلاوت، چال ڈھال، شرم و حیا، ملبوس، تبسم یا ناز و ادا — کس انوکھے تجربے کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں۔ یہ تفصیلات مانوس اور جانی پہچانی ہیں، اور دل کشی کے باوجود طلسمی اسراریت سے عاری ہیں، اس لیے ہمیں اس تلخ حقیقت کو مان لینا چاہئے کہ حسرت کی عشقیہ شاعری کی اہمیت کو منوانے کے لیے جو دلایل پیش کی گئی ہیں، وہ غیر فنی ہیں۔ اُن کے نظریۂ عشق کی ماہیت اور انوکھے پن کو سمجھنے کے لیے خارجی یا عمومی حقیقت سے اس کے رابطے پر زور دینے کے بجائے، اس سے، اس کے انقطاعی عمل پر نظر رکھنا ہوگا۔

اُن کی کل کائنات شعر، جیسا کہ کہا گیا، عشق پر منحصر ہے، لیکن عشق اُن کے یہاں ایک مخصوص اور محدود معنویت رکھتا ہے، یہ ماورائیت سے لاتعلق ہے، اور علامتی امکانات سے

نا آشنا، ظاہر ہے کہ اس کی اپنی حد بندیاں ہیں لیکن یہ حد بندیاں حسرت کے حقیقی شاعر ہونے ہونے میں عارج نہیں ہیں۔ اس لیے کہ مقدار کے لحاظ سے نہ سہی کیفیت کی رُو سے (محدود پیمانے پر ہی سہی۔ ان کے یہاں اپنی شاعری سے دیئے گئے ہیں جس سے یہاں یہی انداز مستقلاً قائم نہیں رہتا، بلکہ بعض نادر لمحوں میں ذہن و احساس کی مخصوص اور منفرد حالتوں کا پتہ چلتا ہے، یہ دراصل اُن کے اندرون میں تقلیب کا ایک فطری عمل ہے ـــ اندرونی شعری بیداری، نور کی ایک تیز لہر، جو ذہن پر تقلیدار وایت اور تعمیم کی دبیز تہوں کو چیر کر اپنا اظہار کرتی ہے، یہ گویا خود پر منکشف ہونے کا وجدانی عمل ہے، حسرت اس عمل سے گزرے ہیں، انھوں نے بعض نازک اور نادر لمحوں میں اپنے شعری وجود کو پا لیا ہے، اسی لیے وہ مانوس اور عمومی عشقیہ فضا سے کنارہ کش ہو کر "عالم حیرت" کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں :۔

اب عشق کو درکار ہے اک عالم حیرت   کافی نہ ہوئی وسعتِ میدانِ تمنا

اُن کے یہاں ایسے اشعار یک جا کیے جا سکتے ہیں، جو ایک نادیدہ اور مربوط تخیلی فضا کی تشکیل کرتے ہیں، یہ فضا قاری کے لیے حد درجہ کشش رکھتی ہے۔ اس فضا میں داخل ہو کر وہ روزمرہ کی کھردری، بے رنگ، اور زنگ خوردہ زندگی سے دست بردار ہو کر، جذباتی سحر آگیں، اور نادرہ کار واقعات سے دوچار ہوتا ہے، وہ تحیر اور مسرت کے جذبات سے ہمکنار ہوتا ہے۔ حسرت تحیر کے اس جذبے سے آشنا ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ وہ جس عورت کے فراق و وصال کی لطیف حکایات کو پیش کرتے ہیں وہ عام زندگی میں نہیں ملتی، وہ ایک تخیلی دنیا کی عورت ہے، حسن کا ایک عدیم المثال پیکر، جو کیٹس کی بے رحم حسینہ کی طرح، خوابوں میں ہی نازل ہوتا ہے، اور اس سے منسوب ہو کر، وہ جن داخلی محسوسات سے گزرتے ہیں، وہ بھی پیش پا افتادہ نہیں، بلکہ انوکھے اور نئے ہیں اور تحیر خیز ہیں، یہ رومانی تحیر ہے جس سے آشنا ہو کر حسرت غمِ دنیا سے بالکل لاتعلق ہو جاتے ہیں :

تھی راحت کی کس درجہ فراوانی   ہم نے غم ہستی کی صورت بھی نہ پہچانی

یہ تحیر اُن کے ایسے اشعار کو طلسم ہوش ربا بناتا ہے :

جلوۂ یار ہے، دلوں کے لیے   فی المثل اک طلسم ہوش ربا

اور ایسے کہاں حیرت و حسرت کے مرقع   اے دل جو ترے آئینہ خانے میں سجے ہیں

اُن کی شاعری میں صرف حیرت و حسرت ہی نہیں بلکہ انسانی جذبات کے اور بھی مرقعے ملتے ہیں، یہ وہ جذبات ہیں جو میکانکی زندگی کے دباؤ کے نتیجے میں اپنا آب و رنگ کھو بیٹھتے ہیں، حسرت ان کی اصلیت اور قوت سے آشنا ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کا دل رازِ محبت کا نیرنگ بن جاتا ہے۔

غضب تھی عشق کے جذباتِ گوناگوں کی رنگینی
دلِ حسرت بھی اک نیرنگ ہے رازِ محبت کا

اُن کے "جذباتِ گوناگوں کی رنگینی ان اشعار میں جھلکتی ہے:

بچھی ہیں رہِ تمنا میں سیکڑوں آنکھیں
کہ ناز جلوہ کرے شوخیِ خرامی کا

گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں
اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں

اس جبلہ جُو نے وصل کی شب ہم سے روٹھ کر
نیرنگِ روزگارِ دو عالم دکھا دیا

سب ہیں تری انجمن میں بے ہوش   نظارۂ حُسن کا کسے ہوش ہے

حسرت نے "حُسن کے جلوہ ہائے رنگا رنگ"[1] کی تخیلی پیکر تراشی کے باوجود اس کی انسانی اصل

---

[1] ہیں طلبگارِ شوقِ گوناگوں   حُسن کے جلوہ ہائے رنگا رنگ

کو نظرانداز نہیں کیا ہے' یہ ماورائی نہیں بلکہ ارضی ہے "یہ تنِ نازک کی حقیقت"[۱] سے آشنا ہے۔ یقین یاد رہے کہ ارضیت کا یہ احساس اُن کے شعری شعور کی نیرنگ سامانی کا زائیدہ ہے، اس لیے دل کشی رکھتا ہے' یہ لکھنوی شعرا کے جنسی ابتذال سے منزہ ہے' یہ جسم یار کو جمالیات کا درجہ عطا کرتا ہے' حسرت جسم یار کی خوبیوں اور لطافتوں سے حیاتی لذت آفرینی کا سامان کرتے ہیں' یہاں عورت اُن کے یہاں ہوس پرستی کے جذبے کو نہیں اُبھارتی' بلکہ جمالیاتی لطافت کا سامان کرتی ہے' چند اشعار ملاحظہ ہوں' جو مختلف حواس مثلاً باصرہ' لامسہ اور سامعہ کی تشفی کا حق ادا کرتے ہیں۔

یاد بھی دل کو نہیں صبر و سکوں کی صورت
جب سے اُس ساعدِ سیمیں کو کھلا دیکھا ہے

اک برقِ تپاں ہے کہ تکلم ہے تمہارا
اک سحر ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمہارا

محبوبی و رنگینی ہے جزوِ بدن تیری
سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

چھیڑتی ہے مجھے بے باکیٔ خواہش کیا کیا
جب کبھی ہاتھ وہ پابندِ حنا ہوتے ہیں

کھُل گیا ہے ترے جمال سے رنگ
تیرے ملبوسِ ارغوانی کا

خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے
تجھ تک تو ہوا تھا نہ گزر بادِ صبا کا

۱۔ کیا کیجیے بیاں اِس تنِ نازک کی حقیقت
خوشبو میں ہے گُل بُو تو لطافت میں ہمہ رنگ

کے، کے، کھلر

حسرت موہانی

کچھ حد بھی ہے اس سوزش خاموش کی حسرت
یہ کشمکش غم تجھے بے کار نہ کر دے

حسرت موہانی کسی فرد کا نام نہیں ہے، وہ ایک عہد تھے۔ انھوں نے اردو غزل کو اس وقت تھاما، جب اُس کا کوئی والی وارث نہ تھا، جب چاروں طرف سے اس پر حملے ہو رہے تھے، جب ہر بڑا شاعر غزل سے کتراتا تھا۔ جب غزل لکھنا ایک گناہ سمجھا جاتا تھا۔ حسرت نے غزل کے اس دورِ زوال میں غزل کو سہارا دیا۔ اور اس سے سہارا لیا۔ جہاں وہ اردو غزل کے کلاسیکل شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں، جہاں وہ جدید غزل کے بانی بھی ہیں۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

جہاں وہ کانگریس کے لیڈر رہے، وہاں وہ مُسلم لیگ کے لیڈر بھی تھے۔ اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی بنیاد بھی انھوں نے ہی رکھی تھی۔ ہندو مسلم یک جہتی کے علمبردار اور ہندوستان کی تقسیم کو نہ ماننے والا درویش حسرت موہانی ہی تھا۔ جہاں ان کے دل میں دیارِ رسول کی تڑپ تھی، وہاں وہ بھگوان کرشن کے خاص عاشقوں میں بھی تھے۔ مکّہ اور متھرا میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے، ان کی غزل اور سیاست دونوں کا رنگ نرالا تھا، ان کی قلندرانہ زندگی کو دیکھتے ہوئے ہر سیاسی اور ادبی سر جھک جاتا ہے۔

حسرت کی ہر غزل میں تاریخ پڑی ہوا ہے۔ ان کے ہر دور کو سمجھنے کے لیے ان تاریخوں سے بہت مدد ملتی ہے۔ جہاں انھوں نے قدیم روایات کو قائم رکھا، وہاں نئی روایات کی

بنیاد بھی ڈالی۔ اردو شاعری میں ان کا مقام میر و مومن کے ساتھ ہے۔ جہاں وہ عشقِ مجازی کے قائل تھے، وہاں انھوں نے عشقِ حقیقی کو بھی غزلایا۔

توُ نے حسرت یہ نکالا ہے عجب رنگِ غزل اب بھی ہم کیا تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

حسرت موہانی کی شیریں کلامی، ان کے فقروں میں لطافت و ظرافت، وہ بات بات میں پھڑکا دینے والے لطیفے، وہ شستہ اور ٹکسال میں ڈھلے ہوئے الفاظ۔ کلام کی عوام میں مقبولیت کا یہ عالم تھا، کہ جو غزل رات کو مشاعرے میں پڑھتے یا کسی اخبار یا رسالے میں چھپتی تھی، صبح کو کوچہ و بازار میں لوگوں کی زبان پر ہوتی تھی۔ مولانا حسرت کی مقبولیت سے زمانے کی مایہ ناز ادبی اور سیاسی ہستیاں حسد کرتی تھیں، لیکن حسرت ذاتی زندگی اتنی پاک اور فقیرانہ تھی، کہ دشمن بھی ان سے محبت کرتے تھے۔

حسرت موہانی کی تصویریں تو آپ نے کئی دیکھی ہوں گی۔ اس نقاش کے نقش و نگار سے آپ کی آنکھیں آشنا ہوں گی۔ لیکن کچھ ایسے واقعات اور سانحات ہیں جو عام طور پر مشہور نہیں ہیں، میں آپ کی توجہ ان کی طرف دلانا چاہتا ہوں، جس سے آپ خود بخود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حسرت موہانی کتنے بے باک، نڈر اور روشن دماغ ادیب اور سیاست داں تھے۔

۱۲ مئی ۱۹۱۳ء کی رات کے نو بجے علی گڑھ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حسرت موہانی کے گھر پر دستک دی۔ جب حسرت نے دروازہ کھولا تو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حکومت کی طرف سے ایک نوٹس پیش کیا جس میں پریس ایکٹ ۱۹۱۰ کے تحت یہ حکم دیا گیا تھا کہ چونکہ اردوئے معلیٰ میں حکومت کے خلاف مضمون شائع کیا گیا ہے، لہذا ایک ہفتے کے اندر تین ہزار روپے کی رقم ضلع مجسٹریٹ کے پاس اگر جمع نہ ہوئی تو پریس ضبط کر لیا جائے گا۔ حسرت موہانی نے ۱۳ مئی کے شمارے میں اپنے اداریہ میں لکھا:

> "چوں کہ اردو پریس کی کل کائنات ایک لکڑی کے پریس اور پتھروں پر مشتمل ہے جس کی مجموعی قیمت پچاس روپے سے زیادہ نہیں، اس لیے حکومت کا یہ حکم مضحکہ خیز ہونے کے علاوہ حیرت سے گزر کر کینہ پروری کی حد تک پہنچ گیا ہے"

لہٰذا اُردوئے معلیٰ کی اشاعت ۱۹ مئی سے بند کی جائے گی۔

حسرت موہانی کی عمر اس وقت تقریباً ۲۵ سال تھی، وہ اسی اخبار میں حکومت برطانیہ کی مضر پالیسی کے خلاف ایک مضمون لکھنے اور چھاپنے کے جرم میں ۱۹۰۸ء میں ڈیڑھ سال کی قید بامشقت کاٹ چکے تھے۔ پانچ سو روپے جرمانہ کی ادائیگی کے لیے، انھوں نے اپنی بیش بہا کتابیں بھی نیلام کر دی تھیں، لیکن ان سے صرف ساٹھ روپے ہی وصول ہوئے تھے۔ اس جیل کی سزا کے دوران ہی ان کے والد اظہر حسن اپنے خالق سے جا ملے تھے، ان تمام تکالیف کے باوجود حسرت کی آزادی پسندی، حریت نوازی، حق گوئی اور بے باکی میں، جو ان کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا سنگ بنیاد تھیں، کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اردو ادب اور ہندستانی سیاست کا یہ بانکا اور بے باک نوجوان اپنی منزلیں بڑی شان اور وقار کے ساتھ طے کر رہا تھا۔ حسرت ایک ایسے راستے کا مسافر تھا جو منزل کو اپنا سفر اور ہر سفر کو اپنی منزل سمجھتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" میں حکومت کے اس فیصلے کو یوں بیان کیا ہے:

"تین ہزار روپے کی ضمانت پریس ایکٹ کی مقدار مقررہ انتہائی کے اندر ہے لیکن عملاً پانچ سو یا ہزار سے زیادہ طلب نہیں کی جاتی ہے، اور صرف دو ایک مثالیں دو ہزار کی سنی گئی تھیں، پھر بھی ہز آنر جیمس مسٹن با القابہ کا دربار سطوت و جلال نہیں معلوم اتنی بڑی سنگین رقم کے لیے کیا وجہ بیان کر سکتا ہے۔ گورنمنٹ اس سے بے خبر نہیں کہ اردو پریس اور اس کے مالک کی حالت کیا ہے، حسرت موہانی جب قید سے رہا ہو کے آیا تو کوئی چیز اس دنیا میں ایسی باقی نہ تھی جو اس کے لیے ذریعہ تقویت مال ہوتی۔ دو، ڈیڑھ روپے ماہوار کرایہ کا ایک جھونپڑا ہے، جس کے اندر ایک چھوٹی سی صحنچی اور کوٹھری ہے، اور باہر بھی اتنی ہی مکانیت ہے، اندر وہ فقیر حریت مع اپنی کوہ عزم و ثبات بیوی کے رہتا ہے اور باہر کاٹھ کا دستی پریس اور دو چار پتھر ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اردوئے معلیٰ کی کاپیاں لکھی ہیں، خود ہی پتھروں پر جمائی ہیں اور خود ہی پریس چلا کر چھاپا ہے۔ یہ کل کائنات

اُردو پریس اور اس کے مالک کی ہے۔ کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں ہے، اور نہ ہی اس کی طبع غیور کسی کا شرمندۂ احسان ہونا پسند کرتی ہے۔ "اُسوۂ عشق" کے دو چار سو خریدار ہیں۔ اس کی قیمت سے شاید چند روپے مہینے میں بچ رہتے ہیں، اور اسی سے دو وقت کی روٹی کما کر نشۂ آزادی کی بے خودی اور دولتِ لازوال، حق و صداقت کے غبارِ غیر فانی سے مست رہتا ہے ..... ان حالات کے ساتھ ایک فقیر زندگی شخص سے تین ہزار کی ضمانت طلب کرنا یقیناً ایک واقعہ ہے جو برٹش انڈیا کی تاریخ اور گورنمنٹ کے اظہار سطوت و جلال کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا۔"

رسالے کے بند ہونے پر حسرت کا ذریعۂ معاش جاتا رہا، لیکن لیکن خوددار انسان کا سر کسی کے آگے جھکا ہوا نہیں دیکھا۔ سودیشی کا اسٹور کھولا اور باعزت طریقے سے روٹی کما کر کھائی۔ اکبر الٰہ آبادی اور مولانا شبلی کے طنزیہ اشعار اور بیانات چھپتے رہے لیکن حسرت اپنے سودیشی اسٹور میں مگن تھے بقول شبلی:

تم آدمی ہو یا جن۔ پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشن بنے اور بنے، اور اب بنیے۔"

یہی وہ بنیا تھا جو ۱۹۱۲ء میں کان پور کی مسجد کے قضیے کے سلسلے میں "سید الاحرار" کہلایا اور یہی وہ سید الاحرار تھا جس نے ۱۹۱۷ء میں مسلم لیگ کے آگرہ اجلاس میں اسی مسجد کے بارے میں وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ کے لیے شکریے کے رزولیوشن کی مخالفت کی۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران حسرت موہانی کی خانہ تلاشی ہوئی۔ اس کے بعد نظر بندی کا حکم صادر ہوا۔ باغی طبیعت حسرت نے اس کی حکم عدولی کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مئی ۱۹۱۶ء کو للت پور جیل میں حسرت موہانی دوبارہ قید ہوئے۔ حکومت کی طرف سے جو وجہ قید بتائی گئی، وہ تھی غیر ممالک سے تعلق۔

حکومتِ ہند نے محکمۂ سراغ رسانی کی خفیہ خبروں کے مطابق حسرت موہانی اور مولانا آزاد کو کابل جانے کا دعوت نامہ افغانستان کی عارضی حکومت کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ احباب نے حسرت کو مشورہ دیا کہ نظر بندی قبول کر لیں، لیکن اصولوں کے پابند حسرت نظربندی کے ستم کے سرِ تسلیم خم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ للت پور ضلع جھانسی سے اپنے ایک رفیق کو ۱۸ رمئی ۱۹۱۶ء

کی ایک نظم میں انھوں نے لکھا ہے:

"میں نظر بندی کو منظور کرکے جبر و ستم کے سامنے عاجزی اور ناچاری
کے ساتھ سر جھکا دینے کی ناقابل برداشت ذلت کو گوارہ نہیں کرسکتا۔"

جلیان والا باغ کی خونی بیساکھی ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کے بعد پنجاب کی سیاسی حالت گورنمنٹ کے لیے کافی خطرناک صورت اختیار کرگئی تھی یہی وجہ تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں رکھے گئے تھے۔ مہاتما گاندھی اور حسرت موہانی نے ان دونوں اجلاسوں میں شرکت کی۔ حسرت موہانی نے اس جلسے میں اپنی رائے پیش کی، جو کہ جلسے میں پیش کیے گئے ایک ریزولیشن کی ترمیم تھی کہ ہندستانی افواج کو نو آبادیاتی اور غیر اسلامی مقاصد کے لیے ہندستان کے باہر استعمال نہیں کیا جائے —— مہاتما گاندھی کے مشورے پر مسلمانوں نے ایک وفد نے ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو وائسرائے ہند سے ملاقات کی۔ حسرت موہانی اس وفد میں شریک تھے۔ سوامی شردھانند اور گاندھی جی بھی ساتھ تھے۔ اس وفد کے ممبران کی کل تعداد ۳۵ تھی۔ جن میں ڈاکٹر کچلو، مولانا آزاد، علی برادران، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور دیگر مسلم زعمار تھے۔ جب وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا وقت آیا تو حسرت وہاں سے غائب تھے۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں حسرت نے کانگریس کے ناگپور اجلاس میں شرکت کی۔ یہ وہ دن تھے جب کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس میں قومی رہنما بلا تفریق شرکت کیا کرتے تھے۔ اسی سال گاندھی جی نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دہلی میں شرکت کی۔ یہاں چرخے اور کھدر پر حسرت اور گاندھی جی میں بحث ہوگئی لیکن جب گاندھی نے احمد آباد کانگریس میں کامل آزادی کا ریزولیشن پیش کیا تو حسرت موہانی نے بڑھ چڑھ کر اس کی حمایت کی۔ لیکن سبجکٹ کمیٹی میں ہندستان کے استقلال کی تجویز پیش کی۔ حسرت نے بہار، کانگریس کے اجلاس میں کھلے بندوں کہا کہ کانگریس کو اپنے طریقۂ کار میں ایسی تبدیلیاں لانی چاہئیں جن سے مکمل آزادی کا نصب العین ہر ممکن اور مناسب ذرائع سے حاصل ہوسکے۔ انھوں نے تشدد اور گوریلا طریقۂ جنگ کی تبلیغ کی۔ اس سلسلہ میں کان پور میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے حسرت موہانی سے بات چیت کی۔ بھگت سنگھ کے والد سردار کشن سنگھ نے حسرت موہانی کو ایک خط لکھا تھا، جس میں حسرت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ بھگت سنگھ

کو جلد از جلد لاہور واپس آنے پہ رضامند کر لیں کیوں کہ اس کی دادی سخت بیمار ہیں۔ دراصل دراصل بھگت سنگھ شادی کے لیے تیار نہ تھے اور اسی لیے لاہور سے کانپور آ گئے تھے، اور یہاں انھوں نے ایک بم پارٹی قائم کی تھی۔ حسرت موہانی کے کہنے پر وہ لاہور لوٹ گئے تھے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ شہید بھگت سنگھ کو حسرت موہانی کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا، اور وہ اس درویش اور مردِ قلندر کے خیالات اور زندگی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

اسی سال یعنی ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس کے اجلاس کے ساتھ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی ہوا جس کے صدر حسرت موہانی تھے۔ یہاں بھی انھوں نے کہا کہ یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو ہندستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ حسرت موہانی کا خطبۂ صدارت ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ حسرت موہانی کے اس تاریخی خطبے کا لب لباب یہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مقاصد اور نصب العین ایک ہی ہیں۔ پہلے آزادی حاصل کرنی چاہیے۔ بعد میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اپنا گھریلو معاملہ ہے۔ لیکن مسلم لیگ میں دوسرے خیالات کے لوگ زیادہ تھے۔ اس خطبۂ صدارت میں انھوں نے یونائیٹڈ اسٹیٹس آف انڈیا کے قیام کا اعلان کیا۔

خطبۂ صدارت حکومت نے ضبط کر لیا اور ۲۲ اپریل ۱۹۲۲ء کو حسرت موہانی تیسری دفعہ گرفتار ہوئے۔ اس بار انھیں دو سال قید کی سزا ملی۔ رہائی کے بعد ۱۹۲۵ء میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس جو کانپور میں ہوئی، مولانا حسرت اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ خطبۂ استقبالیہ میں حسرت موہانی کمیونزم کے بارے میں فرماتے ہیں:

"بعض صریح غلط فہمیوں کی بنا پر کمیونزم کے نام سے بعض کمزور اور وہمی طبیعت کے لوگ گھبراتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خونریزی و فساد لازم و ملزوم ہیں، حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کی ضرورت و مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازمی قرار نہیں دیتے۔"

کمیونزم اور اسلام پر مولانا کی رائے سُنیئے :۔

"ہمارے بعض مسلمان لیڈر بلا وجہ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں، حالانکہ حقیقت حال اس کے خلاف ہے مثلاً کم سے کم سرمایہ داری کے خلاف اسلام کا فیصلہ شاید کمیونسٹ عقیدے سے بھی زیادہ سخت ہے اور فریضۂ زکوٰۃ کا منشا بھی زیادہ تر یہی ہے کہ خلق خدا میں جب تک ایک شخص بھی بھوکا رہے اس وقت تک مال داروں کو عیش کرنے کا کوئی حق نہیں۔ قرآن میں نماز کے بعد سب سے زیادہ زور زکوٰۃ پر ہی دیا گیا ہے۔"

۱۹۴۰ء میں حسرت مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت جیسی ہستیوں کی وجہ سے مسلم لیگ نے عوامی رنگ اختیار کیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات کو کم کرنے والے اور تعاون کے حامی حسرت کی آخر دم تک یہی خواہش رہی کہ پہلے آزادی لے لو، بعد میں حقوق کی حفاظت کی باتیں ہوں گی۔ حسرت نے گاندھی جی اور محمد علی جناح دونوں سے ٹکر لی۔ ۱۹۴۵ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر دستور ساز اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ پاکستان کے قیام اور اس کے وجود میں آنے کے بعد حسرت ہندستان میں رہے۔ آزاد ہندستان کی پارلیمنٹ کے ممبر بنے، لیکن وہی قلندرانہ انداز، وہی فقیرانہ رویہ، وہی تھرڈ کلاس کا سفر، وہی پرانی چپل۔ قیام کبھی دفتر "خدمتِ خلق" میں کبھی کسی مسجد کے حجرے میں، وہی جرأت رندانہ۔

دستورِ ہند کی تکمیل کے بعد انھوں نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ہندستان کو ایک وفاق (کنفیڈریشن) بنانا چاہتے تھے۔

سردار پٹیل اور شیخ عبداللہ سے بھی ان کی جھڑپیں ہوئیں۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۹ء کی شب جمہوریت کی شری سی راجگوپال آچاریہ کی طرف سے دی گئی دعوت میں شرکت نہ کر سکے، کیونکہ ان کے پاس نہ گھوڑا تھا نہ گاڑی، نہ موٹر، نہ سائیکل۔ لہٰذا جب راشٹرپتی بھون پہونچے تو دعوت ختم ہو چکی تھی۔ آپ نے ۱۲ مرتبہ حج کیا اور ۱۲ مجموعۂ کلام شائع ہوئے۔ حج ٹیکس کے سلسلے میں سعودی حکومت کی ہم نوائی نہ کر سکے، خدا کی درگاہ میں ٹیکس کیسا؟ لہٰذا ٹیکس

ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ سعودی عرب کی حکومت کو ٹیکس معاف کرنا پڑا۔ ۱۹۲۸ء میں ہندستانی مسلمانوں کی طرف سے قاہرہ میں منعقد فلسطین کانفرنس میں نمائندگی کی۔ ۱۹۳۹ء میں دمشق اور برطانیہ کا سفر کیا۔ ویزا نہ ہونے اور دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کی وجہ سے کئی ممالک میں گرفتار ہوئے، لیکن اپنے عزم میں ہمیشہ کامیاب ہوئے۔ ایک دفعہ جہاز نہ ملنے پر سمندر میں تیر کر جانے کے فیصلے پر تمام احباب حیران رہ گئے۔ لیکن جہاز میں ایک سیٹ مل گئی۔ کئی بار حاجیوں کے قافلوں میں پیدل شامل ہوگئے۔

ایسی رنگا رنگ، جاں نثار اصول کی پابند شخصیتیں کبھی کبھار پیدا ہوتی ہیں۔ حسرت ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے اپنا سب کچھ ملک پر نچھاور کر دیا اور اس کے عوض ملک سے کچھ بھی نہیں لیا۔ آزاد ہندستان میں ان کی صد سالہ تقریبات کو ان شایانِ شان منانا چاہئے۔ حسرت کی قربانیوں کا اعتراف ہم پر فرض ہے۔ ایک عمومی احسان قوم کو اس میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

مولانا حسرت جہاں انقلاب روس کے ہمدرد تھے، وہاں بھگوان کرشن کے پرستار بھی تھے، جنم اشٹمی کے موقع پر نظیر اکبرآبادی کی طرح متھرا میں جا کر خود عقیدت کے پھول بھگوان کی جنم بھومی میں پیش کرتے تھے۔ آپ نے کئی نظمیں بھی کرشن جی کی شان میں لکھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ سچے مسلمان تھے، اور صوفیوں کے مداح، کمیونسٹ پارٹی کے بانی۔

حسرت نے ملک کی تقسیم کو قبول نہیں کیا۔ وہی ایک لیڈر تھے جنھوں نے محمد علی جناح کو تقسیم کے خطرناک نتائج سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ متنبہ کیا۔

ایک ایماندار سیاست داں ہونے کے باوجود حسرت ایک اعلیٰ پائے کے شاعر تھے، ایک ترقی پسند شاعر جن کی شاعری میں دلّی اور لکھنؤ کے رنگ ملتے ہیں۔

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت
آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

حسرت موہانی ایک رنگین مزاج شاعر تھے۔ جو سودا۔ مومن اور نسیم کے سکول سے تھے۔ ان کی ۷۷۱ غزلوں میں سے تقریباً آدھی علی گڑھ۔ الہ آباد۔ جھانسی۔ للت پور اور

نینی تال کی جیلوں میں لکھی گئیں۔ کل ملا کے تقریباً ۲۰۰ مجموعی اشعار لکھے۔ شاید ہی کوئی ہندستان کا رسالہ یا اخبار رہو جہاں حسرت نہیں چھپے۔

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ ساماں سحر کا تھا نہ افطاری کا

حسرت کی نثر نگاری میں بھی بڑے بڑوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ مزاح میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مخزن لاہور میں مارچ ۱۹۱۷ کے شمارے میں چھپی ہوئی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کر سکتے ہیں خاموش بھی ہم دین کی خدمت
یعنی یہ نہیں شورشِ اخبار پہ موقوف
قوموں کی ترقی کے ہیں کچھ اور ہی اسباب
جو ڈاک پہ موقوف نہ ہیں تار پہ موقوف
ایسا تو نہیں ہے عنایت ہو خدا کی
زاہد کے اسی جبّہ و دستار پہ موقوف

ویسے تو ان کی صحت ۱۹۴۹ء سے ہی گرنی شروع ہو گئی تھی، لیکن ۱۹۵۰ء میں آخری حج کرنے کے بعد اُن کو الہام ہو گیا تھا کہ اب وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے۔ لکھنؤ پہنچنے کی دُھن اُن کے دل و دماغ پر سوار تھی۔ وہ بیمار بھی تھے اور کمزور بھی۔ دوا سے ہمیشہ دُور رہے اور انجکشن سے تو انھیں چڑھ تھی۔ جب کسی دوست نے حسرت سے یہ کہا کہ آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے، تو اکڑوں بیٹھ گئے اور کہنے لگے:

"میں بیمار تو ہوں، مگر بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میرا وقت اب بہت قریب آچکا ہے۔"

۲۶ جنوری ۱۹۵۱ء کو جشنِ جمہوریت میں شرکت نہ کر سکے، بیماری اور ٹرانسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے۔

۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کی صبح کو حسرت موہانی کی حالت بہت نازک ہو گئی، اور اسی دن

دوپہر کے بارہ بجے وہ اس دُنیا سے ہمیشہ کے لیے چل بسے۔

نیاز فتح پوری حسرت پر ایک خاص نمبر میں فرماتے ہیں :

"ان کی زندگی درویشانہ بلکہ قلندرانہ قسم کی تھی، اور مزاج میں حد درجہ استغنا تھا۔ انھوں نے کبھی لیڈر بننے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی بڑے سے بڑے لیڈر سے مرعوب ہوئے۔ دُنیاوی لحاظ سے وہ بڑی مختصر تمنائیں رکھنے والے انسان تھے، اس لیے ان پر کبھی مایوسی کی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔"

رشید احمد صدیقی صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ :

"سیاست کوئلے کا کاروبار ہے، جس میں سبھی کا ہاتھ تھوڑا بہت کالا ہوتا ہے سوائے حسرت کے۔ جب مولانا حسرت ہمارے بیچ نہیں رہے تو کہنا پڑتا ہے کہ زمانے نے حسرت موہانی کے ساتھ انصاف نہیں کیا، لیکن تاریخ یقیناً کرے گی۔ اس صاف گو کے ساتھ۔ اس بے خوف اس انسان دوست کے ساتھ۔ جس کا نام سیاست اور ادب دونوں میں جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ مولانا فضل الحسن حسرت سیاسی حمام میں سب کو ننگا کر دینے والا۔ اردو غزل کا اولیا۔

خلیق انجم

حسرت کا تغزل

"اُردو غزل کی ڈھائی سو برس کی تاریخ میں حسرت کا تغزل ایک نشاۃ ثانیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔" (فراق گورکھپوری)

"غزل کوئی کہہ لی کرے، غزل کا معیار حسرت ہی رہیں گے۔"

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

"حسرت نے نہ صرف غزل کو از سرِ نو زندہ کیا اور اس کو اس کی کھوئی ہوئی آبرو واپس دی، بلکہ اس کو ایک نیا وقار بخشا۔"

(پروفیسر مجنوں گورکھپوری)

ہمارے یہ سارے نقاد جن کے اقتباسات میں نے پیش کئے ہیں، اُردو تنقید کی آبرو سمجھے جاتے ہیں۔ اب اگر میں کچھ ایسی باتیں کہوں، جو ان حضرات کی آرا کے خلاف ہوں، تو سوءِ ادب ہے، اور اگر ان ہی حضرات کی رائے کو دہرا کر حسرت کے کچھ مزے دار شعر پیش کروں تو یہ حسرت اور ان کی شاعری، اور اُردو تنقید، سب کے ساتھ بے انصافی ہے۔ میں اپنے بزرگ نقادوں سے اختلاف کرنے کی گستاخی کا الزام سہے لیتا ہوں، لیکن بات کہوں گا خدا لگتی۔ جو کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

حسرت پر بات شروع کرنے سے پہلے حالی کے بارے میں تھوڑی سی باتیں کرلیں:

اپنے عہد کے کئی اور بزرگوں کی طرح حالی بھی مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے غیر معمولی حد تک متاثر ہیں۔ ان بزرگوں کا سیاسی شعور ان حالات کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکا، جو مغل حکومت

کے زوال کا سبب ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا مشرقی علم اور مشرقی فکر ہماری بربادی کا راز ہے۔ ان حضرات کے دل قوم اور ملک کے درد سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ قوم کو پستیوں سے نکال کر پھر شاہراہِ ترقی پر گامزن کریں۔ مشرقی علوم اور تہذیب کے خلاف بغاوت، لب و لہجے میں تلخی اور مغرب پرستی کی بنیاد ملک دشمنی پر نہیں، بلکہ اس خلوص پر تھی جو اُن کے دلوں میں اپنی قوم کے لیے تھے۔ اگر حالی پچاس سال پہلے پیدا ہوئے ہوتے تو اُردو کے بہترین غزل گو شعراء میں اُن کا شمار ہوتا۔ یہ اُن کا خلوص ہی تھا جس کی وجہ سے انھوں نے غزل گوئی کی اپنی بہترین صلاحیتوں کو دوسرے اور تیسرے درجے کی نظم گوئی پر قربان کر دیا۔ مقدمہ شعر و شاعری میں اُن کا لب و لہجہ تلخ، غیر منطقی اور غیر متوازن ہے۔ اُن کی تنقید کی بنیاد مغربی تنقید کے ادھورے شعور پر ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کہ غزل اُس حُسن سے محروم ہو چکی تھی جو اُسے میرؔ اور غالبؔ جیسے شاعروں نے بخشا تھا۔

خیال، جذبہ، وجدان، تخیل اور فکر سے عاری غزل کا دَور دَورہ تھا۔ عشق و محبت کے سطحی تعلقات غزل کے موضوع بنے ہوئے تھے۔ لیکن حالی نے اپنے اصلاحی جذبے کی شدت سے مجبور ہو کر اچھی اور بُری غزل میں کوئی تمیز نہیں کی۔ انھوں نے دراصل غزل کے بارے میں عقیدے کی حد تک کچھ نظریے بنائے تھے، اور پھر اُن نظریوں کی روشنی میں انھوں نے پورے سرمایۂ غزل کا جائزہ لیا۔ نتیجہ وہی ہوا، جو ایسی صورت میں ہوتا ہے۔ اُن کے نظریوں اور عقیدوں نے اُردو غزل کو قابلِ گردن زدنی قرار دے دیا۔

ان کے لہجے میں تلخی اور تلخی میں غلو پیدا ہو گیا۔ اُردو میں غزل کے خلاف پہلی آواز ماسٹر رام چندر کی تھی۔ لیکن حالی کی آواز زیادہ سنجیدہ، زیادہ مؤثر اور زیادہ گمبھیر تھی۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ حالی کے اس رویے سے اُردو غزل کو نقصان پہنچا۔ میں سوچتا ہوں کہ اس آواز نے اُردو غزل اور شاعری کو غیر معمولی فائدہ پہنچایا۔

اُردو غزل جاگیرداری نظام کے عظیم محل کے کھنڈروں میں کھڑی اپنی قسمت کے فیصلے کی منتظر تھی۔ نئے سامراجی نظام نے اسے خائف کر دیا تھا۔ چوما چاٹی کی شاعری انشا، رنگین اور جرأت نے بھی کی تھی، لیکن ان کی ایسی شاعری کی داد دینے والا حلقہ بہت محدود تھا۔ اور اب تو یہی

شاعری اور بھی پست انداز میں داغ اور امیر کے نغمے بن کر پورے ملک کے ادبی ماحول کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے، داغ اور امیر کی شاعری دراصل نئے سامراجی نظام کی حقیقتوں سے ایک طرح کا فرار تھا۔

حالی کی آواز اگرچہ غزل کے خلاف تھی، لیکن غزل کو اس آواز کا فائدہ ہوا۔ اس کے دل میں خود کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہ غزل جو جاگیرداری نظام کے کھنڈروں میں جکڑی ہوئی کھڑی تھی، ایک نئے حوصلے . . . . اور نئی سمت کے ساتھ سامراجی نظام کی کشادہ فضاؤں میں داخل ہوئی۔ اس نے ایسے جانبازوں کی تلاش کی اس کی رگوں میں نیا خون دوڑا سکتے ہوں۔ اپنے اس مقصد میں بہت جلد کامیاب ہوگئی۔ ایک طرف ادبی حلقوں میں شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی، آسی غازی پوری اور جلیل قدوائی کی آوازیں گونجنے لگیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان آوازوں میں حالی کی آواز بھی شامل تھی۔ دوسری طرف اردو میں وہ نظم گو شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے نظم گوئی میں حالی کی تقلید کی۔ یہ شعراء تھے اسمٰعیل میرٹھی، سرور جہاں آبادی، چکبست، نادر کاکوروی اور نوبت رائے نظر۔ انھوں نے مناظر قدرت اور حب وطن کے ترانے چھیڑے۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اقبال کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اگر حالی غزل کی اتنی شدت سے مخالفت نہ کرتے، اور نظم گوئی کی ترغیب نہ دیتے تو اس کا بھی امکان تھا کہ اقبال جیسا شاعر "خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی" جیسی شاعری میں الجھ کر رہ جاتا۔

حسرت جب میدانِ شاعری میں آئے ہیں تو غزل کا نشاۃِ ثانیہ شروع ہو چکا تھا، داغ اور امیر کے نغمے پھیکے پڑنے شروع ہو گئے تھے، غزل میں بھی نئی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ حسرت کچھ اس شان و شوکت سے آئے کہ ہمارے بہت سے نقادوں نے غزل کی نشاۃِ ثانیہ کا سہرا ان ہی کے سر باندھ دیا بعض ناقدوں نے حکم لگایا کہ غزل مر چکی تھی، حسرت نے اسے بھرپور زندگی دی، حالانکہ غزل کی مقبولیت کسی بھی عہد میں کم نہیں ہوئی، ہاں اس نے نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کے لیے نئے روپ ضرور بدلے۔ داغ اور امیر مینائی کی شاعری کے خلاف جو ردِعمل ہو چکا تھا اسے تیز تر کر لیا اور اس کی لے کو بلند کرنے میں حسرت نے بہت اہم رول ادا کیا۔ اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ غزل پر حالی کی نکتہ چینی کتنی ہی غلط اور بے بنیاد سہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر حالی کی مقدمہ شعر و شاعری نہ ہوتی تو شاید ہم حسرت اور اقبال جیسے شاعروں سے محروم رہتے، ان دونوں میں سے کم

اقبال کو ہم عظیم شاعروں کی فہرست میں کھڑا کرہی کرسکتے ہیں۔ داغ اور امیر مینائی کی شاعری سے خلاف جو ردعمل پیدا ہو چکا تھا، اسے تیز کرنے اور اس کی لے کو بلند کرنے میں حسرت نے بہت اہم رول ادا کیا۔

حسرت کے بارے میں پہلی اور اہم بات یہی کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے فلسفہ اور زندگی کی پیچیدگیوں کو موضوع نہیں بنایا۔ بلند خیالی اور معنی آفرینی سے دامن بچائے رکھا۔ وہ زندگی بھر دار ورسن کی کڑی آزمائشوں سے گزرتے رہے۔ لیکن انھوں نے اپنی فکر، ذہن اور دل کی دنیا کو حسن اور عشق کی رعنائیوں سے سجائے رکھا۔ حسرت فکر کے نہیں، سچے، کھرے اور معصوم جذبے کے شاعر ہیں۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اُسے ایک انداز خاص میں پیش کردیا۔ حسرت کی شاعری کے بارے میں کچھ اور کہنے سے پہلے میں انھیں کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حسرت نے "نکات سخن" میں لکھا ہے:

"ارباب نظر نے شاعری اور مصوری کو ایک ہی قبیل سے قرار دیا ہے، اس کا بنیاد یہ ہے کہ جس طرح کامیاب مصوری کے لیے لازم ہے کہ جس چیز کی نقل اُتاری جائے وہی ہوبہو تصویر میں نظر آئے۔ اسی طرح سے حقیقی شاعری کے لیے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعات محبت کے بیان میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو، اور جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو، عام اس سے کہ وہ جذبات عُلوی ہوں یا سفلی — اگر جذبات عالی ہوں گے تو شاعری جذبہ نگاری اور واقعہ نگاری کی شکل اختیار کرے گی، ورنہ معاملہ بندی ہو جائے گی، اور ہمارے نزدیک یہی تینوں چیزیں شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔"

گویا حسرت کی نظر میں اچھی شاعری کے تین اہم عناصر ہیں۔ جذبات عالی۔ جذبہ نگاری، اور واقعہ نگاری۔ مادّی محبت میں جذبات عالی کیا ہوتے ہیں۔ یہ بات میری فہم سے بالاتر ہے اور اس پر گفتگو بعد میں ہوگی۔ یہاں جذبہ نگاری اور واقعہ نگاری، دو ایسے عناصر ہیں جن پر حسرت نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اُردو میں ہمیشہ ہی سے امرد اور طوائف موضوع رہے۔ یہ کیسے

ممکن ہے کہ شعراء کو شریف خاندان کی لڑکیوں سے محبت نہ رہی ہو، اور اس محبت کا اظہار اُن کی شاعری میں نہ ہوا ہو، ہاں یہ ضرور ہوا کہ شریف خاندانوں کی لڑکیاں امرد اور طوائفوں کے راستے میں اس طرح گم ہو گئیں کہ ان کے وجود کا احساس نہیں رہا۔

حسرت سے پہلے اُردو شاعری کا محبوب امرد تھا یا طوائف۔ مومن کے ہاں پردہ نشین نظر آتی ہے، مگر اس پردہ نشین کے نقوش زیادہ واضح نہیں ہو سکے۔ جب حسرت نے ادبی دُنیا میں قدم رکھا ہے تو داغ اور امیر کی شاعری کا سہارا لے کر طوائف مصنوعی ناز و ادا، اور عشوہ طرازیوں کے ساتھ اُردو شاعری میں جلوہ افروز تھی، حسرت کا یہ سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے کہ انھوں نے طوائفوں سے یہ مقام چھین کر اس کے جائز حق داروں کو دیا۔ انھوں نے متوسط اور شریف گھرانے کی اس عورت کو شاعری میں جگہ دی جو ان کی محبوبہ ہے۔ یہ محبوبہ "با حیا" ہے محبت کرتی ہے لیکن اقرار کرتے ہوئے جھجکتی ہے۔ جاگیرداری گھرانوں کی تہذیبی وضع داری سے مجبور ہو کر انکار تو کرتی ہے لیکن اس طرح کہ اس انکار میں اقرار کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

دلِ مایوس کو گرویدۂ گفتار کر لینا
وہ اُن کا پردۂ انکار میں اقرار کر لینا

چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

حسرت کی شاعری میں جس عاشق کی تصویر نظر آتی ہے، پہلے اُسے ایک نظر دیکھ لیجیے:
اس کا عنفوانِ شباب کا عالم ہے، جنسی جذبات کی شدت نے اس کا لہو گرم کر رکھا ہے اس کے وہ تمام جنسی اور مطالبے ہیں جو ایک صحت مند اور توانا جسم کے ہوتے ہیں، لیکن اس میں خاندانی روایات کی شائستگی بھی ہے اور سماجی وقار کا رکھ رکھاؤ بھی، نا تجربہ کاری کی حیا بھی ہے اور انفرادیت کی معصومیت بھی۔ وہ محبوب کو گرم آغوش میں بھینچ کر اپنی شدید جنسی پیاس کو بجھانا چاہتا ہے، لیکن اس میدان کی ابتدائی منزلیں کڑی ہیں، وہیں قدم ڈگمگانے لگتے ہیں ۔

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی　　روبرو اُن کے مگر آنکھ اُٹھائی نہ گئی
ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی اُن کا　　جستجو کی کوئی تمہید اُٹھائی نہ گئی

دیکھنا بھی تو انھیں دُور سے دیکھا کرنا　　شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا

حسرت عشق و محبت کی نفسیات سے خوب واقف تھے:

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی　　دُشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی　　ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں

سکھا دی ہیں نرالی شوخیاں کچھ لطف جاناں نے　　مرے دست تمنا کی شرارت بڑھتی جاتی ہے

تاثیر برق حُسن جو اُن کے سخن میں تھی　　اک لرزش خفی مرے سارے بدن میں تھی

حسرت کی سماجی حیثیت اور شاعری میں بہت بڑا تضاد ہے۔ سماج میں اُن کا تصور جنگ آزادی کے ایک مجاہد اور ایک صاحب نسبت صوفی کا تھا۔ جب کہ ان کی شاعری کا جو حصہ جس نے انھیں اپنے عہد کے بڑے غزل گو شعراء میں جگہ دلائی، سو فی صدی مادی عشق پر مبنی ہے ان اشعار میں متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کے حسین اور رنگین جسم نظر آتے ہیں۔ حسرت کے ناقدین کے لیے ان لڑکیوں کا جواز پیدا کرنا خاصا دشوار مسئلہ تھا، لیکن حسرت کے کلیات میں دو چار شعر ایسے مل گئے جن سے ان ناقدین نے اپنا مسئلہ کافی حد تک حل کر لیا۔ وہ شعر یہ ہیں:

دیار شوق میں برپا ہے ماتم مرگ حسرت کا　　وہ وضع پارسا اُس کی وہ عشق پاکباز اُس کا

ولایت کا دعویٰ نہیں مجھ کو لیکن　　ہے اتنا کہ ہوں اک گنہ گار صالح

حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورت حق نما　　گو اس کی نظر شیفتۂ حُسن بتاں ہے

سیہ کار تھے، باصفا ہو گئے ہم　　ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

بُتانِ ماہ وَش کے حُسن پر ایمان لایا ہوں　　انھیں کو دیکھ کر ہوتی ہے اب یادِ خدا مجھے

اِن اشعار کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کیا گیا کہ حسرت کا عشق "پاکباز" تھا۔ انھیں ہوس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے "وہ وضع پارسا اس کی، وہ عشق پاک باز اس کا" والے شعر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس شعر میں حسرت نے اپنے شاعرانہ مسلک کی طرف بھی خفیف سا اشارہ کر دیا ہے تاکہ بعد میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہ رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی شاعری کا اصلی محرک ان کا عشقِ پاک باز ہے۔ .... حسرت کی زندگی کوئی ڈھکی چھپی نہیں، جسے دُنیا نہ جانتی ہو۔ اُن کی پرہیزگاری پر اُن کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔ انھوں نے عمر بھر عشق بازی کی، اور بتوں کے ناز اُٹھائے۔ لیکن ان کی عشق بازی کا دامن پارسائی سے بکار رہا۔"

میں ایک عام انسان ہوں، اور عام انسان کی حیثیت سے میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ عشق میں پاکبازی کیا چیز ہے؟ اپنی ذاتی عقیدت کی وجہ سے ہم جس کو چاہیں پاکباز ثابت کر دیں لیکن حقیقت میں شاعر اور اس کے فن کے ساتھ سخت ترین ناانصافی ہے۔ "عشقِ پاک باز" کا ذکر حسرت نے دو تین سے زیادہ شعروں میں کیا ہے ہم نے اُسے تو بنیاد بنا لیا، لیکن بہت بڑی تعداد میں اُن اشعار کو نظرانداز کر دیا جن میں سو فی صدی جسم کی محبت ہے۔ اور ناقدین نے نقطۂ نظر کے مطابق "ہوس" ہے۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہم چھین کے لے بھی گئے پان آپ کے مُنہ کا　　کہتے رہے آپ کہ دیں گے نہ دیا ہے

مل گیا اچھا سہارا عذرِ مستی کا ہمیں　　لے لیا آغوش میں اس گل کو بیباکانہ آج

اے شوق کی بیباکی وہ کیا تری خواہش تھی　　جس پر انھیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

حائل تھی بیچ میں جو رزائی تمام شب　　اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

وہ خوابِ ناز میں تھے، اور نہ تھے، اے شوقِ پابوسی
نہ سمجھی پستیِ ہمت تری اس لطفِ ایما کو

ہم تھے بے باک اور وہ محجوب　　شب، عرضِ لطفِ بے حساب اُٹھا

گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ　　لیکن ہجومِ شوق نے مجبور کر دیا

اس عاشقِ پاکباز کے دو شعر اور سُن لیجئے:

شوق کی بے تابیاں حد سے گزر جانے لگیں
وصل کی شب وا، جو وہ بندِ قبا ہونے لگے

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں، وہ شب کو ہم سے
رسمِ پابندیِ اوقات چلی جاتی ہے

میں حسرت کے کلیات میں سے بہت بڑی تعداد میں ایسے شعر نکال سکتا ہوں جو حسرت کے مزاج کے خلاف ہیں، جن کا حسرت کو تجربہ ہوا نہ مشاہدہ۔ ان اشعار میں اُردو غزل کے روایتی مضامین بیان کئے گئے ہیں، اور یہ بیان صرف ردیف اور قافیے کی مجبوری سے ہوا ہے۔ جن حضرات نے حسرت کے سوانح کا مطالعہ کیا ہے، وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ اس کا امکان بہت کم ہے کہ حسرت کو شاہدانِ بازاری سے واسطہ پڑا ہو۔ پھر بھی اُن کے بعض اشعار میں جو محبوب نظر آتا ہے اس پر "شاہدِ بازاری" کا گمان ہوتا ہے۔ حسرت کی شاعری میں یہ شاہدِ بازاری روایتی مضمون اور ردیف و قافیے کی مجبوری کے راستے داخل ہوئے ہیں۔ آپ بھی ذرا اس محبوب کے دیدار کر لیجئے:

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال　　شام دیکھو نہ مری جان، سویرا دیکھو

حسرت کے ہاں "غیر" کا بہت کم ذکر ہے۔ لیکن ان اشعار میں ان دونوں کا ذکر بھی دیکھیے:۔

تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

پڑی تھی بزمِ رقیباں میں ایسی کیا اُفتاد
کہ بات بھی نہیں تم سے بنائی جاتی ہے

ہمراہِ غیر آ کے اُڑائی مری ہنسی
خوب آپ خاطرِ دلِ رنجیدہ کر چلے

یہ آج ہم سے جو چاہت جتائی جاتی ہے
عدو سے ملنے کی خفت مٹائی جاتی ہے

آپ کے وعدے کی شب کھا کر فریب
سیج کس کس شوق سے ہم نے سجائی آپ کی

"عشقِ پاکباز" اور "گنہگارِ صالح" مفہوم کے اشعار کی تلاش میں پورے کلیاتِ حسرت کا مطالعہ کرنا ہوگا، تب کہیں دو، تین شعر اور ملیں گے، جب کہ جو اشعار میں نے نقل کیے ہیں اس انداز کے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شاعری میں اور خاص طور سے غزل میں ایک شاعر اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتا ہے جو اکثر اوقات ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ متضاد ہوتے ہیں۔ شاعر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے وہ اشعار ہماری مدد کرتے ہیں، جن میں ایک ہی طرح کے مفہوم کی تکرار ہوتی ہے۔ کیوں کہ ردیف قافیے کی مجبوری کی وجہ سے بعض اوقات شاعر ایسا مفہوم بھی ادا کر دیتا ہے جو اُس کا عقیدہ نہیں ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ "عشقِ پاکباز اور گنہگارِ صالح" والے حسرت کے دو نوں شعر ردیف اور قافیے کی مجبوری کی مرہونِ منت ہیں۔ ایک دفعہ ان اشعار پر پھر نظر ڈال لیجیے۔ بعض اوقات شاعر ردیف قافیے کی مجبوری کی وجہ سے ایسی باتیں بھی کرتا ہے جن کا اُسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا اور جن پر اس کا عقیدہ بھی نہیں ہوتا۔

حسرت نے بہت سے اشعار اور نثر دونوں میں عشقِ مجازی (غیر پاک بازانہ) اور حسن پرستی کی حمایت کی ہے۔ یہ چار شعر ملاحظہ ہوں:

مجازی عشق بھی اک شئے ہے حسرت ۔۔۔ ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی

کیا حسن پرستی بھی کوئی جرم ہے حسرت ۔۔۔ ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے

حسن ہو جس میں وہ ہر شئے جلوہ گر اس دل میں ہے

جذبہ صورت پرستی میرے آب و گل میں ہے

ہم عرض مند کہاں مرتبۂ عشق کہاں ۔۔۔ ہم کو کبھی نہ ہوس کار تو بیجا کیا ہو

ظاہر ہے کہ پاک مجازی عشق اور روحانی، حسن پرستی کے خلاف تو اخلاق کی تنقید کڑی نہیں ہو سکتی۔

حسرت نے شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق صرف آمد سے ہے۔ ...... دوسری وہ جس میں آورد ہی آورد پائی جاتی ہے، اور تیسری وہ جس میں آورد و آمد دونوں پائی جاتی ہیں۔ آمد کی بھی انھوں نے تین قسمیں کی ہیں۔ عارفانہ، عاشقانہ اور فاسقانہ، اسی طرح آورد کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ ناصحانہ، ماہرانہ، صناعانہ اور آورد و آمد کی شاعری کی تین قسمیں شاعرانہ واعظانہ اور رباعیانہ ظاہر کی ہیں۔ عاشقانہ شاعری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:-

عاشقانہ شاعری کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ جس میں جذباتِ شوق کی صحیح کیفیت نگاہِ حق شناس کے روبرو عشق کو خدا تعالیٰ کی اس شان میں پیش کرتی ہے کہ جس کی نسبت نظامی نے ہو اللہ فرمایا اور جسے مولانا روم نے اپنی تمام علتوں کی دوا قرار دیا۔ ایسی شاعری کی ایک سرحد تصوف اور عشق کے قریب اور دوسری عشقِ مجازی اور پاک محبت سے ملحق ہوا کرتی ہے۔ اردو زبان میں تصوف اور عشقِ حقیقی کا

مذاق شاذ ہے۔ البتہ محبت کے جذبات میرؔ و مصحفیؔ یا دردؔ اور قائمؔ کے کلام میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ عاشقانہ شاعری کی دوسری قسم وہ ہے جس میں پاک اور بے لوث عشق کے بجائے ہوس پرستی کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچی گئی ہے جس کے نمونے جرأتؔ میاں رنگینؔ اور انشاءؔ کے کلام میں بہ کثرت ملتے ہیں۔"

فاسقانہ شاعری کے بارے میں حسرتؔ نے لکھا ہے:

"فاسقانہ شاعری کو بد مذاقی پر محمول کرنا یا سوقیانہ و مبتذل قرار دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلّم ہے تو پھر اس کے دائرہ کو صرف پاک جذباتِ عشق و محبت تک محدود کر دینے اور عامۂ خلائق کے ۹۹ فی صدی جذباتِ ہوس کو اس سے خارج کر دینے کی کوشش نہایت بدمذاقی اور بے شعوری ہے۔ البتہ اس ضمن میں اعتدال سے گر جانا جیسا کہ رنگینؔ کی بعض ریختیوں اور جان صاحب و صاحبقراں کے مبتذل اشعار میں پایا جاتا ہے بے شک قابلِ اعتراض ہے۔ مگر ایسے کلام کو فاسقانہ کے بجائے فاحشانہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔"

حسرتؔ کے وہ تمام اشعار جن پر اُن کی شہرت اور مقبولیت کی بنیاد ہے، زیادہ تر عاشقانہ اور کچھ اشعار فاسقانہ شاعری کے تحت آئیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسرتؔ کو اپنے جن اشعار پر فخر تھا، ان کے بعض ناقدین انہی اشعار سے شرمندہ ہیں، اس لیے اُن کی طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتے ہیں۔

ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کے نام پر جب فحش نگاری اور عریاں نگاری کو فروغ حاصل ہونے لگا تو بعض حضرات نے اس پر پابندی لگانے کا ارادہ کیا۔ اس واقعے کی نقل پروفیسر احتشام حسین کی زبانی سُنئے:۔

"اکتوبر ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا سالانہ اجلاس حیدرآباد دکن میں منعقد ہوا۔ مولانا حسرتؔ موہانی بھی اس میں شریک ہوئے۔ ایک اجلاس میں جس کی صدارت راقم الحروف ہی کر رہا تھا۔ یہ تجویز پیش ہوئی کہ فحاشی

اور عریانی وغیرہ سے ترقی پسندی کا تعلق نہیں اور جو ادیب اسے اپنا مطمع نظر بناتا ہے، وہ ترقی پسند نہیں۔ تجویز کی مخالفت میں سب سے پہلے جو آواز بلند ہوئی، وہ مولانا کی تھی۔ حقیقت نگاری اور لطافتِ بیان کے نام پر انھوں نے اس کا ایسی مخالفت کی کہ اس وقت اس بحث کو ملتوی کرنا پڑا، اور طے ہوا کہ . . . مولانا کے مشورے سے تجویز کے بجائے ایک بیان اس سلسلے میں شائع کیا جائے۔"

اس تمام بحث سے یہ بتانا مقصود تھا کہ عشقِ مجازی میں "پاک بازی" اور "غیر پاک بازی" . . . نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ عشقِ مجازی، صرف عشقِ مجازی ہوتا ہے۔ اگر عاشق اپنے محبوب کی اداؤں اور اس کے جسم سے لطف اندوز ہوتا ہے تو یہ ایک فطری عمل ہے، ہاں اگر ذہنی رشتہ قایم کیے بغیر، صرف وقتی طور پر، صرف جسم کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ملاپ کیا جائے تو ماہرینِ نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ بھی فطری عمل ہے لیکن بوالہوسی کہا جائے گا۔ شاہدانِ بازاری سے عام طور پر لوگوں کا یہی رشتہ ہوتا ہے۔ بوالہوسی کا مقصد محض جنسی طلب ہوتا ہے جب کہ عاشق محبوب کے ذہن، جسم اور ہر ہر ادا سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بوالہوس کا کوئی ذہنی رشتہ نہیں ہوتا، جب کہ عاشق کا اپنے محبوب سے ایسا ذہنی رشتہ قایم ہو جاتا ہے، جو بعض اوقات زندگی بھر قایم رہتا ہے۔ اسی لیے کوئی بھی ماہرِ نفسیات محبوب سے اُس کے عاشق کے تعلقات کو عشقِ مجازی اور ہوس کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ جسم کی ضرورتیں عاشق کی بھی ویسی ہی ہوتی ہیں جو محبوب کی۔ یہ اور بات ہے کہ محبوب پر سماجی پابندیوں کی نظر زیادہ کڑی ہوتی ہے۔

اس لیے حسرت کے ساتھ سب سے بڑا انصاف یہ ہوگا کہ انھیں پاکباز ثابت کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

حسرت کی محبت میں اس زمین کی مہک ہے۔ ان کے اشعار میں وہ اور اُن کا محبوب دونوں اس زمین پر رہنے والے گوشت پوست کے انسان نظر آتے ہیں۔ اسی لیے کلامِ حسرت میں ہمیں اپنے محبوب کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اب ہم حسرت کے اس محبوب کی تصویر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جو ان کے اشعار

یں جلوہ گر ہے۔ اس تصویرکشی میں صرف اُن اشعار کا سہارا لوں گا جو میرے خیال سے حسرت کے اصل مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ ورنہ اُن کے کلام میں ہر طرح کے اشعار ہیں جن پر خاصی گفتگو ہو چکی ہے۔

ذرا یہ ادائیں دیکھیے:۔

چھپ کے اُس نے جو خودنمائی کی　　انتہا تھی یہ دلربائی کی

مایوس بھی تو کرتے نہیں تم زراہِ ناز　　تنگ آ گئے ہیں کشمکشِ امتحاں سے ہم

مجھ سے بگڑے ہیں وہ کہ تو نے یہ کیا کیا　　سب میں مشہور کر دیا ہم کو

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے　　ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

دیکھا جو مجھے گرمِ نظر بزمِ عدو میں　　وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر

اس نے ہم سے سنی جو شوق کی بات　　ہنس کے پوچھا یہ کس زبان میں ہے

ان اشعار میں جاگیرداری خاندان کی ایک لڑکی کی تصویر اُبھرتی ہے جو کم عمر ہے الھڑ اور شوخ ہے جسے حسرت کی شدید محبت کا خوب اندازہ ہے اور اس لیے وہ اس کے ناز انداز کچھ زیادہ ہیں جو اپنے جسم کی رعنائیوں سے خوب واقف ہے۔

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

سادگی ہائے تمنا کے مزے جاتے رہے　　ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خود آرا ہو گیا

گر چہ ہے پردۂ انکار میں شرمِ شکلِ عتاب　　پھر بھی ہے صاف نمایاں وہ اجازت کی نظر

اک رنگِ اختلاف بھی اس بے رخی میں تھا　　اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن　　آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

اب ذرا محبوب کا جسم اور لباس دیکھیے۔ رنگ اور خوشبو یہ دونوں ہی حسرت کو دیوانہ بنا دیتے ہیں۔

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

رنگ تیری شفق جمالی کا　　اک نمونہ ہے بے مثالی کا

محجوبی و رنگینی ہے جزوِ بدن تیرا　　سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

سونگھی تھی ہوا اک بار وہ خوشبوئے گریباں　　اب تک اسی بوئے گریباں کا نشاں ہے

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

زلفِ شب رنگ، پہ گلنار لباس کی بہار　　آج حسرت نے رخِ یار میں کیا کیا دیکھا

میری اس پوری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کے کلام کی خصوصیات کو اگر مختصر لفظوں

میں کہنا ہو تو یوں کہا جائے گا۔ کہ حسرت کی شاعری سچے اور کھرے جذبے کی شاعری ہے۔ اُن کے لب و لہجے میں ایک ایسی معصومیت اور لطافت ہے کہ سُننے والوں کے دل پر اُن کے اشعار کا خوشگوار اثر ہوتا ہے۔ حسرت نے شاعری کی دُنیا میں خود کو حُسن و عشق تک ہی محدود رکھا۔ داغ اور امیر نے غزل کو پستی اور ابتذال سے ہمکنار کر دیا تھا، حسرت اُن شاعروں میں ہیں جنھوں نے غزل کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلایا۔

اُن کی شاعری میں فکری پیچیدگیاں نہیں ہیں۔ انھوں نے زبان، محاورے، روزمرّہ، صنائع اور بدائع کے سہارے اپنے اشعار کو چٹخارے دار بنانے کی کوشش نہیں کی، جو محسوس کیا اُسے بہت بہت سادہ لیکن خوب صورت الفاظ میں پیش کر دیا۔ اس لیے حسرت اُردو کے اُن چند شاعروں میں ہیں جنھیں تاریخِ ادبِ اُردو میں قابلِ احترام مقام ملے گا۔

اب آئیے حسرت کی سیاسی شاعری کی طرف ـــــ اُردو ادب کے بہت سے طالب علموں کے ذہن میں بجا طور پر یہ سوال آتا ہے کہ حسرت کی ساری زندگی سیاست کے میدان میں بلکہ دار و رسن کی آزمائش میں گزری، لیکن اُن کی شاعری پر اس سیاسی زندگی کا وہ اثر نظر نہیں آتا جو ہونا چاہئے تھا۔ ہمارے خیال سے اس کے کئی وجوہ ہیں۔ سب سے پہلی اور اہم وجہ یہ ہے کہ ان کی منقسم شخصیت تھی۔ وہ جنگِ آزادی کے مجاہد بھی تھے اور بہت نرم و نازک دل رکھنے والے شاعر بھی۔ انھوں نے اپنی ان دونوں حیثیتوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ رکھا۔ ۔ ۔ ۔ انھوں اپنے خیال و تخیل کی دُنیا کو عشق و محبت کے حسین تصورات سے سجا رکھا تھا اور اس محفل میں سیاسی افکار کا گزر نہیں تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ حسرت میں اپنے ملک و قوم کے لیے بے مثال خلوص تھا۔ دل میں برطانوی حکومت کے خلاف ایسی شدید نفرت تھی کہ ساری زندگی وہ باغی رہے۔ ان میں آہنی عزم تھا جس کے سہارے انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن کبھی گردن نہیں جھکائی۔ وہ میدانِ جنگ کے ایک جانباز اور دلیر سپاہی تھے، رہنما نہیں۔ رہنما اس لیے نہیں بن سکے کہ اُن میں سیاسی شعور کی کمی تھی، وہ اُلجھے ہوئے اور پیچیدہ سیاسی حالات اور واقعات کا تجزیہ کرکے صحیح راستے کا تعین نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے مزاج میں بغاوت کی وہ آگ تھی جو صحیح فیصلے نہیں کرنے دیتی۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ بہت زیادہ جذباتی اور باغی ذہن رکھنے والے مجاہد

امیاب نہیں رہے۔ ان بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خاں اور سبھاش چندر بوس جیسے مجاہدین بھی
امل ہیں۔ رہی سہی کسر حسرت کی تلون مزاجی اور حق و صداقت کے برملا اظہار نے پوری کردی۔
سرت کے مزاج میں تھوڑی بہت آمریت بھی تھی۔ وہ اپنے فیصلوں کے مقابلے میں دوسروں کے
یصلوں کو قطعی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہی واحد حقیقت
ے۔ ہم عقیدت و احترام میں حسرت کو سیاسی میدان میں جو مرتبہ چاہیں دیں، لیکن حقیقت یہ ہے
ہ وہ ایک ناکام مجاہد آزادی تھے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی زندگی
ا آغاز کانگریس سے کیا۔ جب کانگریس میں اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے دو گروہ بنے تو
سرت انتہا پسندوں میں شامل ہوئے۔ پھر مسلم لیگ میں چلے گئے۔ اُس سے بد دل ہوئے تو کمیونسٹ
ارٹی کی تشکیل کی۔ کچھ دنوں بعد پھر مسلم لیگ سے مفاہمت کرلی۔ غرض اُن کی تلون مزاجی نے کہیں
رام سے بیٹھ کر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ جلد جلد ان تبدیلیوں کی وجہ یہ تھی کہ حسرت میں سیاسی فکر،
جذباتی ٹھہراؤ، مصلحت بینی اور دوراندیشی کا فقدان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کا جذبہ اور تخیل سیاسی فکر
سے محروم رہے۔ حسرت بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اگر اُن کے بہترین اشعار کا انتخاب کیا جائے تو
تقریباً سب اشعار کا موضوع عشق و محبت ہوگا۔ اور یہ وہ اشعار ہوں گے جن میں حسرت کا تجربہ
اور مشاہدہ جذبے اور تخیل سے ہم آہنگ ہے۔ حسرت نے خاصی تعداد میں سیاسی اشعار بھی
کہے ہیں۔ ان اشعار میں سیاسی زندگی کے تجربات بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ سب اشعار شعری حسن
سے محروم ہیں۔ ان کا لب ولہجہ غیر شاعرانہ، سپاٹ، بے رنگ، غیر مؤثر اور بیانیہ ہے۔ ان اشعار
کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے روایتی مضامین کی تک بندی کی گئی ہو۔ ان اشعار میں تجربہ ہے، لیکن
احساس اور جذبہ نہیں۔ یہ اشعار شعری تجربے کی دین نہیں۔ ان میں تخلیقی فکر بھی نہیں۔ یہ تجربے سو
فی صدی حسرت کے اپنے تھے لیکن فن کارانہ انکشاف سے محروم ۔۔۔ سیاسی افکار کے اظہار میں
اگر غزل کی ایمائیت اور رمزیت سے کام لیا جائے، تو وہ ان اشعار کی طرح زندۂ جاوید
ہو جاتے ہیں۔

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

(بقیہ صفحہ ۱۷۱ پہ)

ایم حبیب خاں

علی گڑھ تحریک اور حسرت موہانی

ہندوستان میں جو نظام معاشرت صدیوں سے چلا آرہا تھا اب اس کے تمام ستون جڑ چھوڑ چکے تھے، ہر طرف افراتفری اور لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ مغلیہ سلطنت آخری سانس لے رہی تھی۔ اس کو زندگی دینے والا اب دور دور نظر نہ آتا تھا۔ دلی جو پائے تخت تھا اس پر نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں حملہ کر کے اس کی بہاروں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد احمد شاہ اور مرہٹوں نے دلی کی رہی سہی حالت کو تہس نہس کر دیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے حکمرانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا اور انھوں نے جگہ جگہ اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کر دیں۔ بالآخر حکومت نے پھر کروٹ بدلی اور غدر ۱۸۵۷ء ہوا جس نے ہندوستان کے پورے معاشرہ کو کھوکھلا کر دیا۔ حتیٰ کہ یہاں کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو گئی، کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ پروفیسر احتشام حسین نے اس دور کی معاشی، سماجی اور تہذیبی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ قابلِ توجہ ہے:

"ماضی کا غم، حال کی پریشانی، مستقبل اور تاریخ کی رفتار سے ناواقفیت، ایسے نئے حالات کی پیدائش، ایسے نئے عناصر کی موجودگی جن سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ قدیم رشتوں کی شکست اور نئے روابط کا واضح شکل میں موجود نہ ہونا، حکومت کی ایک بساط اُلٹ کر دوسری بساط کا بچھ جانا۔ تجارت صنعت و حرفت سے نئے طریقوں کا رواج، پریس اور اخبارات، نئی تعلیم

- اور نئے وسائل آمد و رفت اور انھیں کے ساتھ مذہب کے مٹنے کا خوف ـــــ یہ ساری باتیں ایسی تھیں کہ انھوں نے بہ یک وقت پیدا ہو کر شاعروں اور ادیبوں کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ سب بنے بنائے راستوں پر جانا ممکن نہ تھا اور نئے راستے اچھی طرح بنے نہ تھے۔ پرانے خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا۔ نئے خیالات نے ذہنوں میں جگہ نہیں بنائی تھی۔"[1]

ان حالات کی روشنی میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے سوچنا شروع کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے... شعور کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ اس گڑھے سے نکل کر اپنے ذہن کو نئے راستوں پر لگا دیں۔ قوم کی ذہنی بیداری کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اس تبدیلی کے بغیر نئے وسائل کی تلاش ممکن نہیں۔ اس کے لیے ایک ایسے رہبر کی اور مصلح قوم کی تلاش تھی جس کے دل میں قومی شعور کو بیدار کرنے کا جذبہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ حکومت سے ٹکر بھی لے سکے اس وقت خوش قسمتی سے قوم کو ایک ایسا رہبر اور مدبر مل گیا جسے ہم سید احمد خاں کے نام سے پکارتے ہیں۔ سید احمد خاں جس دور میں دلّی میں پیدا ہوئے وہ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، قومی، تہذیبی اور مذہبی زوال کا زمانہ تھا۔ اس گھٹے ہوئے ماحول میں مسلمان اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ توہم پرستی اور قدامت پرستی نے پورے ملک کے معاشرے کو جکڑ لیا تھا، سرسید نے جب دلّی میں ہوش سنبھالا تو انھوں نے اپنے گرد و پیش مسلمانوں کو اسی ماحول میں جکڑا ہوا پایا۔ لیکن اس اعتبار سے وہ بہت خوش قسمت تھے کہ ان کو علمی و ادبی ماحول بہت اچھا ملا۔ اس سلسلے میں شبلی نعمانی کی رائے نہایت جامع اور وسیع ہے:

"سرسید کی جس زمانے میں نشو و نما ہوئی، دہلی میں اہل کمال

---

[1] عکس اور آئینے، احتشام حسین ۱۹۶۲ء ص ۱۱۵

کا مجمع تھا۔ ... سر سید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صدر الدین آزردہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا اور ان ہی بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا کہ سر سید نے ابتدائی دور میں جو مشغلہ اختیار کیا وہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ تھا۔ اول اول رواج عام کے مطابق شاعری کے میدان میں آئے، آہی تخلص اختیار کیا اور آزردہ میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جس کا ایک مصرع، ان ہی کی زبان کا سنا ہوا مجھے یاد ہے:

"نام میرا تھا، کام ان کا تھا

"لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کو شاعری سے مناسبت نہ تھی۔ اس لیے جلد ہی وہ اس کوچے سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی"۔[1]

ان بزرگوں کی صحبت سے سر سید نے بہت کچھ حاصل کیا البتہ شاعری کے کوچے کو ترک کر دیا اور یہ انھوں نے بڑی دانشمندی اور دور اندیشی کا کام کیا اگر وہ شاعری کے ڈھرے پر پڑ جاتے تو وہ ایک اعلیٰ درجے کے صحافی اور نثر نگار تو ہو سکتے تھے لیکن قوم کے لیڈر نہ بن سکتے تھے۔ ان کے قومی اور ملی جذبے نے ہی مسلمانوں کے دکھے ہوئے دلوں کی آواز سنی اور ان کی پس ماندگی اور زبوں حالی کو دیکھ کر ان کا بے چین دل تڑپ اٹھا، اور وہ مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کا ذریعہ تلاش کرنے لگے۔ ان کا بیدار ذہن، مسلمانوں کو سرخ رو دیکھنا چاہتا تھا۔ بالآخر انھوں نے اس کا حل تلاش کر لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے:

قوم میں تعلیم و تربیت نہیں تھی اور انگریزوں کو جن کو خدا نے ہماری

---

[1] سر سید مرحوم اور اردو لٹریچر (مقالات شبلی حصہ دوم، طبع دوم) ص ۵۸

قوم پر مسلط کیا ہے ۔میل جول اور اتحاد نہ تھا" [1]

جدید تعلیم اور انگریزوں سے میل جول اور اتحاد قائم رکھنا ہی مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کا ذریعہ بن سکتی ہے ۔ان کے بیشتر خطوط اس نئی جہت کی تلاش کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ چنانچہ سرسید نے ایک فارسی مدرسہ اپنے زمانۂ ملازمت میں ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں اسی غرض سے قائم کیا مگر ان کو وہاں کا ماحول راس نہ آیا اور ۱۸۶۱ء میں . . . ان کا تبادلہ غازی پور ہو گیا جہاں انھوں نے ایک اور اسکول جدید تعلیم کی غرض سے قائم کیا ۔یہاں ان کو مراد آباد کے مقابلے میں کھلی ہوا اور سوچنے سمجھنے کے اچھے مواقع ملے اور یہیں کرنل گریہم سے ان کی دوستی ہوئی ان ہی کے مشوروں سے سرسید نے اپنے آیندہ کاموں کے منصوبوں کو مرتب کیا ۔لیکن چند سال قیام کرنے کے بعد ان کی طبیعت نہ لگی اور وہ غازی پور سے علی گڑھ چلے آئے اور اس کو انھوں نے اپنی ساری جدوجہد کا مرکز قرار دیا ۔سرسید نے علی گڑھ میں رہ کر مغربی علوم اور جدید تعلیم کی طرف اپنی پوری نگاہیں مرکوز کر دیں ۔ ۱۸۶۸ء میں سرسید کی ملاقات حالی سے شیفتہ کے یہاں ہوئی [2] سرسید نے حالی سے مسدس لکھوائی اور قوم کو پستی سے نکالنے میں مسدس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ۔اس لیے علی گڑھ تحریک کو تقویت دینے والوں میں سرسید اور حالی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں حالی نے "مسدس" لکھ کر قوم کو پستی سے نکالنے کا ذریعہ بتایا اور انھیں تعلیم و تربیت کے طریقے سمجھائے ۔ انھوں نے ادب کے افادی پہلوؤں پر بھی خاص طور پر زور دیا اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے گر سکھائے ۔

۱۸۶۹ء میں سرسید اپنے دونوں صاحبزادوں سید محمود اور سید حامد کے ہمراہ انگلستان گئے اور وہاں نئی تہذیب اور تعلیمی نظام کا جائزہ لیا ۔ انگلستان

---

[1] سرسید : مجموعہ لکچر ص ۹ [2] حالی کا ذہنی ارتقا : ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ص ۲۱ ج ۔

میں سرسید کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اس کی بڑی وجہ "اسبابِ بغاوت ہند" کی اشاعت تھی۔ وزیر ہند نے (ڈیوک آف ارگایل) جو ان دنوں وہیں تھے سرسید کو ایٹ ہوم پر مدعو کیا۔ اس دعوت میں ان کے دونوں بیٹے بھی مدعو تھے، لندن کی مشہور ہستیاں اور رؤسا نے اس دعوت کی رونق کو دوبالا کردیا تھا: ۶ اگست ۱۸۶۹ء کو ان کی خدمات کے صلے میں ملکہ وکٹوریا کی طرف سے انھیں سی۔ ایس آئی کے خطاب سے نوازا گیا۔ ایک ہندوستانی مسلمان کے لیے یہ انتہائی خوشی کا مقام تھا۔ وہاں سے کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی بھی گئے جہاں کے طریقۂ تعلیم کا بغور مطالعہ کیا۔ دسمبر ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپس آکر رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعے انھوں نے اپنی اصلاحی تحریک قوم تک پہنچائی۔

۱۸۷۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کا باقاعدہ سنگ بنیاد رکھا گیا۔ سرسید انگلستان سے جو خاکہ عمارتوں کا اپنے ذہن میں لے کر آئے تھے اس کو عملی شکل دی اور ایم اے او کالج کی عمارتیں وہاں کی عمارتوں کی طرز پر تعمیر کرائیں۔ لیکن انھوں نے ان عمارتوں میں مسلم طرز تعمیر کی جھلک کو برقرار رکھا۔ اس کالج نے مسلم ملت کی تشکیل میں ایسا اہم کردار ادا کیا کہ مسلمانوں کو مایوسی سے نکال کر بار آور سرگرمیوں کی طرف لگا دیا اور انھوں نے ایسی نسل کی آبیاری کی جو صدیوں سے بے سہارا تھی۔ سرسید وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے برعظیم میں ایک متحدہ مسلم ملت کے خیال کو زندہ کیا۔ اس طرح ایم۔ اے۔ او کالج ایک ادارہ بھی تھا اور ایک تحریک بھی۔ اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید کی جدید تعلیم کی بدولت مسلمانوں نے جدید مغربی علوم اور ان کے نظریات سے واقفیت حاصل کی۔ جن نامساعد حالات میں علی گڑھ کالج کا قیام عمل میں آیا وہ ایک اہم کارنامہ تھی۔ بلکہ اس دور کا عہد ساز واقعہ ہے جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کا جدید علوم و فنون سے سرفراز کرنا تھا کیونکہ اس کے بغیر مسلمانوں کی پس ماندگی دور نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سرسید کا مقصد جدید تعلیم سے مسلمانوں کو روشناس

کرانا ہی نہ تھا بلکہ نئے تقاضوں سے مسلمانوں کو ہم آہنگ کرانا بھی تھا تاکہ وہ معاشی ضرورت کا احساس کر سکیں۔ ان کا مقصد جدید تعلیم سے یہ بھی تھا کہ مسلمان بھی تعلیم حاصل کرکے اعلیٰ عہدوں پر اور دیگر اداروں میں انگریزوں کے دوش بدوش سرکاری ملازمتوں میں لیے جائیں اور یہ بغیر جدید تعلیم کے ممکن نہ تھا۔ اپنے اس مقصد کے لیے سرسید کو ہندوستان کے بعض گوشوں سے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جن معاشی بحران سے گذرنا پڑا اس کا اندازہ اُن سے زیادہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ روپے کی فراہمی کے لیے وہ ہمہ وقت مضطرب اور بے چین رہتے۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے خطوں میں جگہ جگہ کیا ہے۔ علی گڑھ ایک ایسی جگہ ہے جو سرسید نے سوچ سمجھ کر کالج کے قیام کے لیے منتخب کی تھی کہ اس کے قرب و جوار میں رؤسا اور نوابین کا جھرمٹ تھا، سرسید کے اس قومی جذبے کو دیکھکر نوابوں اور رئیسوں نے ان کے اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹایا اور اس کالج کی ہر طرح سے مدد کی۔ سرسید کے مخالفین نے ہر ممکن کوشش کی کہ ان کو کام نہ کرنے دیا جائے مگر ان میں ارادے کی پختگی اور کام کرنے کی ایسی سچی لگن تھی کہ انھوں نے اس بات کی ذرا پرواہ نہ کی اور کالج کی فلاح اور بہبود کے لیے زندگی کے آخری سانس تک اپنے دشمنوں سے ٹکر لیتے رہے۔ سرسید جس تحریک اور جدید علوم و فنون کے لیے کوشاں تھے اس میں ان کے رفقا کی تائید اور حمایت بھی شامل تھی۔ ان کے بہت سے رفقا اور قریبی دوست ان کے مذہبی خیالات کو پسند نہ کرتے تھے۔ پھر بھی ان کے بنیادی اصول اور خیالات سے سب متفق نظر آتے تھے۔ سرسید کے رفقا کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن جن رفقا نے علی گڑھ تحریک میں خاص رول ادا کیا ان میں نمایاں شخصیتوں کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان میں شروع کے دو ادوار کی شخصیتوں نے کالج کی بھلائی کے لیے جو اہم خدمات انجام دی ہیں یہاں ان کا ذکر ضروری ہے۔

دورِ اول کی اہم شخصیتیں :-

۱۔ مولوی سمیع اللہ خاں ۲۔ نواب محسن الملک
۳۔ نواب وقار الملک ۴۔ مولانا حالی
۵۔ مولوی ذکا اللہ ۶۔ علامہ شبلی نعمانی
۷۔ مولوی چراغ علی ۸۔ مولوی نذیر احمد
۹۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی ۱۰۔ نواب مزمل اللہ خاں
۱۱۔ حاجی موسیٰ خاں ۱۲۔ نواب محمد اسحاق خاں

دوسرے دور کی اہم شخصیتیں :-

۱۔ راجہ محمود آباد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سب سے پہلے وائس چانسلر)
۲۔ نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی
۳۔ سید محمود ۴۔ صاحبزادے آفتاب احمد خاں
۵۔ مولوی عبدالحق (بابائے اردو)
۶۔ سر راس مسعود ۷۔ مولوی بشیر الدین
۸۔ سید سجاد حیدر یلدرم ۹۔ مولانا ظفر علی خاں
۱۰۔ وحید الدین سلیم ۱۱۔ مولانا محمد علی
۱۲۔ مولانا شوکت علی ۱۳۔ مولانا سلیمان اشرف
۱۴۔ مولانا ابو بکر شیث ۱۵۔ سجاد انصاری
۱۶۔ مولوی عزیز مرزا ۱۷۔ مولانا حسرت موہانی
۱۸۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ۱۹۔ ڈپٹی حبیب اللہ خاں
۲۰۔ طفیل احمد منگلوری ۲۱۔ مولوی عنایت اللہ
۲۲۔ مولانا احسن مارہروی ۲۳۔ خیر الدین فراہی
۲۴۔ محفوظ علی ۲۵۔ شیخ عبداللہ (بانی گرلس کالج)
۲۶۔ مولوی اکرام اللہ ندوی ۲۷۔ اقبال سہیل
۲۸۔ خواجہ غلام الثقلین ۲۹۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں

تیسرا دور :-

۱۔ خواجہ غلام السیدین	۲۔ مولانا عبدالماجد دریابادی
۳۔ عبدالرحمٰن بجنوری	۴۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی
۵۔ قاضی عبدالغفار	۶۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں
۷۔ مولوی ہاشمی فرید آبادی	۸۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
۹۔ پروفیسر محمد مجیب	۱۰۔ سر رضا علی
۱۱۔ حکیم احمد شجاع	۱۲۔ قاضی تلمذ حسین
۱۳۔ الیاس برنی	۱۴۔ پروفیسر باری علیگ

ان تینوں ادوار کی فہرست میں مزید ناموں کا اضافہ ممکن ہے۔ ان ادوار میں ایسے نام بھی ملیں گے جو علی گڑھ تحریک کے مخالف تھے تاہم ان رفقا سے علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد ملی۔ نواب محسن الملک اور سرسید کے خیالات میں بڑی حد تک مماثلت تھی۔ البتہ سرسید کے مذہبی خیالات سے ان کو اختلاف رہا لیکن ملاقات کے بعد سب اختلافات رفع ہو گئے۔ وقار الملک بھی سرسید کے اہم جلیس اور اہم رفقا میں سے تھے ان کی وجہ سے علی گڑھ تحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔ گو آخر میں سرسید اور سید محمود کی وجہ سے شدید اختلافات رونما ہو گئے تھے مگر کالج پر ذرا آنچ نہ آنے دی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے عام مسلمانوں کے دلوں میں علی گڑھ تحریک کے متعلق اختلافات کو دور کرایا اور کالج کی جڑوں کو مضبوط و مستحکم کیا۔ اب سرسید کی علی گڑھ تحریک سے اصلاح کا چرچا شروع ہو گیا تھا اور افراد کے زنگ آلود ذہن جو صدیوں سے جمود کی حالت میں پڑے ہوئے تھے ان میں حرکت پیدا ہونے لگی، سیاسی شعبوں میں بھی بیداری پیدا ہوئی اور لوگ مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کے عادی نظر آنے لگے۔

انیسویں صدی کے آخر میں علی گڑھ تحریک اور ام۔ اے او کالج کی تاریخ میں تین ایسے اہم واقعات پیش آئے جنھوں نے تحریک اور کالج دونوں پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ ان میں پہلا واقعہ کالج اور تحریک کے بانی سرسید احمد خاں کی وفات کا ہے جو ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ دوسرا کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈر بیک کی موت کا جو ستمبر ۱۸۹۹ء میں ہوئی بیک کالج کے بہی خواہ اور سرسید سے قربت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ سرسید کی آخری زندگی میں ان کے راست داس بھی ہو گئے تھے اور تیسرا اہم واقعہ حسرت موہانی کا ام۔ اے او کالج میں ان کا ورود تھا۔ حسرت نے جب علی گڑھ میں داخلہ لیا تو اس وقت ام۔ اے او کالج کے پرنسپل بیک تھے ان کے انتقال پر حسرت نے یونین کے جلسے میں جو

نظم سنائی اس کے بند کا ایک شعر ملاحظہ ہو

بیک کے مرجانے سے دیاں جلسہ ہو گیا   خاک میں ارماں ملے، خونِ تمنا ہو گیا

علی گڑھ کی تہذیبی ثقافتی اور معاشرتی حالت

علی گڑھ کا ایک خاص ماحول تھا اور یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی ایسی تھی کہ اس مادر درس گاہ میں دور دور سے رئیسوں اور نوابوں کے لڑکے تعلیم کی غرض سے آتے اور اس درس گاہ سے فیض یاب ہوتے۔ اس کالج میں کسی قسم کا بھید بھاؤ نہ تھا۔ اس کے پانی سے مسلمانوں نے وضو کیا اور ہندوؤں نے اس کو پوتر سمجھ کر اس سے اشنان کیا۔

۳ر اگست ۱۸۸۲ء کو سرسید نے علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل کو ایک خط لکھا تھا جس کا یہ حصہ خاص طور پر قومی یکجہتی کا علم بردار ہے۔

"آپ کو علم ہوگا کہ امرتسر کے بعض مسلمانوں نے ایک سونے کا تمغا ایسے مسلمان طالب علم کے واسطے رکھا ہے جو ہمارے کالج سے بی۔ اے اوّل ڈویژن میں پاس کرے۔ اب میں اپنی جیب سے ایک سونے کا تمغا ایسے ہندو طالب علم کے واسطے رکھتا ہوں جو ہمارے کالج سے بی۔ اے اوّل ڈویژن میں پاس کرے۔ اب اس کی خبر بی۔ اے کے طلبہ کو پہنچا دیجئے۔

فکر و نظر، علی گڑھ جولائی ۱۹۶۴ء

ص ۲۸۶ مکتوب نمبر ۸۷

پروفیسر رشید احمد صدیقی جو اس کالج کے اولڈ بوائے تھے اور جنھوں نے کالج اور علی گڑھ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے بلکہ انھوں نے علی گڑھ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں:-

"علی گڑھ نے کسی کام کا نہ رکھا۔ اس نے مجھے اپنا لیا۔ یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکی محبوب ہے۔ نہیں چاہتا کہ اس کے

ادنیٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے یا اس کے سوا کسی اور سے التفات کی جائے۔ اس نے میری نظر میں مجھے محترم کر دیا۔ اس قید سے مخلصی کہاں۔ بہت سی باتوں میں اب نہ علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ والوں سے بہتر و برتر لوگ۔ مجھے جو شے یا شخص اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہو جائے۔ کسی اجنبی سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کے طور طریقوں سے خوش ہوتا ہوں تو اکثر پوچھ لیتا ہوں کہ وہ کبھی علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا ہے یا نہیں۔ ہوتا ہے تو فخر سے گردن اونچی اور مسرت سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔ اور اس کے خوش اوقات خوش مذاق ہونے پر تعجب نہیں ہوتا۔ نہیں رہا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ ایسا اچھا لڑکا علی گڑھ کے فیضان سے بھی کیوں محروم رہا۔"[1]

یہ رائے اس کالج کے اولڈ بوائے کی ہے جو یہیں پڑھا اور یہیں ملازم ہوا۔ اور اپنی تمام زندگی اسی درس گاہ کی خدمت میں گزار دی اور آخر میں اسی مٹی نے ان کو اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لیے بلا لیا۔

اس کالج کا ایک خاص لباس تھا، شیروانی (اچکن) سر پر ترکی ٹوپی، سفید پائجامہ (علی گڑھ کٹ) اور پاؤں میں جوتا (شو) اس لباس کے بغیر کوئی طالب علم کالج نہیں جا سکتا اور اس یونیفارم کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ اب اس یونیفارم میں سر سے ٹوپی غائب ہو گئی ہے اور کوئی خاص سختی بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔

زرتشت کا قول ہے کہ "آج کی باتیں کل کی امانت ہیں۔ ان سب کو اکھٹا کر لو۔"

---

[1] گنجِ گراں مایہ ص ۶۷

اس ضمن میں علی گڑھ کا پس منظر مختصر طور پر بیان کرنا ضروری ہے۔ علی گڑھ ایک پرانا تاریخی شہر ہے۔ اس کا پرانا نام کول تھا۔ اب بھی یہاں کی عدالتوں کے کاغذات میں کول ضرور لکھا جاتا ہے۔ یہاں کے پرانے کھنڈرات جو شہر کی آبادی سے بہت دور ہیں وہ بھی اس کے شاہد ہیں کہ مسلم عہد میں اس شہر میں بڑی رونق رہتی تھی اور لوگ بڑی آن بان سے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ سرسید کے زمانے میں اس شہر کی آبادی زیادہ تر مختلف حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ تاہم پر رونق۔ جگہ اسی طرف تھی جہاں اب یونیورسٹی کی موجودہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور شمشاد بلڈنگ جس کا نام گوکلا[1] کا چوراہا بھی ہے اس کے برابر کنکری سڑک بنی ہوئی تھی جو سیدھی قلعے کی طرف جاتی تھی۔ کول یہ مضبوط قلعہ محمد خاں شیروانی کا بنوایا ہوا تھا اور جس کو ثابت خاں نے مضبوط کیا تھا اور یہاں جاٹوں کا صوبے دار رہا کرتا تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی قیادت میں اس مضبوط قلعے پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس قلعے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے اس میں قیام کیا تھا۔ شمالی ہند کے لیے یہ قلعہ ایک کلیدی حیثیت رکھتا تھا اس لیے انگریزوں نے آتے ہی اس پر قبضہ کیا۔ حاجی عباس خاں شیروانی لکھتے ہیں کہ:

> "شمالی ہندوستان کے لیے یہ قلعہ (کول) کنجی تھا جس کے ہاتھ میں وہ ہو اس سے آگے کا دروازہ کھول سکتا تھا ورنہ ملک گیری کی ہوس میں سرشار اور دولت کمانے کی فکر میں گرفتار انگریز آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

---

[1] گوکل چند نام کا ایک بنیا قلعے کی طرف جانے والی اس سڑک کی داہنی طرف ایک جھونپڑی ڈال کر آباد ہو گیا تھا اس وقت لق و دق میدان میں تنہا یہی آباد ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنا چھوٹا سا مکان یہیں بنا لیا چونکہ خاص چوراہے کے سرے پر اس کا مکان تھا اس لیے اسی کے نام سے گوکلا کا چوراہا مشہور ہو گیا۔ اب بھی یہ مکان موجود ہے اور اس میں اس کے پوتے رہتے ہیں اور دوکان کرتے ہیں۔

بڑی سخت جنگ ہوئی جانبین کے افسران اور سپاہی مارے گئے۔ مگر انگریزوں کا اقبال زوروں پر تھا۔ وہ جیتے جنرل پیروں بری طرح ہار کر یہاں سے بھاگا اور بعد کو گرفتار ہوا۔ انگریزوں کی یہ کامیابی شروانیوں کے لیے ایک برکت اور نعمت ثابت ہوئی۔ ۱۸۰۵ء تک اندور کے مرہٹے راجہ ہلکر اور بھرت پور کے جاٹ راجا کو شکست دے کر انگریز آگے بڑھے اور شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ علی گڑھ اور اس کے ملحقات ہاتھرس[1]، مرسان میں جاٹ زمینداروں نے سر اٹھایا اور بلند شہر[2] کے قلعے میں دوندے خاں، ماہر خاں وغیرہ لال خانی سرداروں نے شورشیں کیں مگر یہ سب دبا دی گئیں"[3]

یہ قلعہ شکستہ حالت میں ابھی تک موجود ہے اور اس کے ایک حصے میں یونیورسٹی کا ایگریکلچر فارم بھی ہے۔ علی گڑھ کی پرانی آبادی جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے مختلف حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ تقسیم ہند سے پہلے شہر کی آبادی آج کل کی طرح گنجان نہیں تھی۔ رسل گنج، غوربا باغ (جسے اب گھوڑبا باغ کہتے ہیں) اوپر کوٹ (محمد علی روڈ) جہاں شہر کی خوبصورت جامع مسجد بنی ہوئی ہے اور اسی مسجد کے سامنے کوتوالی ہے جہاں شہر کوتوال رہتا ہے۔ سرائے حکیم، سرائے میاں، سرائے بہرام بیگ، سرائے کالے خاں، سرائے قطب وغیرہ کے نام اب بھی اس پرانے شہر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ میرے بچپن میں یہاں کی معاشرت خالص مشرقی تھی لوگ ایک دوسرے سے بڑے میل جول سے رہتے تھے۔ آپس میں کوئی بھید بھاؤ نہ تھا اور بھائی چارگی کا جذبہ بہت تھا۔ آج کل کی طرح لوگوں کے دلوں میں میل نہ تھا اور تعصب کی عینک لگانے کی عادت نہ تھی۔

---

[1] علی گڑھ کی مشہور تحصیل اور تجارتی منڈی ہے

[2] یہ ضلع علی گڑھ سے ۶۵ کلومیٹر کے فاصلے پر آباد ہے

[3] شروانی نامہ: مطبوعہ ۱۹۵۲ء ص ۱۳، ۱۲۹

مسلمانوں اور ہندوؤں کے لباس میں بہت کم فرق تھا۔ مسلمان سر پر صافہ یا ترکی ٹوپی اور شیروانی ضرور پہنتے تھے۔ انگرکھے کا بھی رواج تھا۔ بڑے بوڑھے خاص طور پر کندھے پر ایک لمبا سا رومال بائیں طرف ڈال لیا کرتے تھے۔ لٹھے کا شرعی پائجامہ جو ٹخنوں سے اوپر ہوتا تھا پہنا جاتا تھا۔ مسلمان عورتیں تنگ موری کا پائجامہ اور ڈھائی گز کا دوپٹہ ضرور اوڑھتی تھیں۔ قمیص اور جمپر کے علاوہ شلوار اور ڈھیلا پائجامہ (غرارہ) پہنتی تھیں۔ ہندوؤں کا لباس مسلمانوں سے قدرے مختلف تھا لیکن بعض لباس میں یکسانیت تھی۔ ہندو، مسلمانوں کی طرح صافہ باندھتے تھے البتہ ترکی ٹوپی مسلمانوں کے لیے مخصوص تھی بعد میں گاندھی ٹوپی کا رواج ہوگیا تھا لیکن یہ خاص طبقے تک محدود تھی۔ ہندو عورتیں، ڈھیلا اور تنگ موری کا پائجامہ بھی پہنتی تھیں۔ ساڑی کا رواج خاص طور پر ہندوؤں میں تھا، شیروانی ہندو بھی پہنتے تھے مگر ان کی شیروانی مسلمانوں کی شیروانی سے کچھ مختلف ہوتی تھی۔ داہنی طرف بندھ باندھ کر پہنتے تھے اور کالر بھی ان کا نیچے کی طرف بیٹھا ہوا ہوتا تھا۔

سواریوں میں تانگہ، میانہ (ڈولی) جسے دو آدمی کندھے پر رکھ کر چلتے تھے، ڈھکیل اور یکہ یہاں کی خاص سواریاں تھیں۔ بلکہ تانگے تو اب بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بگھی اور ٹم ٹم کا بھی رواج تھا۔ مگر یہ صرف امیر لوگوں کے لیے مخصوص تھیں۔ ڈولی شروع میں صرف زنانی سواریوں کے لیے مخصوص تھی لیکن بعد میں مرد بھی اس کا استعمال کرنے لگے تھے۔ ڈولی چار فٹ لمبی اور تقریباً تین فٹ چوڑی ہوتی تھی۔ تین فٹ لمبے بانس اس کے ڈھانچے کے باہری، اگلے اور پچھلے حصوں میں لگے ہوتے تھے اور لوہے کے تاروں سے ان ڈھانچوں کو کس دیا جاتا تھا۔ اس کو دو آدمی کندھے پر اٹھا کر لے جاتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ڈولیوں کا استعمال صرف دلہنوں کے لیے ہوتا تھا۔ اس کا ڈھانچہ لکڑی کا ہوتا تھا اور اس کو چار کہار اٹھا کر اس طرح لے جاتے تھے کہ دو آگے اور دو پیچھے ہوتے تھے۔ علی گڑھ سے باہر بھی ڈولی اور ڈولوں کا رواج تھا۔ انشا کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کچھ نہیں معلوم پوچھو کون میلہ ہے آج
جا رہی ہیں جو کچھ پیچھے ڈولیوں پر ڈولیاں

رتھ کا استعمال بھی تھا مگر بہت کم۔ یہ بہت ہی قدیم زمانے کی سواری ہے۔ مہابھارت میں اس گاڑی کا ذکر ملتا ہے۔ کورؤں اور پانڈؤں کے زمانے میں اس کا رواج عام تھا بعد میں کم ہونے ہوتے صرف ہندو رئیسوں تک محدود ہوکر رہ گیا۔ ہم نے اپنے ہوش میں دیہاتوں سے اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے لوگوں اور عورتوں کو رتھوں میں سواریاں کرتے دیکھا ہے۔ اس میں چار پہیے لگے ہوتے تھے۔ اور یہ پورا مضبوط لکڑی کا بنا ہوتا تھا جسے بیل کھینچتے تھے۔ بائیسکل اور موٹریں بھی گنی چنی دکھائی پڑتی تھیں۔ موٹر کے اسٹارٹ کرنے کا طریقہ آج کل سے بہت مختلف تھا۔ موٹر کے منھ پر ایک ہنڈل (چابی) کو کافی دیر تک گھمانے سے اسٹارٹ ہوتی تھی۔ زیادہ تر لوگ پیدل چلنے کے عادی تھے۔

پردے کا رواج ہندو مسلم دونوں میں بہت تھا۔ دونوں سختی سے اس کی پابندی کرتے تھے۔ عورتیں قریب کی جگہ ڈولی یا ڈھکیل میں جاتی تھیں۔ ڈولی پر چاروں طرف سے پردہ پڑا ہوتا تھا۔ یکہ اور تانگے کا استعمال ہوتا تو عورتوں کے لیے چادریں ان سے باندھ دی جاتی تھیں اور جب دروازے پر ڈولی یا ڈھکیل یا تانگہ اور یکہ لگتا تو دو آدمی جو اپنے گھر کے خاص ہوتے تھے اور جن سے عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں دونوں طرف سے چادریں لے کر کھڑے ہوتے تھے۔ غریب گھرانے کے بچے زیادہ تر مسجدوں، مندروں، پاٹھ شالاؤں اور مکتبوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے۔ عورتیں خرید و فروخت کے لیے گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھیں حتیٰ کہ بزاز اور سنار تک گھر پر آتے تھے۔ آج کل کی طرح بیڑی سگریٹ پینے کا بھی عام رواج نہ تھا البتہ بزرگ لوگ حقے کا شغل کرتے تھے۔ بیڑی کا رواج بھی کم تھا۔ نوجوان طبقہ اپنے بڑوں کے سامنے بیڑی یا حقہ نہیں پی سکتا تھا۔ ان میں بزرگوں کے لیے احترام کا جذبہ بہت تھا۔

محرم کے دنوں میں تعزیے بڑی دھوم دھام سے نکلتے تھے۔ تعزیے کا ڈھانچہ بانس کی تیلیوں سے بنایا جاتا تھا اور اس کے اوپر رنگ برنگے کاغذ اور پنیاں چپکا کر کے اسے خوبصورت بنایا جاتا تھا۔

یہ تھی علی گڑھ شہر کی پرانی معاشرت جس میں ہم نے آنکھیں کھولیں۔ اب علی گڑھ ایک شہر یا بستی کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک ہے، ایک علامت ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا اور ان کو تہذیب، تعلیم و تمدن، شعر و ادب اور سیاست سب کچھ عطا کیا۔ مجاز نے "نذرِ علی گڑھ" ان ہی احساسات کو محسوس کر کے لکھی تھی ان کے ایک ایک لفظ سے پورے چمن کی مہک آتی ہے۔

"یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں"

علی گڑھ کا موسم بھی عجیب ہوتا ہے یہاں گرمیوں میں اس قدر گرمی پڑتی ہے کہ لوگ اس کی شدت سے پناہ مانگتے ہیں۔ گرد، گرمی، تیز لو یہ سب کرب و کراہت کا عالم پیدا کرتے ہیں۔ مچھر یہاں کا خاص تحفہ ہے اس سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں یہ اپنے مکیں کو تو پہچانتا ہی ہے لیکن اگر مہمان آجائیں تو ان کی خاطر مکیں سے زیادہ کرتا ہے اور مہمان جب رخصت ہوتا ہے تو یہاں کی مہمان نوازی کو نہیں بھولتا۔

بڑے لوگوں کی سب سے بڑی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ گدڑی سے لعل، سمندر سے موتی اور سنگ ریزوں سے گہر چن لیتے ہیں۔ ان کی تیز نگاہیں وہ سب کچھ دیکھ لیتی ہیں جو دوسرے قریب رہ کر نہیں دیکھ پاتے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد جو ایم اے او کالج میں ریاضی کے پروفیسر تھے انھوں نے سید فضل الحسن حسرت موہانی کو کالج میں داخلہ لینے کی دعوت دی۔ حسرت نے فتحپور سے میٹرک کا امتحان پورے صوبے میں امتیاز کے ساتھ ۱۸۹۹ء میں پاس کیا تھا۔ عبدالشکور ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حسرت نے ۱۸۹۹ء میں اپنے قدیم مادر درس گاہ گورنمنٹ

ہائی اسکول فتح پور سے انٹرنس کا امتحان اوّل درجے میں خاص امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس زمانے میں بھی عربی، فارسی اردو اور خصوصاً ریاضی میں حسرت موہانی کی استعداد بہت نمایاں تھی یہ وہ زمانہ تھا کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد پرائے ایم۔ اے او کالج میں بحیثیت پروفیسر ریاضی آچکے تھے۔ گزٹ دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب نے حسرت کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ اسکول کی تعلیمی جدوجہد سے فارغ ہوکر حسرت علی گڑھ پہنچے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے شاگردوں میں شامل ہوگئے۔" [1]

اس طرح علی گڑھ کی کشش اور چمک دمک ان کو فتح پور سے علی گڑھ لے آئی جس وقت حسرت بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئے تو ان کی وضع قطع اور لباس کچھ اس طرح کا تھا کہ علی گڑھ کے طلبہ ان کو دیکھکر حیرت میں رہ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کی تعلیم وتربیت کا زور ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی خاص اہمیت اختیار کرچکا تھا اور مسلمانوں میں نئی روشنی کی لہر اور ذہنی نشوونما کے لیے یہ کالج دور دور تک مشہور ہوچکا تھا۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے اس کالج کی سند ضروری ہوگئی تھی۔ حسرت علی گڑھ میں شرفائے اودھ کا لباس پہنے اور ساتھ میں اودھ کی پرانی روایت کا پاندان ہاتھ میں لیے پہنچے تو وہاں کے طلبہ نے ان کو اس لباس میں دیکھ کر خالہ جان کا خطاب دیا۔ مگر خالہ جان نے اپنے بھانجوں کی قطعی پرواہ نہ کی بلکہ وہ اپنے کاموں میں لگے رہے۔ ان کے بارے میں اس وقت کے ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ:

"جس دن یہ حضرت یکے سے اُتر کر بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئے، تو ڈھیلا پائجامہ پہنے تھے۔ پاؤں میں گھتیلی جوتی، ہاتھ میں

---

[1] حسرت موہانی ص ۱۲ مطبوعہ آگرہ برقی پریس آگرہ ۱۹۴۴ء

پائجامہ۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے "خالہ جان" کی پھبتی کسی۔

حسرت کا حلیہ عجیب وضع کا تھا۔ چھوٹا سا قد، دبلا پتلا بدن۔ رنگ گندمی اور اس پر چیچک کے مٹے ہوئے داغ تھے۔ داڑھی رکھتے تھے۔ پیشانی اونچی، سر پر کلابتوں کی ٹوپی، اور پرانی وضع کا چارخانے کا انگرکھا اور شروع کا تنگ پائجامہ، جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے رہتے تھے۔ ان کے حلیے میں ایک اور اضافہ کا باعث تھا۔ آنکھوں پر عینک لگاتے تھے اور ہاتھ میں ایک عدد چھڑی بھی ہوتی تھی۔ یہ تھا ان کا لباس جو وہ کالج کے طالب علمی کے زمانے تک پہنتے رہے۔ اس عجیب و غریب وضع قطع کے باوجود ایم۔ اے۔ او کالج کے حلقوں میں اپنے لیے ایک مقام پیدا کر لیا تھا، جو بہتوں کے لیے قابلِ تقلید تھا۔ انگریزی وضع کا یونیفارم انھوں نے کبھی نہیں پہنا۔ ایک دوسرے عینی شاہد ارون خاں شروانی ہیں، جنھوں نے حسرت کو اپنے طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تھا، وہ لکھتے ہیں:۔

"۱۹۰۳ء کا ذکر ہے۔ میری عمر کوئی بارہ برس کی ہوگی۔ علی گڑھ کالج کے ملحقہ اسکول میں ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ مدرسے آیا تو معلوم ہوا کہ ملاقات کے کمرے میں ایک صاحب والد مرحوم سے کچھ گفتگو کر رہے ہیں۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ملازم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں۔ وہ حاجی (محمد موسیٰ خاں) صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ حسرت اس زمانے میں علی گڑھ کے حلقوں میں مشہور ہو چکے تھے۔ گستاخی سہی مگر دل نہیں مانا۔ ایک طرف کی تیلیوں میں سے دیکھا، حسرت صاحب معمولی وضع کی اچکن پہنے، سر پر ایک بالکل چپٹی قسم کی ترکی ٹوپی۔ بے حد گھنی سیاہ داڑھی رکھے والد صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ علی گڑھ کی تاریخ میں اس زمانہ کو بدرجۂ اتم انگریزیت کا زمانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مذہبیت تو درکنار

---

۱ مشتاق احمد زاہدی۔ بحوالہ قرۃ العین حیدر "کارِ جہاں دراز ہے" (حصہ اول) ص ۱۱۸

یہ خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کالج کا کوئی ایسا گریجویٹ بھی ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ میں حسرت کو دیکھ کر کچھ مرعوب سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس شخص میں کیا اوصاف ہوں گے، کہ اس نے طالب علمی کے زمانے میں اتنا نام پیدا کر لیا ہے۔" لے

حسرت کے ایک اور مینی شاہد پروفیسر رشید احمد صدیقی، جنھوں نے ان کے حلیے کی ہو بہو تصویر کھینچی ہے :-

"ان کی گول چھدری داڑھی، ان کی باریک آواز، ان کی چھوٹی تال کی عینک بغیر پھندنے کی پرانی ترکی ٹوپی گھسی پسی چپل، موزے سے کوئی سرد کار نہیں ہوتے کھدر کی پیوندلگی کا داکسی شیروانی جس کے اکثر بٹن ٹوٹے ہوئے یا غائب، ہاتھ میں بدرنگ سا جوٹ کا جھولا۔ دری تکیہ اور موٹی ملگجی چادر کا مختصر بستر، ٹیڑھا میڑھا پرانا چھوٹا سا ایک ٹرنک۔ یہ تھے حسرت۔" ۲ے

حسرت نے اس وضع قطع میں ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ بی۔ اے کے بعد جب نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو انھوں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ داخلہ لینے کے بعد حسرت نے وظیفہ کے لیے اپنی درخواست پرنسپل کے پاس بھجوائی۔ اس وقت کالج کے پرنسپل مسٹر مارین تھے، مارین چوں کہ ان سے پہلے سے خفا تھے، اس لیے انھوں نے وظیفے کی درخواست مسترد کر دی۔ حسرت کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی اور انھوں نے تعلیمی زندگی کو خیر باد کہدیا اور انھوں نے شہر میں مٹن روڈ پر ایک مکان کرایے پر لیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اور یہیں سے انھوں نے اپنا رسالہ "اردوئے معلی" یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو نکالا۔ مٹن روڈ آج کل رسل گنج کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں اب بھی وہ چار پرانی عمارتیں موجود ہیں۔ اس رسالے کے اجراء سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ حسرت نے علی گڑھ ہی کو اپنی صحافت اور سیاست دونوں

لے حسرت کے سیاسی رجحانات۔ "آجکل" جون، جولائی ۱۹۵۳ء

۲ے کچھ حسرت کے بارے میں، نگار حسرت نمبر ۱۹۵۲ء ص ۲۴

کا مرکز بنایا۔ اس کی بڑی اور اہم وجہ یہ نظر آتی ہے کہ علی گڑھ کالج اس وقت ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی شہرت پا چکا تھا اور علی گڑھ کالج کی سیاسی اور تاریخی اہمیت سب پر واضح ہو چکی تھی۔

حسرت کی علمی اور ادبی زندگی کا آغاز صحافت نگاری کی دین ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے لیکن ان کی صحافت کے لافانی نقوش کبھی نہیں مٹائے جاسکتے۔ انھوں نے صحافت کو زبان دی، اخلاق و آداب سکھائے، شائستگی کے اصولوں سے ہمکنار کیا۔ اور شعروادب کے نکات سے آشنا کیا۔ اردوئے معلی کے اجرا کے بعد دلگداز۔ الناظر۔ زمانہ۔ دکن ریویو، کشمیر درپن اور اردو جیسے ادبی اور معیاری رسائل بھی نکلنے لگے لیکن حسرت کے لیے سرسید کا تہذیب الاخلاق۔ معارف علی گڑھ اور مخزن لاہور مثال کے لیے کافی تھے۔ ان ہی سے متاثر ہو کر حسرت نے اپنی صحافت کا چراغ جلایا۔ اس رسالے نے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کی بہترین نمائندگی کی۔ اس طرح اب اردو رسائل کے اجرا کا راستہ کھل گیا۔ لیکن حسرت کے اردوئے معلی کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ صوری، معنوی اور معیاری اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل تھا گو کہ یہ معمولی مٹیالے رنگ کے کاغذ پر چھپتا تھا، اور کتابت و طباعت بھی معمولی ہوتی تھی، لیکن ادبی حلقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا۔۔ اور پڑھا جاتا تھا۔ اردوئے معلی تین بار نکلا اور بند ہوا، اس لیے اس کو تین طرح تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا اور دوسرا دور علی گڑھ کا ہے، تیسرا اور آخری دور کانپور کا ہے۔

پہلا دور	جولائی	۱۹۰۳ء تا مئی ۱۹۰۸ء
دوسرا دور	اکتوبر	۱۹۰۹ء تا اپریل ۱۹۱۳ء
تیسرا دور	جنوری	۱۹۲۵ء تا مارچ ۱۹۴۲ء

جب اردوئے معلی پر افتاد پڑی اور یہ حکومت کے جبر و استبداد کی زد میں آگیا تو انھوں نے اسے ایک سہ ماہی رسالہ "تذکرۃ الشعراء" کی شکل میں نکالا، مگر ۱۹۲۰ء میں یہ بھی بند ہو گیا۔ اس کے علاوہ "مستقبل" نام کا ایک اخبار بھی نکالا تھا۔ جو بہت جلد بند کرنا پڑا۔ اس طرح حسرت نے اپنی زندگی میں تین پرچے نکالے لیکن ان میں "اردوئے معلی" ہی

واحد رسالہ تھا جس نے قدیم ادبی سرمایے کو جلا بخشی۔ اگر مولانا قدیم ادبی سرمایے کی طرف توجہ نہ کرتے اور ان پر مضامین لکھ کر اُردو دنیا سے روشناس نہ کراتے تو ایک طرف تو یہ ذخیرہ تلف ہو جاتا اور دوسری طرف اس کے افادی پہلوؤں کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا۔
حسرت کے بعد قدیم سرمایے کے افادی پہلوؤں پر روشناس کرانے کا سہرا مولوی عبدالحق بابائے اُردو کے سر ہے، جنھوں نے رسالہ اُردو کے ذریعہ قدیم ادب کو دریافت کیا اور اس پر مضامین و کتابوں پر مقدمے لکھ کر اُردو دنیا کے سامنے لائے۔

حسرت نے اُردوئے معلی میں ادبی مضامین اور شعراء کے کلام کے علاوہ سیاست کے میدان میں بھی قدم رکھا اور خود سیاسی مضامین لکھے اور دوسروں کو لکھنے پر آمادہ کیا انھوں نے ۱۹۰۴ء سے اُردوئے معلی میں سیاسی مضامین لکھنا شروع کر دیے تھے۔ مولانا شبلی سب سے پہلے ادیب اور نقاد ہیں جنھوں نے حسرت کا سیاسی مضمون پڑھ کر داد دی تھی۔ اس طرح یہ رسالہ ادب کے ساتھ سیاست کا صحیفہ بھی بن گیا۔

حسرت کی شادی ۱۹۰۱ء میں ہو چکی تھی۔ رسالہ نکالنے کے بعد وہ اپنی شریک حیات کو علی گڑھ لے آئے اور رسل گنج میں اسی مکان میں جہاں سے اُردوئے معلی نکلتا تھا، رہنے لگے۔ پانچ سال تک اُردوئے معلی برابر نکلتا رہا۔ ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون اس میں مصطفےٰ کامل کی موت پر شائع ہوا۔ اس مضمون میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔ یہ مضمون حکومتِ برطانیہ کی نظر میں قابلِ اعتراض ٹھہرا اور علی گڑھ میں یہ پہلا جرم تھا۔ کالج کی عزت کو خطرے میں پڑتا دیکھ کر اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا گئے حتیٰ کہ نواب وقار الملک نے بھی جو حسرت کے مدّاح تھے، اس مضمون کی اشاعت کی مذمت کی۔ کالج کی عزت بچانے کے لیے حسرت کے خلاف لوگوں نے گواہیاں دیں۔ اس جرم کی پاداش میں حسرت کو دو برس تک سزا اور ۵۰۰ روپے جرمانہ ہوا۔ حسرت کے لیے یہ پہلا اتفاق تھا۔

ان کا کتب خانہ، پریس، سب کچھ پولیس کے ظلم و ستم کی نذر ہو گیا۔ یہ مضمون جس کی پاداش میں حسرت کو دو سال کی سزا ہوئی تھی، ان کا لکھا ہوا نہ تھا۔ ان سے پوچھا گیا، تو انھوں نے مضمون نگار کا نام بتانے سے صاف انکار کر دیا اور تمام الزام اپنے سر لے لیا

گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ مضمون اقبال سہیل نے لکھا تھا۔ اقبال سہیل اس زمانے میں علی گڑھ کے مشہور وکیل تھے اور شعر و سخن کا بہت عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ ایسی ہی ایک مثال ہمیں اخبار الہلال کے سلسلے میں ملتی ہے۔

حسرت ۱۹۰۹ء میں رہا ہو کر جب جیل سے باہر آئے تو اُردوئے معلیٰ دوبارہ جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ کوئی پریس اس رسالے کو چھاپنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ حسرت اپنی دُھن کے پکے تھے۔ لہٰذا خود دیسی پریس لگایا اور اس کا نام اُردو پریس رکھا۔ خود ہی کتابت کرتے اور سنگ سازی کے فرائض بھی خود ہی انجام دیتے۔ بیوی پیپرمین کی خدمت انجام دیتیں۔ اس طرح یہ رسالہ علی گڑھ سے اپریل ۱۹۱۳ء تک نکلتا رہا۔

ایک دن ۱۲/ مئی ۱۹۱۳ء کو رات کے ۹ بجے خود سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حسرت کے مکان پر ایک نوٹس دیا جس میں لکھا تھا کہ اُردوئے معلیٰ میں انڈین پولیس ایکٹ ۱۹۱۰ء چند الفاظ خلافِ قانون چھپے ہیں، اس لیے ایک ہفتہ کے اندر تین ہزار روپے ضلع مجسٹریٹ کے پاس جمع کرائے جائیں۔ حالانکہ اُردو پریس کا کل اثاثہ دو پتھر اور ایک لکڑی کا پریس تھا۔ حسرت کو اس کا بہت دُکھ ہوا۔

حکومت نے جب ان کے پریس سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی تب حسرت نے اُردوئے معلیٰ بند کرتے ہوئے اس واقعہ پر یوں تبصرہ کیا:

اُردو پریس کا خاتمہ
ضمانت کے لیے نوٹس

"۱۲/ مئی ۱۹۱۳ء کو ۹ بجے شب کے قریب علی گڑھ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بذاتِ خاص وارد ہو کر راقم حروف کے سامنے حکومت کی جانب سے ایک نوٹس پیش کیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اُردو پریس میں چونکہ انڈین پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء چند الفاظ خلاف چھپے ہیں اس لیے ایک ہفتے کے اندر تین ہزار روپے کی ضمانت مجسٹریٹ ضلع کے پاس جمع کرنی چاہیے —
واضح ہو کہ اُردو پریس کی کُل کائنات ایک لکڑی کے پریس اور دو پتھروں

پر مشتمل ہے جس کی مجموعی قیمت پچاس روپے سے زاید نہیں۔ ایسے بے بضاعت پریس سے تین ہزار روپے طلب کرنا مضحکہ انگیز ہونے کے علاوہ حیرت سے گزر کر کینہ پروری کی حد تک پہونچ گیا ہے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اُردو پریس کے جاری رہنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ خیر ۱۹ مئی کو پریس بند ہو جائے گا۔ مگر بند ہو کر اپنے بعد سر جیمس میسٹن ..... کی شعاری کا یہ افسانہ یادگار چھوڑ جائے گا کہ آپ نے ایک بمقدار دستی پریس سے اتنی کثیر رقم طلب کی، جس سے زیادہ اس وقت تک شاید ہندوستان میں کسی بڑے سے بڑے اسٹیم پریس سے بھی نہ لی گئی، ہم جناب ممدوح کی اس خاص نوازش کو بمصداق ہر چہ از دوست می رسد نیکوست، بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ ایک بات البتہ قابلِ اطمینان اور لائقِ شکر ہے، وہ یہ کہ اس قسم کے نوٹس سے راقم کو کسی قسم کا مالی، جسمانی یا روحانی صدمہ نہ اس وقت تک پہنچا نہ آئندہ پہنچے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس موقع پر "الہلال" میں تحریر فرمایا:

"تین ہزار روپے کی ضمانت پریس ایکٹ کی مقدار مقررہ انتہائی حد کے اندر ضرور ہے لیکن عملاً پانچ سو یا ہزار روپے سے زیادہ طلب نہیں کی جاتی۔ اور صرف دو ایک مثالیں دو ہزار کی سُنی گئی ہیں۔ پھر سر جیمس میسٹن بالقابہ کا دربار سطوت و جلال تھیں اتنی بڑی سنگین رقم کے لیے کیا وجہ بیان کر سکتا ہے۔ گورنمنٹ اس سے بے خبر نہیں کہ اُردو پریس اور اس کے مالک کی حالت کیا ہے۔ حسرت موہانی جب قید سے رہا ہو کر آیا تو کوئی چیز دنیا میں ایسی باقی نہ تھی جو اس کے لیے ذریعۂ تقویت حال ہوتی۔ دو، ڈیڑھ روپیہ ماہوار کرایہ کا ایک جھونپڑا ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی صحنچی اور کوٹھری ہے اور باہر بھی اتنی ہی مکانیت ہے۔ اندر وہ فقیر حریت مع اپنی کوہِ عزم و ثبات بیوی کے رہتا ہے، اور باہر کا ٹھ کا دستی

پریس اور دو چار پتھر ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اُردوئے معلیٰ کی کاپیاں لکھی ہیں، خود ہی پتھر پہ چھاپی ہیں اور خود ہی پریس چلا کر چھاپا ہے، یہ کل کائنات اُردو پریس اور اس کے مالک کی ہے کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں اور نہ اس کی طبع غیور کسی کا شرمندۂ احسان ہونا پسند کرتی ہے۔ اُردوئے معلیٰ کے دو چار سو خریدار ہیں۔ اس کی قیمت سے شاید چند روپے مہینے میں بچ رہتے ہیں اور اسی سے دو وقت کی روٹی کھا کر نشۂ آزادی کی بے خودی اور دولت لازوال حق و صداقت کے غنائے غیر فانی سے مست رہتا ہے ؎

ہیں فقیر گدایانِ عشق را کہ این قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

اصلی دولت دل کی دولت ہے اور غنار فقر کے آگے دنیا کے تمام ساز و سامان ہیچ ہیں جو فقر و فلاکت کی زندگی دحریت کی معیت میں گرد و خاک پر بسر ہو، وہ چاندی سونے کے بنے ہوئے ان ایوانِ نقش سے ہزار درجے بہتر ہے۔ جن کے اندر حق کے چراغ کی روشنی نہ ہو۔ خدا کے دیوانے کا فقیر ہونا دولت وبد نکابۂ دولت کے فقیر ہونے سے کیا بہتر نہیں۔ یہی تو اس راہ کے منازلِ امتحان ہیں۔ ان حالات کے ساتھ ایک فقیر زندگی شخص سے تین ہزار کی ضمانت طلب کرکے یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جو برٹش انڈیا کی تاریخ اور گورنمنٹ کے اظہار سطوت و جلال کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا۔"

حسرت کے ساتھ برطانوی حکومت کی زیادتی، مولانا ابوالکلام آزاد کے دل پر شاق گزری اور انھوں نے تین ہزار کی ضمانت طلب کرنے کے خلاف اپنے ہفت روزہ "الہلال" میں آواز اٹھائی اور عوام کو برطانیہ حکومت کی زیادتیوں کا احساس دلایا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد حسرت کے دوستوں نے سیاست سے باز رہنے کا مشورہ دیا

مگر انھوں نے اپنے عزیزوں اور گہرے دوستوں کے اس مخلصانہ مشورے کو قبول نہیں کیا بلکہ ان کے ارادے میں اور پختگی پیدا ہو گئی۔ بہت سے خریداروں نے اسی بناء پر اردوئے معلی کا چندہ دینا بند کر دیا اور لوگ بھی ملنے جلنے سے کترانے لگے، مگر انھوں نے اپنے اس شغل کو جاری رکھا۔

حسرت نے اردوئے معلی کے ذریعہ ہندوستان میں سیاسی شعور کو بیدار کیا اور یہ رسالہ ایسا چراغ تھا، جس کو وہ دنیا کی تیز و تند ہواؤں سے بچاتے رہے اور مسلمانوں کے تاریک ذہنوں کو منور کرتے رہے ۔ ۱۷-۱۹۱۶ء میں حسرت جیل میں تھے۔ بیگم حسرت علی گڑھ میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ عسرت اور تنگ دستی میں گزر اوقات تو حسرت کی موجودگی میں بھی ہوتی تھی مگر غیر موجودگی میں اس میں اور شدت پیدا ہو جاتی۔ پنڈت کشن پرشاد کول اردو کے مشہور ادیب تھے، ان کے حسرت سے دوستانہ تعلقات تھے۔ بیگم حسرت کو بھی ان کی ملاقات کا علم تھا۔ جب کول صاحب کو اس کا علم ہوا تو وہ علی گڑھ بیگم حسرت کی خیریت معلوم کرنے پہنچے اور انھوں نے بیگم حسرت کے دروازے پر دستک دی۔ کول صاحب کے الفاظ میں بیگم حسرت کا کچھ حال سنیے :-

> میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا نام بتایا۔
> بیگم حسرت نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں جا کر بٹھایا۔ اس زمانے میں بیگم حسرت اپنی بوڑھی اور بیمار ماں اور اپنی بچی کو ساتھ لے کر اس مکان میں رہتی تھیں۔ حسرت کے متعلق بات چیت ہوئی۔ وہ جیل میں حسرت کا حال اور کیفیت مجھے بتا رہی تھیں۔ حسرت تو جیل میں تھے، لیکن ان کے گھر کے در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے کہا کہ اگر آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا انتظام کیا جائے ۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے لیے پبلک سے چندہ کیا جائے۔ میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں، آپ اس کی زحمت نہ گوارہ کریں۔ لمحے بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں کہ حسرت نے شعراء کے کئی

دیوان چھپوائے تھے، ان کا یہ ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اُردوئے معلی بند ہو چکا یہ کاروبار بھی ابتر ہو گیا۔ اب یہ ڈھیر بیکار پڑا جگہ گھیر رہا ہے ــ اگر ان دواوین کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کر سکیں تو البتہ کچھ سہولت ہو جائے گی۔ میں یہ کہہ کر کوشش کروں گا۔ ان سے رخصت ہو، لکھنؤ واپس آکر میں نے اپنے دوست بابو شیو پرشاد گپتا کو جو راجہ موتی چند مرحوم کے بھتیجے اور بنارس کے نامی رئیس تھے، اس سب حال کی اطلاع کی جو بابو شیو پرشاد گپتا علاوہ رئیس ہونے کے بڑے مخیر تھے۔ کئی لاکھ روپیہ انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے قائم ہونے میں صرف کیا تھا۔ کانگرس کے بڑے حامی تھے، اس کے لیے صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ حسرت کے مزاج اور طبیعت سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے مجھے پانچ سو روپیہ کا چیک فوراً بھیج دیا جو میں نے بیگم حسرت کو روانہ کر دیا۔ انھوں نے کتابوں کا پارسل مجھے بھیج دیا۔ یہ دواوین اور کتابیں عرصے تک 'ہندوستانی' اخبار کے دفتر میں پڑی رہیں۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوا۔"

(ملخص مضمون کول حسرت نمبر آجکل ص ۸)

اس اقتباس سے بیگم حسرت کے کردار کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی بلند ہمت اور صبر و تحمل کی خاتون تھیں کہ غریبی اور تنگ دستی کی حالت میں بھی انھوں نے اپنی خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی اور پنڈت کشن پرشاد کول نے جو مالی امداد کی پیش کش کی تھی اُسے قبول نہیں کیا۔ حسرت کی زندگی کا تذکرہ بیگم حسرت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان کے خطوط جو حسرت کے نام ہیں، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نشاط النساء بیگم نے ہمیشہ حسرت کی نظربندی سے بہتر قید کو ترجیح دی۔ یہ اس خاتونِ مشرق کی آواز ہے جو باوجود ایک دولت مند باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے حسرت کے ساتھ نمک کی روٹی کھا کر اور راتوں دن پہ سلائی کر کے اور چکی پیس کر زندگی بسر کی، مگر کیا مجال جو ایک حرف بھی شکایت کا زبان پہ آیا ہو۔ ان کے صبر و استقلال اور حرارتِ ایمانی کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

حسرت نے اپنے قید و بند کی داستان "مشاہداتِ زنداں" کے عنوان سے لکھی تھی جو بالاقساط "اردوئے معلی" میں شائع ہوتی تھی، یہ علیحدہ سے ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی، البتہ نئی ترتیب اور اضافے کے ساتھ مکتبہ تیار اہو کراچی نے اس کو "قیدِ فرنگ" کے نام سے اگست ۱۹۵۸ء میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "حسرت کی سیاسی زندگی" شریکِ اشاعت ہے۔ یہ مضمون "نگار" ۱۹۵۱ء کے حسرت نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح بیگم حسرت نے جو خطوط حسرت اور دوسرے لوگوں کے نام ان کے ایامِ اسیری سے متعلق لکھے، ان کا چھپنا بھی ضروری ہے۔ اس سے بہت سے مخفی گوشے ہمارے سامنے آئیں گے۔ چونکہ حسرت کی زندگی میں نشاط النساء بیگم کی خصوصی اہمیت رہی ہے اور ان کی سیاسی زندگی کی تشکیل میں انھوں نے جو کردار ادا کیا، اس کی روداد ہمیں "مشاہداتِ زنداں" کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے ——

نشاط النساء کا گھرانا پڑھا لکھا تھا، اور یہ اس وقت کی بات ہے جب عورتوں کی تعلیم ہماری تہذیب میں داخل نہیں تھی۔ یہ بڑی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ قصبہ موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع ہی سے تھا۔ انھوں نے اپنے قصبے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اور موہان میں تعلیمِ نسواں کی ابتدا ان ہی سے ہوئی۔ یہ اس اعتبار سے بھی سب سے پہلی خاتون ہیں جو چہرہ کھول کر پردہ پوش لباس میں گھر سے باہر نکلیں، اور حسرت کے قید و بند کے دوران جب کوئی ان کا مونس و ہمدرد نہ تھا، یہ بہادرانہ مشکلات کا مقابلہ کرتیں، حسرت کو جیل میں دیکھنے جاتیں، اور ان کو ہر طرح سے تسلی اور تشفی دے کر ان کی ہمت بڑھاتیں۔ بیگم حسرت کا یہ کردار قابلِ رشک ہے۔ حسرت نے ادب کا حصہ سیاست کی نذر کر دیا۔ مگر ان جیسا قلندر اور مجاہد، اور ان جیسا شاعر صدی میں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ اصل زندگی کا لطف اسی فقیری اور خودداری میں ہے جس کا مظاہرہ حسرت اور بیگم حسرت دونوں نے کیا ہے۔ اقبال کا یہ شعر ان کی جیتی جاگتی تصویر کا منہ بولتا عکس ہے:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

نشاط النساء کا انتقال ایک طویل علالت کے بعد ۱۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو کانپور میں ہوا۔

حسرت بڑے خوددار انسان تھے، انھوں نے بڑی سے بڑی طاقت کا مردانہ وار مقابلہ کیا مگر اپنی خودی کا سودا نہیں کیا اور نہ اس پہ آنچ آنے دی۔ اور انھوں نے اسی خودی اور غریبی میں رہ کر شاعری اور صحافت و سیاست میں نام پیدا کیا۔ انھوں نے امیروں کے چونچلے کبھی نہیں اپنائے بلکہ ان سے ہمیشہ دور بھاگتے رہے، فقیری کو سینے سے لگائے رکھا اور ہمیشہ دولت و شہرت سے بے نیاز رہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو اہم واقعات یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی جن کی ساری زندگی علی گڑھ میں گزری اور انھوں نے اور خان بہادر ڈپٹی حبیب اللہ نے جتنا قریب سے علی گڑھ کو دیکھا اور پرکھا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ رشید صاحب کے حسرت سے بہت قریبی راہ و رسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے حسرت کو پی۔ ایچ۔ ڈی کا زبانی امتحان لینے کے لیے علی گڑھ بلوایا تو اپنے اسی سادہ لباس میں جوان کا یونی فارم تھا تشریف لائے۔ امتحان لیا اور چلنے کا وقت آیا تو رشید صاحب نے سفرِ خرچ کا بل فارم پیش کیا۔ اس کے بارے میں حسرت کی سادگی، دیانت اور سادہ لوحی رشید صاحب نے اس طرح بیان کی ہے جس کے ایک ایک لفظ سے صداقت کی بو آتی ہے۔

" اردو پی۔ ایچ۔ ڈی کا زبانی امتحان لینے حسرت علی گڑھ تشریف لائے تھے، ...... سفر خرچ کا بل فارم دستخط کے لیے پیش کیا گیا تو بولے یہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسا، میں تو تھرڈ کلاس میں سفر کیا کرتا ہوں، اور در اصل میں دہلی جا رہا ہوں، پروگرام ایسا رکھا تھا کہ یہاں آنرپڑوں اور امتحان لے کر آگے بڑھ جاؤں، پھر یہ کرایہ کیسا اور ٹھہرنے کا الاؤنس کیوں، طعام و قیام تو آپ کے یہاں رہا۔ بڑی دیر تک بڑے مزے کی ردوقدح ہوتی رہی اور علی گڑھ سے اپنی الفت کا اظہار کرتے رہے۔ حسرت بڑے زندہ دل

اور خوش گفتار تھے، میں نے کہا " مولانا یہ روپیہ تو آپ میری خاطر سے ہی لیں، اور میرے ہی اوپر اپنے ہاتھ سے صرف کر دیں" بولے ہاں یہ ہو سکتا ہے بتایئے کیسے؟ میں نے کہا "میرے لیے ایک ویسا ہی یونیفارم ہوا دیجئے جیسا کہ آپ پہنتے رہتے ہیں" بے اختیار ہنس پڑے، پھر بولے " یہ یونیفارم کیا کیجئے گا؟" میں نے کہا " دشمنوں کا خیال ہے کہ آپ اپنے مبدا یا خلیفہ مجھ ہی کو نامزد کریں گے، اس وقت یہ سجادہ میری کام آئے گا" بولے خرقہ یا سجادہ"۔ میں نے کہا " نہ یہ خرقہ نہ سجادہ۔ ان کا دعویٰ تو سب ہی کرتے ہیں۔ آپ کے یونیفارم میں تو آپ کا خلیفہ خانقاہ بر دوش نظر آئے گا" بہت محظوظ ہوئے۔ زہ زہ کرکے ہنستے اور داد دیتے رہے۔[۴]

اب دوسرا واقعہ بھی سُنیئے جس کے پڑھنے سے دل پر رقت طاری ہوتی ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں حسرت کی قناعت اور صبر جس کا وہ زندگی بھر مظاہرہ کرتے رہے، مُلاحظہ ہو:۔

ایک مرتبہ کان پور کے ایک سوداگر جو حسرت کے نیاز مند تھے، ان سے ملنے گئے تو دیکھا مولانا کچھ تحریر فرما رہے ہیں۔ (غالباً شرح دیوانِ غالب لکھ رہے تھے)، یہ سلام کرنے کے بعد شکستہ بوریے پر جو مولانا کے ڈیسک کے سامنے بچھا تھا بصد ادب بیٹھ گئے۔ مولانا لکھتے بھی جاتے تھے اور گفتگو بھی فرماتے جاتے تھے۔ پشت پر ایک پھٹا پُرانا پردہ لٹک رہا تھا۔ مولانا پردے کے پیچھے سے کچھ نکالتے اور مُنہ میں رکھ لیتے اور گُڑ کی ڈلی سے تھوڑا سا گُڑ کھا لیتے۔ سوداگر صاحب خاموشی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ جب ضبط نہ ہوا تو عرض کی کہ آپ کیا کھا لیتے ہیں، کچھ خادم کو بھی عطا ہو۔ مولانا نے پردے کے پیچھے سے مٹی کا ہنڈا نکال لیا جس میں

۴؎ نگارِ حسرت نمبر ۱۹۵۲ء ص ۲۶

سوکھی روٹیاں پانی میں بھیگی ہوئی تھیں۔ گڑ کی ڈلی بھی ڈیسک پر رکھ دی اور فرمایا "لو کھاؤ" "فقیروں کا کھانا تم نہیں رکھا سکو گے"۔ سو دو اگر آیا بیہوہ ہو گئے۔ مولانا نے فرمایا "آج تیسرا فاقہ ہے شکر ہے سوکھی روٹی میسر آ گئی۔ بڑی تسکین ہو گئی۔"[1]

حسرت کے ان واقعات نے ثابت کر دیا کہ انسان غریبی میں رہ کر بھی قوم کی خدمت کر سکتا ہے۔ حسرت لاہور جب بھی جاتے تو ان کا قیام شیخ مبارک علی کتب فروش کے یہاں ہوتا۔ یہاں ان کو وہی سادگی اور بے تکلفی حاصل تھی جس کے وہ عادی تھے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوتا کہ ان کی دوکان بند ملتی تو باہر ہی دوکان کھلنے تک اسی ریسمی یونیفارم میں منتظر رہتے، اور جب شیخ صاحب تشریف لاتے اور انھیں بیٹھا دیکھتے تو حیرت کرتے اور کہتے کہ مولانا گھر قریب ہوتے ہوئے یہاں پریشانی کیوں برداشت کی۔ وہ جنگ آزادی کے ایسے مجاہد تھے جن کے پاس نہ دولت تھی اور نہ جائداد اور نہ اتنا روپیہ جو اپنی ضروریاتِ زندگی سے فاضل ہوتا، جس کو آئندہ وقت کے لیے پس انداز کر کے بنک میں جمع کرتے، بلکہ غریبی، مفلسی اور خودداری میں رہ کر اپنی تمام زندگی اسی میں بتا دی۔ اس شائستہ تہذیبی ورثے کے وہ تنہا وارث تھے۔

حسرت موہانی جنگ آزادی کے صفِ اول کے مجاہد تھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی اور ان کو ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے لیے وہ عزم اور ارادے کے ساتھ آخر تک مقابلہ کرتے رہے۔

۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ پاکستان کی طرف اور دوسرا آبادی کے اعتبار سے ہندوستان کے حصے میں آیا۔ مولانا نے پاکستان بننے کے بعد ہندوستان میں رہنا پسند کیا۔ ان کی آواز میں وہ جادو تھا جس کی گل افشانیاں لوگوں کو تقویت دیتی رہیں۔ وہ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔ آزادی کے بعد جب

---

[1] حسرت موہانی۔ محمد طفیل عابد پوشہرا۔ حسرت نمبر آجکل اگست۔ستمبر ۸۱ء

ہندوستان کا دستور ۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو قانون ساز اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا تو منظوری سے پہلے اتفاق رائے کے لیے اسپیکر نے دریافت کیا کہ کیا ہندوستان کا یہ بنیادی دستور آپ سب حضرات کو منظور ہے؟ سب نے نئے دستور کی موافقت میں ہاتھ اٹھا دیئے لیکن اچانک پورے ایوان میں ایک آواز گونجی

"مجھے منظور نہیں ہے"

یہ تنہا آواز اس مردِ مجاہد کی تھی جس نے ۱۹۲۱ء میں جب گاندھی جی کانگریس پر چھائے ہوئے تھے اور تحریکِ ترکِ موالات کا بہت زور تھا اور کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی کا اجلاس احمدآباد میں ہو رہا تھا، اس موقع پر سب سے پہلے ہندوستان کے استقلال (انڈی پینڈنٹ) کی تجویز انھوں نے پیش کی تھی۔ گاندھی جی حسرت کے اس اقدام سے گھبرا گئے، مگر وہ اپنی بات پر جمے رہے۔ انھوں نے اس کو جب کھلے اجلاس میں پیش کیا تو کسی نے ان کے حق میں ہاتھ نہیں اٹھایا، لیکن اسے وقت کی ستم ظریفی کہیئے کہ اسی بات کو ۱۹۲۹ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش کیا تو سب نے اس کی تائید میں ہاتھ اٹھا دیئے۔ اسی طرح نئے دستور کی منظوری کے خلاف آواز اٹھائی تو کسی نے نہیں سنا، بلکہ سردار پٹیل تو تکفیر کے انداز میں مسکراتے ہوئے دکھائی پڑے۔ اس مجاہد کو یہ کیا معلوم تھا کہ آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وہ حقوق نہیں دیے جائیں گے جس کے لیے کانگریس کے ساتھ مل کر انھوں نے آزادی کا بگل بجایا تھا۔

افسوس کہ حسرت موہانی یا صاحب حسرت دیاس ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو کان پور میں انتقال فرما گئے۔ ان کی وہ آواز اب بھی ایوانوں کے ستونوں میں گونجتی سنائی دیتی ہے اور بے انصافی کی مذمت کرتی ہے۔ ذوق کا یہ شعر کس قدر رنگ و بو کی تمنا لیے ہوئے حسرت سے اپنے کارنامہ کا جائزہ لیتا ہے ۔

اگر یہ جانتے گُل چیں کے ہم کو توڑیں گے
تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے

حسرت موہانی ممتاز صحافی اور سیاسی رہنما تو تھے ہی، سماجی مصلح اور نقشبند کا

بھی اعلیٰ درجے کے تھے۔ ان سب حیثیتوں کے علاوہ وہ اُردو کے ممتاز شاعر بھی تھے۔ اُردو غزل کو اپنے پیش روؤں کے بعد حسرت نے ہی زندہ کیا اور اس کو نیا آہنگ اور لب و لہجہ دیا۔ انھوں نے جدید غزل کے نئے اصول وضع کئے اور تغزل کی صحیح راہ متعین کی۔ آپ نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ مگر شاعری میں ان کا اصلی کارنامہ جدید غزل ہے جس میں اپنا پورا زور صرف کر کے اس فن کو اعلیٰ سطح تک پہنچا دیا۔ ان کے چند مشہور شعر ملاحظہ ہوں :

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں — الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی — تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

نہیں ہے قدرداں کوئی تو ہیں ہم قدرداں اپنا — تکلف برطرف بیگانۂ رسمِ شکایت ہوں

مضطر ہے بہت میری طبیعت کئی دن سے — دیکھی جو نہیں آپ کی صورت کئی دن سے
چھیڑا ہے مجھے پھر خلشِ خارِ محبت — بے چین ہے پھر میری طبیعت کئی دن سے

ہزاروں بار نکلے اشک لیکن پھر بھی کم نکلے — الٰہی اور کیسے آرزوئے چشمِ نم نکلے

وہ جو بے چین ہوئے دیکھ کے حالت میری — ہو گئی اور پریشان طبیعت میری
دیکھ لینا کہ وفا میری رلائے گی تمھیں — یاد آئے گی مرے بعد محبت میری

بے کلی سے مجھے راحت ہوگی — چھیڑ دیں آپ عنایت ہوگی
ایک دن کھول کے جی رو لیں گے — ضبطِ غم کی تو اجازت ہوگی

اب یہ کیوں آپ بن کے پھر بگڑے — اب یہ کس بات پر عتاب ہوا

آپ کے ہاتھ سے کرم کہ ستم جو ہوا مجھ پہ بے حساب ہوا

کوچۂ اس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا
پردہ ہم سے جو وہ کرتے تھے نہ کرنے پائے شوقِ بیباک نے اس کو بھی اٹھا کر چھوڑا
تجھ سے ملنے پہ کسی کی ہمیں پروا نہ رہی سب کو دنیا میں تری یاد بھلا کر چھوڑا
ترکِ حسرت کا بہت رنج کیا آخر کار
اثرِ عشق نے ان کو بھی رلا کر چھوڑا

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا
عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا
کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

جس کو جو شئے تھی سزاوار خدا نے بخشی
مجھ کو جانباز کیا، تجھ کو دل آرام کیا

اب وہ کرتے ہیں جفا بھی تو نہیں پر حسرت
ہائے اتنی تو ہوئی آہِ رسا کی تاثیر

اب جو بگڑے تو خوشامد نہ کریں گے ہم بھی
کہ منانے سے وہ کچھ اور خفا ہوتے ہیں
دل سے مجبور نہ ہوتا تو نہ آتا حسرت
آپ اس بات پہ ناحق کو خفا ہوتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۲۶۸ پر)

ظفر ادیب

حسرت کی شعری شخصیت

اُردو شاعری کی شخصیات میں حسرت کی شعری شخصیت کئی پہلوؤں سے منفرد اور نہایت اہم ہے، غالباً یہ پہلے اُردو شاعر ہیں جو بہت سی شخصیتوں کا مجموعہ ہیں، اور ایک شخصیت کی پرچھائیں دوسری شخصیت پر نہیں پڑتی۔ اگر سیاسی ماحول میں پائے جاتے ہیں، تو شعری ماحول کی جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی، اور شعری ماحول میں تو بالکل شاعر ہوتے ہیں، جس کا انھیں دیکھ کر بالکل گمان بھی نہیں ہوتا۔ کیسے ماحول میں انھوں نے غزل کا احیا پروان چڑھایا! جب غزل پر دنیا بھر کے الزام آگئے تھے، اور اسے مُردہ اور بے کار صنفِ غزل قرار دیا گیا تھا، اور اسے گردن زدنی بھی کہہ دیا گیا تھا۔ سبھی کچھ تو ہو گیا تھا، غزل کا ایک بہروپ — کچھ بھی تو اصلیت نہیں رہنے پائی تھی۔

اُن کی شخصیت کا پہلا رُخ "اردوئے معلّیٰ" کے زمانے میں سامنے آیا، جب وہ حالی کو بھی کہنی اَن کہنی کہہ کر اپنی نوجوان طبیعت کے اُبال کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی زمانے میں اقبال پر اعتراضات کرتے ہیں۔ یاس یگانہ کو اہلِ زبان اور زبان دان قرار دینے کی مخالفت کرنے والے شعرا میں بھی شامل رہتے ہیں، معرکۂ چکبست و شرر میں بھی اپنے جذبات کے اظہار میں پیچھے نہیں رہتے۔ اور علی گڑھ کے ماحول میں کانگرس کی حمایت کرتے ہیں، اور بال گنگا دھر تلک کو اپنا سیاسی پیشوا مانتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا یہ انداز آخری دَور تک رہا، وہ کہیں بھی احتجاج اور بغاوت کی روش کو خیرباد نہیں کہہ سکے۔

"اُردوئے معلّیٰ" جولائی سنہ ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا، اور ہر ایک شمارہ ایک نہ

ایک ہنگامہ اپنے دامن میں لیے رہا۔ یہ ہنگامی دَور علمی اور جذباتی نہیں تھا۔ اس کی بنیاد میں ایک شعوری غور و فکر تھا۔ اسی لیے اس دَور کی روح ہمیشہ ساتھ رہی۔ اور کسی دَور میں ماند نہیں پڑی۔ وہ صحیح معنوں میں اُردو تنقید اور ہندی سیاست کے ANGRY MAN تھے۔ انھیں نہ سوادِ اعظم کی پرواہ رہی اور نہ وہ رائے عامّہ کے دباؤ میں آئے اور نہ قید و بند کا اندیشہ دامنگیر ہوا۔

مولانا عبدالحق "چند ہمعصر" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس بے ڈول قالب میں بے پایاں روحانی قوت، اخلاقی جسرات اور خلوص و صداقت تھی۔ اپنے خیال کے اظہار میں نہایت بے باک۔ جس طرح انھوں نے کانگرس میں کامل آزادی کی آواز اٹھائی، اسی طرح مسلم لیگ میں بھی نعرۂ حق بلند کیا۔" (ص۔ ۳۶۱)

شعری حُسن کے خد و خال اُجاگر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"انھوں نے اپنے افکار و خیالات سے شعر کا درجہ بلند کر دیا، وہ شعرائے شعر کے سرخیل میں، خواہ وہ زندگی کی سادگی ہو، یا سیاست انتہا پسند تھے، شعر میں انھوں نے اعتدال، متانت اور حُسنِ ذوق کو قائم رکھا۔" (ص ۳۶۳)

"حالی" سے متعلق اپنے مضمون میں مولانا عبدالحق ان کی طبیعت کا یہ رُخ پیش کرتے ہیں جس میں اُن کی دَرویشانہ مشرقی اقدار کی پاسداری کا پتہ چلتا ہے:۔

"علی گڑھ میں سید زین العابدین کے مکان پر حسرت موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سید "اُردوئے معلّیٰ" کے دو تین پرچے اٹھا لائے۔ ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور "اُردوئے معلّیٰ" کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے

لہ ۱۹۰۸ء میں اُردوئے معلّیٰ میں ایک مضمون مصر میں انگریزوں کی حکمت عملی"
(باقی صفحہ پر)

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے "ارے مولانا، یہ دیکھیے، آپ کی نسبت کیا لکھا ہے[1]" فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا کہ نکتہ چینی اصلاح زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔"

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ "حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟" جواب دیا کہ :-

"جو کچھ لکھ چکا ہوں، اس کا ملال اب تک دل پر ہے۔"

(رئیسِ چند ہمعصر ص ۱۸۰-۸۷ اردو اکیڈمی سندھ)

اس اظہارِ ملال سے بھی اپنی حد سے بڑھی ہوئی انتہا پسندی پر افسوس کا احساس ہی کیا ہے، غالباً سطحی، جذباتی اور غیر شعوری غور و فکر کی بات نہیں کہی ہے، کیوں کہ اپنی جوان طبیعت کے تقاضے کے مطابق لکھا تھا، جو بھی لکھا تھا، مخالفت کے جذبے کے تحت نہیں لکھا تھا۔

مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں :-

"امیر و داغ نے اُردو زبان کی جمہوریت کو مستحکم بنایا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں تک نفسِ شاعری کا تعلق ہے اس میں رکاکت - ابتذال اور پستی کی لے بھی انھیں بزرگوں کے دم سے بڑھی ہے" غزل سرا ص ۲۱۵

اس میں مصنوعی جذبات (تصنع) اور تفریحِ عشق و محبت کے احساسات کا بیان (مبالغہ) کا اور اضافہ کر لیا جائے تو اُس سے حسرت سے پہلے اور غالب سے بعد کی غزل کا صحیح اور بالکل درست خاکہ آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ حسرت کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں

بقیہ صفحہ —— کے سلسلے میں دو سال قید سخت کی سزا ملی، اور تحریکِ ترکِ موالات میں نمایاں حصہ لینے کی وجہ سے پھر قید و بند سے دوچار ہوئے۔ (حالاتِ شعرائے "شاہکار تغزل")

[1] ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے اردوئے معلی جاری کیا تو حالی پر اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس گرچہ اُردوئے معلی باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ (رئیسِ چند ہمعصر)

نے غزل کے مضامین کو واقعی واردات کے طور سے پیش کیا۔ موضوعات میں تنوع نہیں
صنفِ غزل میں غالب ہی کا حصہ رہا ہے۔ وہ مومن اسکول کے سچے اور بڑے ہی جاندار پیرو
ہیں۔ غزل کو اُس کے اپنے موہومات سے باہر نہیں جانے دیتے۔ لیکن تغزل کی روح کو جو اُس سے
تقریباً مفقود ہو چکی تھی، جسدِ غزل میں دوڑاتے ہیں۔ غزل میں عدمِ اصلیت کا جو دَوردورہ ہو
تھا، اُسے ختم کرنے میں، حسرت کا بڑا ہاتھ ہے، اُنھیں ہم غالب اور عصری غزل (جدید غز
کے درمیان کی لڑی بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے غزل کو "غزل" سے نجات دلائی، جو
کے یہاں ماسوائے چوتھائی دیوانِ غالب عام رہی ہے۔ حسرت کی غزل نے غزل کو عصری
کے بھی، تقاضے اپنی تمام تر رنگینی، شگفتگی اور واردانی کیفیت کے باوجود پورے کرنے کے قابل بنا
حسرت کی سیاسی زندگی کو جان کر اُنھیں اُن کی سادگی اور دُرویشی کے ساتھ دیکھ کر
ہوتی ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار کہنے والا شاعر اُن کے اندر کہاں اور کتنی تہوں کے نیچے چھپا
ہے، اور کیا یہ اشعار اُنہی کی شخصیت کے کسی گوشہ کی تہہ سے نکلے ہوئے ہیں۔

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خودبخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

یہ "شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گدازِ میر" کہنے والا شاعر کتنا رنگین طبع اور کتنا دقیق نظ
کتنا نفیس احساس ہے، اس کے ایسے ہی اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ بات صادق
ڈاکٹر یوسف حسین خاں پر:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

تو حسرت کو غالباً اُن کا سب سے پسندیدہ شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے رنج

۱؎ اصغر علی خاں نسیم دہلوی کا سلسلہ امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے واسطے سے مومن سے
اس سے غالباً یہ مراد ہے کہ لکھنؤ اور دلی کا حسین و لطیف امتزاج جو حسرت کے بعد اور بہت
میں پایا جاتا ہے اور جو اُردو شاعری خصوصاً اُردو غزل کی جان ہے یا جس سے اُردو غزل میں جا

غزل میں، اُن کے اشعار کا انتخاب تقریباً ۹ صفحات پر دیا ہے جب کہ انھوں نے غالب کے اشعار کے انتخاب سے متعلق صفحات کی بھی یہی تعداد رکھی اور میر کے اشعار بھی اس سے کچھ ہی زائد صفحات پر درج کئے اور "اردو غزل" کے تبصرۂ غزل والے حصے میں کئی مقامات پر اچھے انداز سے ذکر کیا، اور اردو غزل کو حسرت کی دین کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔[۵]

مجنوں گورکھپوری جو ہمارے سربرآوردہ ناقدوں میں سے ممتاز حیثیت کے ناقد ہیں "غزل سرا" میں "حسرت کی غزل" حسرت کے ایک مقطع سے شروع کرتے ہیں:

اردو میں کہاں ہے اور حسرت
یہ طرز نظیری و فغانی

یہ دونوں شاعر غالب کے ممدوح شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ غالب فغانی کو تو "شیوۂ خاص کا مبداء" کہتے ہیں اور ایک خط میں "میزانِ شعر" کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

"فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبداء ہوا، خیال ہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے۔ سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی ..... فغانی کا انداز پھیلا، اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔"

نظیری اسی گروہ یا اسی سلسلے ہی سے ہیں، لیکن اُن میں تغزل دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس پہلو سے وہ حافظ کی روش اور زبان و بیان کے شاعر ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ حافظ کی سرمستی اور وجدانی کیفیت "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" کی ذیل آتی ہے اور غالبؔ کوئی شاعر اتنا خوش نصیب نہیں ہوا کہ خدا نے اُسے یہ شیوہ اتنا ارزاں کیا ہو۔ غالب اس کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تازہ گوئی، تازہ خیالی اور ابداع وغیرہ

۵ے اس زمانے کے اردو کے دو سب سے بڑے شاعروں کے کلام کو دیکھیے، جن میں سے ایک نظم کا، دوسرا غزل کا بادشاہ ہے، ان سے میری مراد اقبال اور حسرت ہیں۔ اقبال کی نظم میں تغزل کی خوبی اور حسرت کی غزل میں نظم کا معنوی تسلسل خاص طور پر نظر آتا ہے

۱۔ اردو غزل ص ۴۲۔

حسرت کے یہاں نظیری کا اثر تو پایا جاتا ہے لیکن فغانی کا شیوہ میرے خیال میں موجود نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے، یہاں حسرت کی مراد صرف طرزِ نظیری ہی ہے "اور فغانی بہ تقاضائے قافیہ ہی آپڑا ہے۔ اگرچہ اسے بالکل بے تعلق یا بے محل بھی قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ فغانی ہی کا ایک رُخ نظیری میں اُجاگر ہوتا ہے۔

چوں کہ غالب کے یہاں "خیالہائے نازک" اور "معانیِ بلند" کی بڑی اہمیت ہے اس لیے وہ اسی نوع کے شعرا کے گرویدہ رہے، اور اُنھی کا بار بار ذکر کرتے ہیں، اور اُنھیں سے تنبیہ حاصل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بیدل کے ذکر میں وہ وفور اور جوش بلکہ عقیدت بھی نہیں رہی، جب کہ ان خصوصیات کے وہ اتنے بڑے حامل ہیں کہ اُس کے سامنے فغانی اور اُن کے نوع کے شعراء کی اہمیت ویسی جگمگاتی نہیں رہ جاتی ہے، جیسی کہ بیان کی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ہندی نژاد ہیں۔ غالب کے بعد ابتدائی دور ہی میں سہی اگرچہ اثر آخر وقت تک رہا) اقبال بھی ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہیں، یہ فارسی شاعری کے (ہندستانی فارسی شاعری یعنی سبک ہندی شاعری) مسیحا ہیں۔ اور "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں" ان کے لیے بھی درست ہی ٹھہرتا ہے، اس جملۂ معترضہ سے یہ مُراد بھی کہ حسرت دوسرے انداز ہی کے "خیالہائے نازک" اور "معانیِ بلند" کے حامل رہے ہیں ان بزرگوں کے معاملات ان سے دیگر ہی ہیں۔ حسرت غزل اور خالص غزل کے علمبردار[۱] ہیں، داغ کی غزل کے نہیں، مومن کی غزل کے۔ جس میں حُسن و عشق کی نفسیات، اور فطری واردات احساسات اور جذبات کی ہمہ رنگ و ہمہ جہت کیفیات پائی جاتی ہیں، اور جو خوش باشوں کے مشغلے، زبان کے چٹخارے، اور جہل اور ٹھٹھول کی شاعری کو جو اُس وقت رہ گئی تھی اصلیت کی آنچ سے کندن بنا دیتی ہے۔ اگرچہ موضوع کی نوعیت وہی رہتی ہے۔ لیکن اصلیت، اور واقعیت سے کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ حسرت کی غزل "جذباتِ انسانی کا مرقع اور فطری

---

[۱] حسرت اپنی انگلیوں کے ایک ایک پور تک شاعر تھے، اُن سے اُردو غزل کا نشاۃِ ثانیہ شروع ہوا (غزل سرا - مجنوں گورکھپوری)

جذبات سے مزین" ہے[۱] بقول نسیم قریشی :-

"دورِ جدید میں حسرت اس روایت (سادگی اور بے ساختگی کی روایت) کے خالق اور اس راہ کے امام ہیں[۲]"

"دیکھا جائے تو سیاست ہی کے رئیس الاحرار نہ تھے، اُردو شاعری کے بھی تھے، صرف شاعری میں جوش کے عالم میں بھی سر رشتۂ اعتدال ہاتھ سے نہیں چھٹنے پاتا[۳]"

"ایسے عالم میں امیر جیسا فاضل اور درد روش بھی اس قسم کے رکیک اور مبتذل مضامین باندھنا کمال شاعری اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا، جب ہم حسرت کی زبان سے یہ اشعار سنتے ہیں تو ہمارے اندر ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے اور ہم چونک پڑتے ہیں۔ ہمیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں سے اُردو غزل میں نئی توانائی آگئی ہے اور اب اس نے ایک نئی خوش آیند سمت میں قدم اُٹھایا ہے" غزل نمبر ۱۔ ص ۔ ۳۱۶۔

جو اشعار دیئے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں :

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں آپ کی یاد کے سوا نہ رہا

دیکھنا بھی تو اُنھیں دُور سے دیکھا کرنا شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہے حسرت اُن سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں

۱۔ ساقی و پیمانہ، شمع و پروانہ، گل و بلبل وغیرہ اُن کے خاص موضوع کلام ہیں۔ دوستوں کا شکوہ، احباب کا ماتم، سیاسی مذہبی عقائد سب کچھ پائے جاتے ہیں (ڈاکٹر اعجاز حسین مختصر تاریخ ادب) ۱۔ حالات شعراء (شاہکار نظم) [۲] اردو ادب کی تاریخ [۳] چند ہمعصر

حسرت کے کلام کو ایک مربوط مسلسل اور زندہ غزل کی تاریخ قرار دیتے ہوئے مجنوں صاحب کہتے ہیں :-

"یہ دھوکہ کہ حسرت کے اشعار پر اساتذہ کے رنگ کا دھوکہ محض سطحی ہے ہے، اور اس کا تعلق اسلوب سے زیادہ ہے، اور شعر کے اصلی مزاج سے کم۔ حسرت کا ہر شعر..... اپنے اندر ایک شدید انفرادیت رکھتا ہے، جس کو ہم صرف حسرت سے منسوب کر سکتے ہیں"

پھر جو اشعار دیئے ہیں، اُن میں سے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جایئے — بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے
میری تحریر ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب — دیکھ لیجئے اور تغافل آشنا ہو جایئے
ہاں یہی میری بے اثری کی ہے سزا — آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جایئے
جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے — اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جایئے
ہائے رے بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر — اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جایئے

اسی انفرادیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں :-

"جو خاموش تیکھا پن اُن کے کلام میں محسوس ہوتا ہے، وہ مومن - جرأت اور داغ کا تیکھا پن تو خیر ایک طرف، غالب کے طنز سے بھی زیادہ عارفانہ اور زیادہ باوقار ہے۔"

اور پھر ایسے اشعار دیئے ہیں اپنے دعوے کی تصدیق میں :-

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں — کیا ہوا اُن سے اگر بات بنائی نہ گئی

مل رہے گا جو اُن سے ملنا ہے — لب کو شرمندۂ دُعا نہ کریں

ہشیار کہ اس پرسشِ بیہم کی نوازش   عشا ستم کش کو ہوس کار نہ کردے

ہم پر بھی مثلِ غیر ہیں کیوں مہربانیاں   اے بدگمان یہ خوب نہیں بدگمانیاں

ریع ذیل اشعار دیتے ہوئے مجنوں صاحب لکھتے ہیں :-

"ان اشعار میں حسرت کا اصلی کردار جھلک رہا ہے، جو جانبازانہ صداقت، اُن کی شخصیت کی ترکیب میں داخل ہے، وہ اُن کے اشعار میں بھی نمایاں ہے، بغاوت کی حد تک بڑھا ہوا خلوص، اُن کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم عنصر ہے، وہی اُن کی جان ہے۔

جو یہ پیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا   دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

نہ سہی آپ جفا سے جو نہیں باز آئے   جایئے جایئے ہم کو بھی اب اصرار نہیں

مؤمن کی حکیمانہ جدّت طرازیوں"، غالب کے الفاظ کا گنجینۂ معنی کا طلسم" کا ذکر کرتے کرکے حسرت کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"حسرت بیان اور الفاظ اور بندشوں کی تازگی کو قائم رکھتے ہوئے مضمون کی وانفیت اور موضوع کی عمومیت اور جامعیت کو ایک لمحے کے لیے بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے"۔۔۔۔۔۔ "جب ایک مرتبہ ہم اُن کے شعر کے مفہوم کو سمجھ لیتے ہیں تو اس کو عام انسانی دنیا کے لیے قابلِ قبول پاتے ہیں، حسرت کی یہ ہمہ گیر انسانیت کم سے کم اردو غزل میں اُن کا اپنا ذاتی اکتساب ہے۔"

یہ غالباً ادب الاساتذہ کے مطالعہ اور زندگی کے وسیع تجربے کے پس منظر میں ہی ہوسکا ہے، عصری رجحانات کی تفہیم بھی بڑی حد تک اس سلسلے میں کارگر ہوئی ہے۔

حسرت کی انفرادیت کی مزید وضاحت اور تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"میرا دعویٰ یہ ہے کہ حسرت نے ہر رنگ اور ہر سطح پر اپنی انفرادیت
قائم رکھی ہے، وہ جس وقت مصحفی، جرأت اور داغ جیسے شاعروں کے رنگ
میں بھی شعر کہتے ہیں، تو وہ اپنے پیش رووں اور ہمعصروں سے زیادہ مہذب،
زیادہ شائستہ اور زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں، اور اُن کے انداز بیان میں وہ
دل نشینی ہوتی ہے جو صرف معصومیت میں پیدا ہو سکتی ہے۔"

مجنوں صاحب کے دیئے ہوئے اشعار میں سے یہ تین شعر پیش کیے جاتے ہیں :-

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان، سویرا دیکھو

غیر کی نظروں سے بچ کر، سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

وہ بھری دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حسرت اپنے مخصوص لب و لہجے سے معاملہ بندی کے اشعار کو معاصر شعرا کے سستے پن سے بچائے جاتے ہیں۔ وہ بے جھجک جو کہنا چاہتے ہیں، کہہ جاتے ہیں اور کسی نفسیاتی مزاحمت کو حائل نہیں ہونے دیتے۔ وہ نظارہ بازی کو معصوم انسانی فطرت کا تقاضہ ہی سمجھتے ہیں اگرچہ اسی رَو میں بعض اشعار اُن کے منافیٔ شان بھی آپڑتے ہیں وہ اپنی فطری معصومیت اور خداداد آزاد منشی کے دفور میں اُن سے گذر جاتے ہیں۔

مجنوں صاحب نے حسرت کی شاعری کو ہر پہلو سے کما حقہ طور پر عاشقانہ کہا ہے اور کہتے ہیں:

"حسرت کے کلام کے عام تیور صرف عاشقانہ ہیں، وہ صرف عاشقی اور شاعری
کے لیے پیدا ہوئے تھے۔"

اس بات کے پہلے حصے سے شاید ہی کسی کو انکار ہو سکے۔ لیکن دوسرے حصے کی بات سے بہتوں کو اتفاق نہ ہوگا۔ یہ بات اُن کی سیاست کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے اور ہر موقع پر اور

اور ہر ماحول میں حق کے اظہار کے لیے بھی انتہاپسندی اُن کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ نہ جانے وہ شاعری میں کیوں معتدل رہ پائے، کون سی ایسی بات تھی جو اُنھیں اس پہلو پہ مائل کیے رہی، یہ ضرور ہے کہ اُن کی زندگی کے جس پہلو کو بھی دیکھا جائے، یہی اندازہ ہوگا کہ وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ یہ اُن کا کھرا خلوص ہی تو ہے جو ایسا محسوس کراتا ہے۔ درحقیقت ازلی ANGRY MAN تھے۔ شاعری میں بھی یہی روش رہی۔ لیکن یہاں وہ جلالی کے بجائے جمالی رہے۔

انتخاب میں آجانے والے اشعار کی تعداد بڑی ہے اور یقیناً ہر رنگ کی طبیعت کے پسندیدہ اشعار اس میں دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن عاشقانہ نہیں ——— تفنّنِ طبع کے نہیں، دل میں اُتر جانے والے، اور یادوں سے چپک جانے والے، اس لیے کہ وہ شعر برائے شعر نہیں ہیں، ان میں اصلیت کی آنچ اور واردات کی روح ہے اور فطری کیفیات، نفسیاتی حقائق اور قلبی احساسات کی آفاقیت ہے، اسی لیے پڑھنے والے کو بھی اُن میں اپنی ہی کہانی معلوم ہونے لگتی ہے۔

حسرت اُردو کی غزلیہ شاعری کی ایسی شخصیت ہے جس کی تعمیر کا ہر عنصر شاعرانہ ہے، وہ اپنی غزل میں رنگ و بُو کے گلستاں کھلاتے ہیں۔ اُن کے گلستاں کے پھول کاغذی نہیں ہیں، وہ ہم جیسے انسانوں کی طرح گوشت پوست اور آب و رنگ کے پھول ہیں اسی لیے ہم اُن کی شاعری کو پڑھتے ہوئے اُن کے ساتھ خوابوں اور خیالوں کی دُنیا میں نہیں پہنچتے، بلکہ جیتی جاگتی اور بزم و گرم سانس لیتی ہوئی دُنیا میں اپنے آپ کو موجود پاتے ہیں، اور اپنے آپ کو زندہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ دُکھ درد کی دُنیا میں نہیں، چین سُکھ کے ماحول میں ——— یہ حسرت کا ہم اُردو والوں پر احسان ہی ہے کہ اُردو غزل کی یہ خوش آئند تصویر بھی دکھادی اور ہم صرف قنوطی نہیں رہ گئے، بلکہ ہمیں رجائیت کا بھی احساس ہوگیا اور ہم یہ بھی جاننے لگے کہ اس نام کی کوئی چیز اُردو شاعری کی دُنیا میں بھی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ہم اور آپ اس دُنیا میں ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۶ سے آگے)

میں ہوں کیا میری محبت کی حقیقت کیا ہے — اُس نے یہ بھی تو نہ پوچھا تری حالت کیا ہے
مجھ سے برگشتہ نہ ہوتے تو تعجب ہوتا — آپ کو عذرِ تغافل کی ضرورت کیا ہے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے — ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے
بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا — اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا — اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً — اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
مجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ — حالِ دل باتوں میں جتانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف — وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے — وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ — مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

بام پہ آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا
کیا کہا میں نے جو ناحق تو خفا ہونے لگا — کچھ سنا بھی یا کہ یوں ہی فیصلہ ہونے لگا

نامرادوں کو شاد کام کرو — کرم اپنا کبھی تو عام کرو
سب کی خاطر کا ہے خیال تمھیں — کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو — تم بھی حسرتؔ انھیں سلام کرو

مانوس ہو چکے تھے ازل میں فنا سے ہم — اس انتہا کو جانتے ہیں ابتدا سے ہم
اس انجمن کے شوق میں جی کا زیاں سہی — اک بار ان کو دیکھ تو لیں گے بلا سے ہم

رونقِ دل یوں بڑھائی جائے گی — غم کی اک دنیا بسائی جائے گی

(باقی صفحہ ۳۰۷ پر)

محمد ضیاء الدین انصاری

حسرت کی تنقید نگاری

اردو تنقید نگاری کے اولین نمونے شعراء کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ اس تذکرہ نگاری کی ابتدا اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بات بالتحقیق نہیں کہی جاسکتی کہ کونسا تذکرہ سب سے پہلے تالیف کیا گیا تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ دستیاب کردہ میں تین تذکرے ایسے ہیں جن کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ ہیں میر تقی میر کا 'نکات الشعرا' افضل بیگ قاقشال' اورنگ آبادی کا 'تحفۃ الشعراء' اور خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا 'گلشن گفتار'۔ ان تینوں کا سال تالیف ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء ہے۔ اس طرح ۱۷۵۲ء کو بلا شک نہیں قرار دیا جاسکتا ہے یہی تذکرے اردو تنقید نگاری کا نقطہ آغاز ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان فارسی ہے

یہ ضرور ہے کہ ان تذکروں میں منظم اور مربوط تنقید نہیں ملتی۔ بنیادی طور پر یہ تین عناصر پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں: شاعر کے مختصر حالات' اس کے شاعرانہ فن کی خصوصیات کی طرف اشارے اور انتخاب کلام۔ لیکن یہ سب بڑے مختصر انداز میں۔ اسی اختصار اور ایجاز کی بنا پر ہمارے بعض ناقدین ان تذکروں کے قایل نہیں' اور ان کو تنقیدی ادب میں جگہ دینے کو تیار نہیں۔ اس گروہ ناقدین میں سر فہرست نام کلیم الدین احمد کا نظر آتا ہے۔ ان کا خیال ہے:

> "جس طرح اردو شعرا شاعروں کی ماہیت اور نظم کے مفہوم سے ... واقف نہیں تھے' اسی طرح یہ تذکرہ نویس تنقید کی ماہیت' اس کے مقصد اس کے صحیح پیرایئے سے آشنا نہ تھے' اس لیے ان تذکروں کی اہمیت

محض تاریخی ہے۔ دنیائے تنقید میں یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔" لہ

اس قسم کی رائے صرف اسی وقت قایم کی جا سکتی ہے جب ہم ان تذکروں کا گہرائی سے مطالعہ نہ کریں اور اس عہد کے عام رجحانات کا درک نہ رکھیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان تذکروں میں تنقید اپنی ترقی یافتہ شکل میں نظر نہیں آتی، نہ ہی کسی شاعر کے کلام پر تفصیلی رائے ملتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں ایسے اشارے ضرور ملتے ہیں جن پر ہم تنقید کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ تذکرہ نگار خود شاعر ہوتے تھے اور فن شعر پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اسی لیے کسی بھی شاعر کے کلام کے متعلق ان کی رائے بڑی معنویت اور اہمیت رکھتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میر تقی میر، میر حسن، قایم چاند پوری اور مصحفی کے تذکرے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں بھی میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعرا" امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں شعرا کے کلام پر تبصرے کے ساتھ ساتھ اکثر ان کے کلام کے نقائص کی طرف بھی نشاندہی کی گئی ہے اور کہیں کہیں اصلاح بھی موجود ہے۔

تذکرہ نگاری کا یہ انداز اردو میں اتنا مقبول ہوا کہ ناقدین ادب مدتوں تک اسی طرز کی پیروی کرتے رہے اور بیسویں صدی کے ربع اول تک مشرقی طرز کی اسی تنقید کا رواج عام رہا جس میں زبان و بیان، محاورہ اور طرز ادا کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی، فن کار کی نفسیات، اس کے ماحول، ذہنی افتاد، اور اس فن پارہ کی تخلیق کے پس منظر پر غور نہیں کیا جاتا تھا۔ اگرچہ انیسویں صدی کے اختتام تک مولانا حالی نے اردو میں جدید تنقید کی بنیاد ڈالی دی تھی اور "مقدمۂ شعر و شاعری" جس کی تکمیل ۱۸۹۳ء میں ہوئی، کے ذریعہ اردو داں طبقہ کو مغربی تنقید سے روشناس کرا دیا تھا جس میں محض وجدان طبع سے ہٹ کر، اصول و نظریہ کی کار فرمائی ہوتی ہے لیکن اس مقدمہ کو تنقید جدید کی اساس کے طور پر کم اور قدیم روایتی شاعری کے خلاف علم بغاوت کی حیثیت سے زیادہ لیا گیا حالاں کہ بنیادی طور پر یہ تنقید ہی کتاب ہے اور بقول مولوی عبدالحق:

"مقدمۂ شعر و شاعری میں شاعری کی ماہیت، حیات اور سماج سے اس کا تعلق

لہ اردو تنقید پر ایک نظر۔ ص ۲۰

اس کے لوازم، زبان کے مسائل، اُردو شاعری، اصناف سخن، ان کے عیوب، محاسن اور اصلاح پر بہت معقول اور مفکرانہ بحث کی ہے۔ اُردو زبان پر تنقید کی یہ پہلی کتاب ہے، اور اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔" [1]

مقدمۂ شعر و شاعری کی تنقیدی اہمیت کے باوجود ہمارے دانشوروں نے مدتوں تک اس طرف نظر التفات نہیں کی، اور اُردو شعراء کے تذکروں کے مولفین نے جو روش قایم کی تھی اسی پر ہی چلتے رہے اور اسی طرز کو معیاری اور قابل تقلید تصور کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مولانا حسرت موہانی نے بھی جب تنقید کے میدان میں قدم رکھا تو مولانا حالی کے دکھائے ہوئے راستے پر گامزن ہونے کے بجائے، انھوں نے بھی تذکرہ نگاروں کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دی۔ حالاں کہ انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی، اور ادب کے جدید تقاضوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔

حسرت نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے ہی تنقیدی مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے۔ پھر جب ۱۹۰۳ء میں انھوں نے علی گڑھ سے اُردوئے معلی جاری کیا تو اس طرف باقاعدگی سے متوجہ ہوئے اور "تذکرۃ الشعراء" کے عنوان کے تحت اردو شعراء کے سوانح، ان کے کلام پر اظہار رائے اور انتخاب کلام ... کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کی غرض و غایت بتاتے ہوئے انھوں نے لکھا:

> "آزاد کے دردمند دل کو اُردو کی محبت نے مجبور کیا۔ تذکرہ آب حیات لکھا گیا، اور حق یہ ہے کہ بے مثل لکھا گیا۔ یہ اسی کی بدولت ہے کہ کبھی مصحفی کا نام زبانوں پر آجاتا ہے۔ جس طرح آزاد نے مصحفی کا نام روشن کیا، خدا ان کی شہرت تا قیامت قایم رکھے۔ لیکن بندۂ حسرت کی آرزو کہتی ہے کہ مصحفی کی طرح ان کے شاگرد ہوس، شہیدی، علیشی، غافل، گرم، مضطر، تنہا بھی اپنے کمال کی کیوں نہ داد پائیں۔ آزاد پر ذوق، مومن و غالب کا حق تھا، حسرت پر نسیم، تسلیم اور امیر کا حق ہے۔

---

[1] اردو سہ ماہی (اورنگ آباد) جلد نمبر ۲۵۔ شمارہ ۲۳ (جولائی ۱۹۳۵ء۔ ص ۲۲۶)

اپنی ہیچمدانی کا علم ہے لیکن اصرارِ طبیعت کو کیا کروں۔ تمنا مجھ سے کہتی ہے اور میں قلم سے کہتا ہوں کہ لکھ، جو کچھ ہوسکے لکھ۔ جانتا ہوں کہ حق تذکرہ نویسی ادا نہیں کرسکتا، پھر بھی آمادۂ تحریر ہوں" [۱]

اس کے بعد اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زمانۂ شاعری کی تقسیم طبقات کے لحاظ سے چاہئے تھی، لیکن دلچسپی مزید کے خیال سے اس طریق کو پسند کرتا ہوں کہ دورِ اوّل کے کسی اُستاد کا حال لکھ کر ضمن میں اس کے سلسلۂ تلمذ میں اس وقت تک جتنے اُستاد ہوئے ہیں ان سب کا حال لکھا جائے، اور پھر اسی طور پر دورِ اول کے دوسرے استاد کا ذکر شروع ہو۔ علیٰ ہذا" [۲]

اس سلسلہ کے تحت شاہ ظہور حاتم، مرزا محمد رفیع سودا، قائم چاندپوری، مصحفی، مومن اور نسیم دہلوی جیسے اساتذۂ فن اور ان کے سلسلہ کے شعراء پر مضامین شائع ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں ان کی پالیسی میں کسی قدر تبدیلی واقع ہوئی۔ جس کی وضاحت انھوں نے اکتوبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں ان الفاظ میں کی:

"مدت سے ہمارا ارادہ تھا کہ اُردو زبان میں تمام گزشتہ اور موجودہ اساتذہ کا ایک ایسا تذکرہ ترتیب دیا جائے جس میں ہر اُستاد کا مفصل حال اور اس کے کلام پر بے لاگ تنقید موجود ہو۔ اس تذکرے کی تقسیم باعتبار سلاسلِ شعراء پانچ جلدوں میں ہو۔ اس طور پر کہ جلد اول میں سلسلۂ شاہ حاتم کے کل اُستادوں اور صاحبِ دیوان شعراء کا ذکر ہو، جلد دوم میں سلسلۂ مصحفی کا، جلد سوم میں سلسلۂ ناسخ کا، جلد چہارم میں سلاسل میر تقی میر، میر سوز، مرزا مظہر، جعفر علی حسرت و مرزا غالب اور جلد پنجم میں اساتذۂ متفرق کا حال

---

۱ اردوئے معلی۔ جلد ۱۔ شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۰۳ء) ص ۱ و ۲

۲ اردوئے معلی۔ جلد ۱ شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۰۳ء) ص ۳

درج ہو"
چناں چہ اس سلسلہ کے ذیل میں شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، میر حسنؔ، تسکینؔ اور تسلیمؔ جیسے اساتذۂ سخن اور ان کے تلامذہ پر مضامین شائع ہوئے۔

بعض ناگزیر حالات کی بنا پر اُردوئے معلّیٰ جون ۱۹۱۳ء کے بعد بند ہو گیا لیکن جنوری ۱۹۲۵ء سے پھر جاری ہو گیا۔ اس وقت حسرتؔ علی گڑھ سے کانپور منتقل ہو چکے تھے اپنا اُردوئے معلّیٰ بھی اب بجائے علی گڑھ کے کانپور سے شائع ہوا۔ اس کے از سر نو اجرا کے ساتھ ہی تذکرۂ شعرا کا سلسلہ بھی عود کر آیا اور تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ سلسلہ پھر شروع ہوا لیکن اب اس کا عنوان 'تذکرۃ الشعراء' کے بجائے 'اربابِ سخن' ہو گیا۔ چناں چہ اس دوسرے دَور کے پہلے ہی شمارہ میں اس سلسلہ میں یہ اطلاع دی گئی:

"یہ اردو شعرا کا ایک مکمل تذکرہ ہے جن کے ۸ طبقے قرار دیے گئے ہیں۔ ان طبقات میں سے طبقۂ ہفتم و ہشتم کے اکثر شعرا کا نام زیرِ عنوان "معاصرینِ حسرتؔ" ایک قطعہ میں درج کر دیا گیا ہے۔ آئندہ ہر ماہ ان معاصرینِ موجودہ و مرحوم سے کسی ایک کا تذکرہ بالالتزام شائع ہوا کرے گا۔" [1]

معاصرینِ حسرتؔ کے عنوان سے اس شمارہ میں ۱۶ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ درج ہے جس میں ۲۰۸ شعرا کے نام درج کیے گئے ہیں۔ اس کے نیچے مندرجہ ذیل وضاحتی نوٹ ملتا ہے:

"واضح ہو کہ قطعہ مندرجہ بالا میں ۲۰۸ تخلص درج ہیں۔ مگر ان میں سے بعض تخلص دو یا دو سے زیادہ شاعروں کے بھی ہیں۔ ان سب کو ملا کر معاصرینِ موجود و مرحوم کی تعداد ۲۵۰ ہوتی ہے۔"

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے حسرتؔ اپنے اس منصوبے کی وضاحت کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۲۳ء میں انھوں نے اس کا مکمل اور مفصل خاکہ پیش کیا:

"اربابِ سخن: اس نام سے ہم شعرائے اردو کا ایک جامع و مستند تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں

---

[1] اردوئے معلیٰ (کانپور) جلد ۱۶ شمارہ ۱-۲ (جنوری، فروری ۱۹۲۵ء) صفحۂ ٹائٹیل
[2] " " " " " ص ۲

جس کے مفصلہ ذیل پانچ حصے قرار دیے گئے ہیں:۔

حصۂ اول : سلاسل شعرائے اردو جس میں شعرائے اردو کی ترتیب و تقسیم ان کے سلسلۂ شاعری کے اعتبار سے درج کی جائے گی جس کے دیکھنے سے بیک نظر معلوم ہو سکے گا کہ کس شاعر کو کس خاندان سے تعلق ہے۔

حصۂ دوم : فہرست شعرائے اردو جس میں مذکورہ بالا سلاسل کے جملہ شعرا نیز شعرائے متفرق کی مکمل فہرست لقب، نام و نشان مرتب کی جائے گی۔

حصۂ سوم : تذکرہ شعرائے اردو جس میں تمام قابل ذکر شعرائے اردو کا حال مع انتخاب کلام درج کیا جائے گا۔

حصۂ چہارم : طبقات شعرائے اردو جس میں اردو زبان کے جملہ مشہور اور صاحب دیوان اساتذہ کی تقسیم ان کے زمانۂ شاعری کے لحاظ سے مفصلہ ذیل سات طبقوں میں کی جائے گی۔

طبقۂ اول، از ابتدائے عہد تا ۱۱۸۰ھ طبقۂ دوم، از ۱۱۸۱ھ تا ۱۲۱۰ھ

طبقۂ سوم، از ۱۲۱۱ھ تا ۱۲۴۰ھ۔ طبقۂ چہارم، از ۱۲۴۱ھ تا ۱۲۷۰ھ

طبقۂ پنجم، از ۱۲۷۱ھ تا ۱۳۰۰ھ۔ طبقۂ ششم از ۱۳۰۱ھ تا ۱۳۳۰ھ

طبقۂ ہفتم از ۱۳۳۱ھ (رواں)۔

حصۂ پنجم : مربیان شعرائے اردو۔ جس میں شاہان و امرائے دہلی و اودھ اور نوابان و امرائے مرشد آباد، عظیم آباد، حیدر آباد، رام پور، بھوپال، ٹونک، بنارس، کدورہ، فرخ آباد، باندہ وغیرہ میں سے ان کا حال درج کیا جائے جو خود شاعر تھے اور جنھوں نے اپنے زمانہ کے مشاہیر سخن کی مربی گری کی تھی۔" [۱]

ان توضیحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت ایک بہت جامع اور مفصل تذکرہ تالیف کرنا چاہتے تھے، لیکن اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ مذکورہ بالا پانچ حصوں میں سے صرف ابتدائی تین حصے شائع ہو سکے۔ باقی چوتھے اور پانچویں حصے کے شائع ہونے کی نوبت نہ آسکی۔ غالباً اس میں حسرت کی عدیم الفرصتی مانع آئی۔ حالات نے ان کو مہلت نہ دی کہ وہ اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ ان تمام سلاسل کے تحت تذکرے

---

[۱] اردوئے معلیٰ (کانپور) جلد ۱۲، شمارہ ۷، ۸ ... ۱۹۲۳ء ...

مجموعی طور پر ایک سو سے زائد شعرا پر مضامین قلمبند کئے۔ ان میں سے ہر ایک شاعر کے سلسلہ میں انھوں نے تفصیلی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں ۔ اس ضمن میں انھوں نے واضح طور مروّجہ تذکروں کی روایات سے انحراف کیا ہے۔ ان میں شاعروں کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں وہ عام طور پر چند سطور سے زیادہ نہیں ہوتیں، جب کہ حسرت نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور ہر ایک شاعر پر آزادانہ مضمون کی شکل میں عنوانات قایم کرکے معلومات فراہم کی ہیں۔ ان میں شاعر کے حالات زندگی، اس کے عام اخلاق و عادات، سلسلۂ اساتذہ، شاگردوں کا تذکرہ، اور اس کی شاعری پر عمومی تبصرہ شامل ہے اور یہ سب اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ اس سے ہر شاعر کے عہد کے ادبی رجحانات اور سیاسی و سماجی حالات بھی کافی حد تک روشنی پڑ جاتی ہے حسرت نے اس میں حتیٰ الامکان تحقیق سے بھی کام لیا ہے۔ اور محدود دائرے میں رہتے ہوئے تنقید کا حق بھی ادا کیا ہے ۔

حسرت جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مشرقی تنقید کے دبستان سے تعلق رکھتے ہیں مشرقی تنقید میں کسی مخصوص نظریے کی پیروی نہیں ہوتی، نہ ہی اس میں کسی نظریے کی مربوط اور منظم شکل دکھائی دیتی ہے۔ اس میں اصول و قواعد کو پہلے سے متعین کرکے ان پر فن پارے کو نہیں پرکھا جاتا، بلکہ نقاد محض اپنے وجدان سے کلام کے حسن و قبح کو پرکھتا ہے اور اس کے معانی و بیان، الفاظ و محاورہ کی صحت و عدم صحت اور بلندیٔ خیال کو واضح کر دیتا ہے، لیکن اس کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اس فن پارے کی تخلیق میں کن عوامل نے کام کیا ہے، اس کا سماجی، سیاسی اور نفسیاتی پس منظر کیا ہے اور اس کی تخلیق میں فن کار کو کن ذہنی مراحل سے گزرنا پڑا ہے ۔ یہ کام سائنٹفک یا نفسیاتی و تاثراتی تنقید نگار کا ہوتا ہے۔ مشرقی طرز کے تنقیدی اشارے ہمیں شعراء کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر میر کے "نکات الشعراء" کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اس میں میر نے شعراء کے کلام پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے محاسن کی تحسین اور عیوب پر گرفت بھی کی ہے اور کہیں کہیں اصلاح بھی ہے یہی انداز میر حسن کے "تذکرۂ شعرائے اُردو" اور شیفتہ کے "گلشن بیخار" میں بھی نمایاں ہے معلوم ہوتا ہے کہ حسرت نے ان تمام تذکروں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ان ہی کی قایم کردہ روایات کو قابل تقلید

پایا۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ نسبتاً زیادہ تفصیل سے کام لیا۔ لیکن کلام کو پرکھنے کی کسوٹی وہی رکھی یعنی الفاظ و معانی کی درستی اور زبان و بیان اور طرزِ ادا کو ہی بنیاد مانا ہے بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:

"حسرت کی تنقیدی رائیں بڑی جچی تلی ہوتی ہیں۔ اس بات کی وضاحت کے بعد کہ شاعر کو کس صنفِ سخن پر قدرت حاصل ہے، وہ شاعر کی ان خصوصیات کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں جو اسے دوسرے شعراء سے ممیز کرتی ہیں یہ صحیح ہے کہ ان کی نظر زبان و بیان کی خصوصیات پر زیادہ پڑتی ہے، مگر وہ معنوی خصوصیات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ الفاظ کے حسن و قبح سے گزر کر ان کی نظر معنوی خوبیوں اور خامیوں تک بھی جاتی ہے۔" [۱]

شعرائے متقدمین کی جو خصوصیت حسرت کو سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہے اصلاحِ زبان کے سلسلہ میں ان کی کوششیں۔ چنانچہ ان شعراء کے کلام میں حسرت نے ان ہی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً شاہ ظہور حاتم کے دیوان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"قدیم و قبیح الفاظ کو ترک کرنے کی ابتدا بھی شاہ حاتم ہی نے کی تھی، چنانچہ دیباچہ دیوان زادہ میں ان کی ایک مفصل فہرست موجود ہے۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرۂ جلوۂ خضر میں اعتراض کیا ہے کہ حاتم نے اپنے متروکات پر عمل نہیں کیا۔ بے شک بعض مواقع پر نہیں کیا۔ لیکن شاہ حاتم کے دعوے اصلاح کی ہم کو اس قدر سختی کے ساتھ تنقید جائز نہیں ہے۔ اس زمانہ کو خیال کرو کہ اردو شاعری کی ابتدا تھی، کوئی حد مقرر نہ تھی، نہ کوئی قاعدہ معین تھا اور ہوتا بھی تو اس کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کون کرتا، پس انصاف کی بات یہ ہے کہ اس عہد میں اصلاحِ زبان کی جانب شاہ حاتم کی اتنی توجہ بھی دلدادگان سخن کی جانب سے ہزار در سپاس گزاریوں کی مستحق ہے۔ ہمارے نزدیک اس باب میں ان کا میلانِ خاطر ہی ان کے فضل تقدم کے لیے کافی ہوتا، لیکن یہاں تو حقیقت حال ان کی عملی کوششوں کا بھی ثبوت دیتی ہے۔" [۲]

[۱] مقدمہ تذکرۂ شعرا۔ ص ۳۶

اسی طرح مرزا محمد رفیع سودا کی اصلاحِ زبان کی کوششوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"زبان کے پاک و صاف کرنے کی ابتدا شاہ حاتم نے کی تھی۔ مرزا نے اس کو تکمیل کو پہنچایا۔

انھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے جیسا علمِ کیمیا کا ماہر ایک مادے کو دوسرے مادے میں جذب کر دیتا ہے۔"[۵]

حسرت کے یہاں تقابلی تنقید کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہاں بھی حسرت نے مروجہ تذکروں کی پیروی کی ہے۔ اردو شعراء کے تذکروں میں تقابلی تنقید کی خصوصیت نمایاں ہے، ان میں اردو شاعروں کا مقابلہ فارسی اساتذہ سے کیا جاتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں ایک عام تصور یہ تھا کہ اردو شعراء عموماً فارسی شعرا کا اتباع کرتے ہیں اور ان ہی کی قائم کی ہوئی روایات کی پیروی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس عہد تک شعرائے اردو کے کلام کو پرکھنے کی کسوٹی یہی تھی کہ ان کے کلام کے ڈانڈے فارسی شعراء کے کلام سے ملا دیے جائیں اور یہ ظاہر کر دیا جائے کہ اردو کا کونسا شاعر فارسی کے کونسے شاعر سے متاثر ہوا۔ اس قسم کے تقابلی مطالعہ کی بہترین مثالیں میر تقی میر، میر حسن اور شیفتہ کے تذکروں میں ملتی ہیں۔ ان میں بھی میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ بعد میں اس قسم کے تقابلی مطالعے کے سب سے بڑے علمبردار ہمیں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کا انداز ان تذکروں سے قدرے مختلف ہے، وہ مشرقی ادبیات کا مقابلہ مغربی ادبیات سے کرتے ہیں اور اولی الذکر کو موخر الذکر پر فوقیت دیتے ہیں۔ محاسنِ کلامِ غالب، ان کی ایک یادگار تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے محبوب شاعر مرزا غالب کے شاعرانہ اعجاز کو اجاگر کیا ہے اور غالب کا مقابلہ گوئٹے GOETHE، ہائن رش ہائنے (HFINSICH HEINE)، ورڈز ورتھ (WORDSWORTH)، شیکسپیر (SHAKESPEARE)، الفریڈ مامبرٹ (ALFRED MOMBERT) اور ملارمے (MALLARME)

۴؎ مقدمہ تذکرہ شعرا ص ۳۶

۵؎ اردوئے معلیٰ، جلد ۱، شمارہ ۶، نومبر ۱۹۰۳ء، ص ۱

غیرہ جیسے مغربی شاعروں اور فن کاروں سے کیا ہے اور سب پر مرزا غالب کو فوقیت دی ہے
مرز در اصل اس عمل تھا اس نا ز فکر کا جس میں مشرقیت کو ہر لحاظ سے مغربیت سے کم تر سمجھا
تا تھا۔ اور لارڈ میکالے کا یہ قول حرف آخر سمجھا جاتا تھا کہ انگریزی ادب کی ایک الماری ایشیا
ہ سارے ادب پر بھاری ہے۔

حسرت نے تقابلی مطالعہ میں اُردو کے ہی شعرا کا باہمی مقابلہ و موازنہ کیا ہے اور
شر مقامات پر دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی امتیازی خصوصیات کا بھی تقابل کیا ہے مثلاً
مومن کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اُردو زبان کی شاعری کا سلسلہ چونکہ فارسی مذاق سے ملا ہوا ہے اس لئے اکثر شعرائے متقدمین کا یہ معمول تھا کہ دیوان ریختہ کے ساتھ فارسی دیوان بھی ضرور رکھتے تھے چنانچہ شعرائے لکھنؤ میں مصحفی و حسرت سے لے کر عشقی تک یہ رواج قدیم قایم رہا۔ لیکن ناسخ و آتش کے زمانے میں اور اس کے بعد بہت کم اُستادوں نے اس رسم کی پابندی کا خیال کیا۔ البتہ آخر میں منشی امیر احمد مرحوم نے اس کو ایک بار پھر کچھ دنوں کے لیے زندہ کر دکھایا تھا لیکن اس رفاقت الموت کا کچھ اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ لکھنؤ نے یا تو اس وجہ سے کہ ان کو فارسی زبان سے زیادہ مناسبت نہ تھی یا اس بنا پر کہ اُردو زبان کے عروج کے مقابلے میں فارسی کی قدر کم ہو گئی تھی بہت جلد اس روش فارسی گوئی کو ناسخ و آتش ہی کے عہد سے ترک کر دیا تھا۔

برخلاف ان کے اہلِ دہلی آخر وقت تک اپنی وضع قدیم کو نباہتے رہے چنانچہ میر و مرزا سے لے کر غالب و مومن تک بلکہ شیفتہ شاگرد مومن تک قریب قریب ہر اُستاد نے اُردو گوئی کے ساتھ فارسی گوئی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور اصل یہی ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں ناسخ کے وقت سے تصنع اور بے لطفی کا جو عیب پیدا ہو گیا تھا، جس نے بلا مبالغہ لکھنؤ شاعری کو بالکل بے رنگ دو کر دیا، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہوا کہ لوگوں کی طبیعتیں فارسی زبان سے

نا آشنا ہوتی گئیں حتیٰ کہ لکھنؤ کی شاعری تھی تو کیوں نیز تازہ اور شگفتہ مضامین سے بیگانہ ہوتی گئی اور درد و اثر سے بالکل عاری ہو گئی" [۱]

مومن کے کلام میں زبان و محاورہ کے نقائص سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ جس طرح اہلِ لکھنؤ نے صحتِ لفظی کے مقابلے میں لطفِ مضمون کا خیال کم کیا، اسی طرح اہلِ دہلی نے عموماً اور مومن خاں نے خصوصاً بمقابلہ مضمون صحتِ زبان کی جانب بہت کم توجہ کی۔ چنانچہ غالب، مجروح، شیفتہ و سالک تک کے دیوان البتہ اگر غور سے دیکھئے تو ان کا کلام بھی ان غلطیوں سے پاک نہ ملے گا" [۲]

اسی طرح منشی امیر اللہ تسلیم کی غزلیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"شاہی زمانے میں شعرائے لکھنؤ کے طبائع پر ناسخ اور پیروانِ ناسخ کا رنگ اس قدر چھایا ہوا تھا کہ اس کے مقابلے میں نسیم کے دہلوی طرز کا بھی کم از کم ایک محدود طبقے میں مقبول ہو جانا سراسر حیرت انگیز نظر آتا ہے مگر واقعہ یہی ہے کہ عبداللہ خاں مہر، امیر اللہ تسلیم، اشرف علی اشرف وغیرہ کی شاعری نے جو تسلیم کے ورودِ لکھنؤ تک خالص لکھنؤ کی شاعری تھی نسیم کے زیرِ اثر وہ کیفیت پیدا کی کہ دہلی کا خاص رنگ بھی اس کے آگے ماند پڑ گیا، چنانچہ تسلیم کی ان غزلوں کو دیکھ کر جن میں نسیم کا رنگ غالب ہے کوئی انھیں لکھنوی شاعر نہیں کہہ سکتا" [۳]

نسیم دہلوی دبستانِ دہلی سے تعلق رکھتے تھے اور حکیم مومن خاں کے ارشد تلامذہ میں بقول حسرت "مومن کے سب سے بہتر شاگرد تھے"۔ اس نسبت سے ان کے کلام میں

۱۔ اردوئے معلیٰ - جلد ۵، شمارہ ۵ (مئی ۱۹۰۵ء) ص ۲-۴

۲۔ " " " "

۳۔ " " " شمارہ ۹ دسمبر ۱۹۱۱ء) ص ۴

ہلویت کی چھاپ ہونا ایک قدرتی امر تھا، اس لیے ان کا شمار دبستانِ دہلی میں کیا جاتا تھا لیکن آخر عمر میں انھیں لکھنؤ ہجرت کرنی پڑی۔ یہاں بھی اپنے کمالِ فن کا لوہا منوایا۔ ایسے خوش نصیب شعرا اردو میں بہت کم ہیں جن کے کمال کا لکھنؤ اور دہلی دونوں میں اعتراف کیا گیا ہو اور ان کی استادی تسلیم کی گئی ہو۔ نسیم ان معدودے چند لوگوں میں ہیں جنھیں پرقدر و منزلت نصیب ہوئی۔ حسرت ان کے اس اعجاز کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مرزا نسیم کے کمالِ شاعری اور استادی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ دہلوی اور اپنے خاص رنگ پر قائم رہنے کے باوجود لکھنؤ میں اور اس عہد میں جہاں آتش و ناسخ کے دعویٔ استادی کے سامنے خود وہیں کے اساتذہ نے سپر ڈال دی تھی، اس یگانۂ عہد نے اپنے شاگردوں اور مداحوں کا ایک معقول گروہ پیدا کر لیا جن میں عبداللہ خاں مہر، اشرف علی اشرف اور منشی امیراللہ تسلیم کا نام شاعری میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔" لہ

نسیم کی شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت انھیں یہی نظر آتی ہے کہ انھوں نے زبان کو دہلی کا پیرایۂ بیان عطا کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"دلفریبیٔ خیال اور رنگینیٔ بیان شاعری کے دو خاص جوہر، جو نسیم کو مومن سے بحیثیت میراثِ استاد حاصل ہوئے تھے، جن کو انھوں نے باضافۂ زبان خوب سے خوب تر بنا کر دنیائے شاعری میں اس آن بان کے ساتھ پیش کیا کہ لکھنؤ کے لفظ پرستوں نے بھی داد دی اور اظہارِ پسندیدگی سے باز نہ رہ سکے۔ لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جو نظر آتا ہے۔ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی اور یہی سبب ہے کہ ہم نسیم کی منتخب غزلوں کو اردو شاعری کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں۔" کہ

لہ اردوئے معلیٰ۔ جلد ۸ شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۰۷ء) ص ۲

کہ " " " " " " " " "

حسرت کا یہ تقابلی مطالعہ محض دبستانوں تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ انھوں نے جگہ جگہ ایک شاعر کا دوسرے شاعروں سے بھی مقابلہ کیا ہے۔ دراصل وہ جس شاعر کی جس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہیں، اس کی مزید وضاحت کے لیے اس کا دوسرے شعراء کی اسی خصوصیت سے مقابلہ بھی کرتے چلتے ہیں۔ یہاں ان کا مقصد کسی شاعر کی تحقیر نہیں ہوتا، بلکہ محض اپنی بات کو واضح کرنا ہوتا ہے۔ اس قسم کی تقابلی تنقید کی بہترین مثال مصحفی کے سلسلہ میں ملتی ہے۔ لکھتے ہیں:

مصحفی ہمہ گیر و ہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ سخن پر قناعت نہ کرکے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے تقریباً ہر ایک کے انداز سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے، چناں چہ ان کی غزلوں میں کہیں میر کا درد ہے تو کہیں سودا کا دبدبہ، کسی مقام پر فغاں کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی، کہیں واقعات میں جرأت کی سلاست و حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہیں ترکیب الفاظ اور انداز بیان میں انشاء کا طنطنہ و جبروت صرف ہوا ہے۔ کہیں پر غزلوں کو قطعات مسلسل پر ختم کرنے میں جعفر علی حسرت کا رنگ کلام پیش ہوتا ہے تو کہیں مشکل ردیف قافیوں کو بخوبی و صفائی سے نباہنے میں شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور پھر ان سب کے علاوہ جن غزلوں اور بیتوں میں ان تمام اساتذہ کی خوبیوں کو ان کی کہنہ مشقی اور استادی یکجا کر دیتی ہے۔ ان کا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مصحفی کی زبان اگرچہ میر و سودا کی قدیم زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے، لیکن اس درجہ شیریں اور سبک واقع ہوئی ہے کہ اکثر اس کی حلاوت اس زمانے میں بھی ناظرین کے دلوں میں اس کے متروک الاستعمال ہونے کا گمان نہ پیدا ہونے دے گی۔[۱]

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مصحفی کے کلام سے ہر رنگ ہر رنگ کے اشعار پیش کیے ہیں، اور ان کا موازنہ مختلف اساتذہ سے کیا ہے، اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:۔

۱؎ اردوئے معلی جلد ۶ شمارہ ۶ (جون ۱۹۰۶ء) ص ۸

"ان غزلوں کے دیکھنے سے ثابت ہوگا کہ میر تقی میر کے رنگ میں مصحفی میر حسن کے ہم پلہ، سودا کے انداز میں انشا کے ہم پایہ اور جعفر علی حسرت کے رنگ میں جرأت کے ہم نوا ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی اپنے ان سب ہم عصروں سے باعتبار کمال سخندانی و مشاقی برتر ہیں اور یہی سبب ہے کہ راقم کی نگاہ میں میر و مرزا کے بعد اور کوئی اُستاد ان کے مقابلہ میں نہیں جچتا۔ معلوم نہیں کہ صاحب آبِ حیات نے کس بنا پر سید انشا کو مصحفی پر ترجیح دینے کی جا بجا کوشش کی ہے۔ سید انشاء کی قابلیت اور طباعی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے، لیکن دربار لکھنؤ کی مجبوریوں نے ان کی ظرافت کو دائرہ اعتدال سے خارج کر کے ان کے کلام کو بقول شیفتہ ساقط الاعتبار بنا دیا تھا۔ چناں چہ نظر بحالت موجودہ انھیں مصحفی کے مقابل لانا مصحفی کے کمال کی توہین کرنا ہے اور بس" [1]

حسرت نے مرزا غالب کے کلام سے بھی تفصیلی بحث کی ہے اور اس پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے، نیز ان خصوصیات پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے جنھوں نے انھیں یگانۂ روزگار اور عدیم المثال شاعر بنایا۔ یہاں بھی انھوں نے تقابلی تنقید کے جوہر دکھائے ہیں۔ چناں چہ غالب کے زبان و بیان کی سحر انگیزی اور کلام کی معنی آفرینی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہاں تک مرزا کے الفاظ، ترکیب اور بندش کی خوبیوں پر بحث کر کے جب ہم ان کے کلام پر بحیثیت مضمون و معنی نظر ڈالتے ہیں تو اس شان میں بھی اسے یکتا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یعنی اس لیے کہ جذبات انسانی کی جیسی سچی تصویر مرزا نے بصورت اشعار پیش کی ہے، اس کا جواب میر کے بعد کسی دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل سے دستیاب ہو سکے گا" [2]

خیالات کی بلندی، مذاق کی پاکیزگی اور مبتذل الفاظ و مضامین سے اجتناب مرزا غالب

---

[1] اردوئے معلیٰ جلد ۶ شمارہ ۶ (جون ۱۹۰۶ء) ص ۵

[2] " " " " " " ص ۶

سے مختص ہیں۔ ان ہی کی بنا پر غالبؔ اپنے تمام معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ حسرتؔ ان کی اس خصوصیت کے تہہ دل سے معترف ہیں۔ اس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"عامیانہ مذاق اور تبذل بازاری الفاظ، نیز فحش اور ہجو سے مرزا کا کلام بالکل پاک ہے، مرزا کی شاعری عاشقانہ ضرور ہے لیکن انھوں نے عشق کے معنی بوالہوسی کے نہیں لیے ہیں اور اس لیے ان کے خیالات میں دناءت اور پستی کے بجائے متانت اور شائستگی کی ایسی شان پائی جاتی ہے جس کی مثال شعرائے لکھنؤ کے کلام میں نایاب ہے، اور متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں کمیاب ہیں"۔[1]

غالبؔ کا موازنہ ان کے اہم ترین معاصرین ذوقؔ اور مومنؔ جیسے اساتذہ کرتے ہوئے حسرتؔ کہتے ہیں :۔

"زبان کے معاملے میں غالبؔ کے دہلوی ہم عصروں میں سے اُستاد ذوقؔ سب سے زیادہ محتاط ہیں اور اسی لحاظ سے ہمارے نزدیک اگرچہ بحیثیتِ مجموعی غالبؔ۔ ذوقؔ و مومنؔ سے افضل ہیں، لیکن صرف اُردو شاعری کے لحاظ سے ذوقؔ کا درجہ غالبؔ سے، اور غالبؔ کا مرتبہ مومنؔ سے بلند ہے"۔[2]

حسرتؔ محض مدح سرائی کے قائل نہیں، اسی لیے وہ اپنی تنقید کو جانبداری اور خالص قصیدہ خوانی کے عیوب سے پاک رکھنے کے لیے تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کرتے ہیں۔ اکثر شعرا کے کلام میں زبان و بیان اور الفاظ و محاورہ کے نقائص کی گرفت بھی کی ہے۔ یہاں وہ کسی سے مرعوب نظر نہیں آتے۔ بڑے سے بڑا استاد فن بھی ان کی گرفت سے بچ نہیں سکا ہے۔ حتیٰ کہ غالبؔ اور مومنؔ بھی نہ بچ سکے۔ حالاں کہ حسرتؔ خود مومنؔ کے سلسلۂ تلامذہ سے تعلق رکھتے ہیں اور تسلیمؔ و نسیمؔ کے وسیلے سے ان کا سلسلہ مومنؔ تک پہنچتا ہے۔ لیکن حسرتؔ کی انصاف

---

[1] اردوئے معلیٰ - جلد ۲ شمارہ ۶ (جون ۱۹۰۶ء)

[2] " " " "

پسندِ طبیعت انھیں بھی نہیں بخشتی، انھوں نے سب سے زیادہ گرفت مومن کی ہی کی ہے۔ ان کے نقایص کو تفصیل سے گنایا ہے اور ان پر بالتفصیل بحث کی ہے۔ انھوں نے مومن کے ایسے متعدد اشعار پیش کیے ہیں جن میں ایسے نقایص موجود ہیں جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں اور مومن جیسے اُستادِ فن کے لیے کسی طرح بھی، روا نہیں ہو سکتے۔ ان عیوب کی موجودگی میں حسرت یہ کہنے پر مجبور ہوئے ؛ ۔

"حکیم مومن خاں مرحوم کے اُردو کلام میں جتنی غلطیاں ہیں اتنی شاید ان کے برابر والے ہم عصروں میں سے کسی کے دیوان میں نہ ملیں گی اور غالباً اسی خیال سے حضرتِ آزاد صاحبِ تذکرۂ آبِ حیات نے ذوق و غالب کے ساتھ ان کا حال درج نہ کیا ہوگا۔

اگر اتنی غلطیاں لکھنؤ کے کسی شاعر سے سرزد ہوتیں تو اس کی نسبت کوئی اُستادی کا گمان بھی نہ کرتا لیکن مومن خاں کی اُستادی کو جس چیز نے قایم رکھا وہ ان کی فارسی زبان کے ساتھ طبعی مناسبت تھی جس کے زور پر انھوں نے ایسی غزلیں بھی لکھ دی ہیں جن کو دیکھ کر پڑھنے والا ان کی لغزشوں کو فراموش کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے"۔ [۱]

لیکن اس کے ساتھ وہ مومن کی طرف سے صفائی بھی پیش کرنے لگتے ہیں ؛ ۔

"جہاں تک ہمارا خیال ہے، کلام مومن میں یہ سب نقص بر بنائے بے پروائی پائے جاتے ہیں، نہ بہ سبب ناواقفیت"۔ [۲]

حسرت مرزا غالب کے شاعرانہ اعجاز کے قایل ہیں۔ مجموعی طور پر وہ غالب کو اُردو کے دوسرے شعراء پر فوقیت دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود غالب کے کلام میں نقایص سے صرفِ نظر نہیں کرتے، بلکہ ایسے چند اشعار پیش کرکے جن میں ابتذالِ مضمون یا الفاظ دھم

---

۱ اردوئے معلیٰ ۔ جلد ۵ شمارہ ۸ (مئی ۱۹۰۵ء) ص ۳

۲ 〃 〃 〃 〃 ص ۲

یا الفاظ و محاورے کی عدم فصاحت کا سقم پایا جاتا ہے، ان پر تفصیلی محاکمہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں :۔

"ہم نے مرزا کی شاعری کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے لکھا ہے، ورنہ از قبیل شاذ ان کے دیوان میں ایسے اشعار اور الفاظ بھی موجود ہیں جن پر مذاق صحیح اور زبان صحیح دونوں کی جانب سے اعتراض وارد ہو سکتے ہیں۔" [۱]

اس کے بعد انھوں نے مرزا کے ایسے ۱۲ اشعار نقل کیے ہیں جو فصاحت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، اور ہر ایک شعر کی خامی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور آخر میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے :۔

"مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی نے اپنی شرح دیوان غالب میں مرزا کی اس قسم کی بہت سی غلطیاں دکھائی ہیں، جن کا کچھ جواب نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک صحت زبان و محاورے کی جانب سے بے پروائی مرزا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ شعرائے دہلی عموماً خوبی مضمون کے مقابلے میں درستی الفاظ کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔" [۲]

حسرت کی تنقید نگاری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی بھی جانب داری یا بے جا خاطر داری سے کام نہیں لیتے، ان کو جس شاعر کے کلام میں جو خوبی نظر آتی ہے اس کو بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں، اور جو خامی محسوس ہوتی ہے، اس کا اظہار بھی برملا کر دیتے ہیں، وہ نہ کسی کے فریق بنتے ہیں اور نہ ہی خواہ مخواہ عیب بینی کی تنگ و تاریک راہوں میں بھٹکتے ہیں۔ وہ میانہ روی کے قایل ہیں، اسی لیے ان کے خیالات میں نہ شدت ہوتی ہے، اور نہ انتہا پسندی۔ وہ دودھ کا دودھ اور پانی الگ کرتے ہوئے چلتے ہیں اور شاید ایک حقیقی تنقید نگار کا منصب بھی یہی ہے۔ ●●

(حوالہ دیکھیے بقیہ ۲۸۸ پر)

---

[۱] اردوئے معلی۔ جلد ۲، شمارہ ۴ (اکتوبر ۱۹۰۵ء) ص ۳
[۲] " " " " " " "

تابہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب   ضبط کی رگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے
دولتِ ہندوستان قبضۂ اغیار میں
بے عدد، بے حساب دیکھیے کب تک رہے

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبر میں ہے
قلبِ افواجِ ترکی پر نہ ہو اشلی دلیر
ایک ہے سو کے لیے کافی، جو اس لشکر میں ہے

نہ سرمایہ داری کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جور بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں
کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا

ہو جنہیں شوقِ شہادت انھیں کیا خوف بھلا
قید کا مرحلۂ نرم اگر ہے درپیش

یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے ہوائے حرص
چلنے لگے زمانے جہاں میں ہوائے حرص
ہے چین کو دبا کے مٹانے پہ مستعد
جاپان بھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص

(صفحہ ۲۶۱ سے آگے)

دل نہ توڑو حسرتِ ناکام کا
زلف تو پھر بھی بنائی جائے گی

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

مٹ گئے ہم تو مٹ گئے سب رنج
یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا

تم جفا کار تھے کرم نہ کیا
میں وفادار تھا خفا نہ ہوا

خود بخود بوئے یار پھیل گئی
کوئی منتِ کشِ صبا نہ ہوا

کس قدر دشوار تھی ہم پر جدائی آپ کی
بارے پھر اللہ نے صورت دکھائی آپ کی

بدگماں کاہے کو ہوتا آپ کا حسنِ غیور
ہم نے کیوں تصویر آنکھوں سے لگائی آپ کی

بھول بیٹھے تھے الٰہی کیا کریں اس دل کو ہم
ہجر میں پھر یاد جس نے دلائی آپ کی

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں

رشک آتا ہے مجھے نور جو ہوتا ہے نثار
بام پر آپ شبِ ماہ میں سویا نہ کریں

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں
سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں

دیکھئے شوقِ شہادت میں جھکی ہے گردن
آپ اس وقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں

دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کا زنہار ارادہ نہ کریں

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آج کل
کیفیتِ بہار کی شدت چمن میں تھی

حسرت موہانی کے مندرجہ بالا یہ چند شعر جو بغیر کسی ترتیب کے درج کئے گئے ہیں، ایسے ہیں جن کی طرف طبیعت خود بخود راغب ہوتی ہے۔ میر کے بعد اردو غزل کی ہیئت میں جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کی وجہ حسرت کا شکری انداز اور لب و لہجہ ہے۔ جو دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو کر جدید غزل کی شکل میں رونما ہوا۔ ان اشعار کے مطالعے سے ان کے جدید جذبات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح انھوں نے صنف غزل کو نئی زندگی دی۔ ان کے یہاں عشق و محبت کے جذبے سے سرشاری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ کلام میں سادگی اور بے باکی بہت پائی جاتی ہے۔ ایمان کی پختگی کا جو تصور ہمیں حسرت کے یہاں ملتا ہے، وہ دوسرے شاعروں کے یہاں کم نظر آتا ہے۔ یہاں مجھے نہ مولانا حسرت کی شاعری پر تبصرہ کرنا ہے اور نہ ان کی سیاسی زندگی پر سیر حاصل بحث کرنی ہے۔ وہ ایسی قد آور شخصیت کے مالک تھے جس نے اردوئے معلّٰی کے ذریعہ عوام کے دکھے ہوئے دلوں کی فریاد رسی، اور ان کو دوسرے دل تک پہنچایا اور قدیم ادب کو دریافت کر کے اس کو اردو دنیا سے روشناس کرایا۔

(بقیہ صفحہ ۲۸۵ سے آگے)

حوالے:۔

(۱) اردو (سہ ماہی) اورنگ آباد جلد ۲۵ شمارہ ۲۳ جولائی ۱۹۳۵ء

(۲) اردوئے معلّٰی علی گڑھ و کان پور۔ (مختلف شمارے)

(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین مقدمہ شعر و شاعری نئی دہلی مکتبہ جامعہ ۱۹۶۹ء

(۴) عبادت بریلوی اردو تنقید کا ارتقاء دہلی چمن بک ڈپو

(۵) عبدالرحمٰن بجنوری محاسن کلام غالب چھٹا ایڈیشن ۔ علی گڑھ (انجمن ترقی اردو ہند) ۱۹۶۶ء

(۶) کلیم الدین احمد اردو تنقید پر ایک نظر لکھنؤ ادارہ فروغ اردو ۱۹۶۵ء

علی احمد فاطمی

حسرت موہانی
رومانی ذہن کی سیاسی شخصیت

۱۸۵۷ء کے حادثہ نے لکھنؤ اور نواحِ لکھنؤ کے پیراہن کو جس طرح سے تار تار کر دیا تھا، اس سے اہلِ علم اچھی طرح واقف ہیں، لیکن یہاں اہلِ لکھنؤ کو ان کوتاہیوں کے جھیلنے بھگتنے پڑے، نکتہ چینیوں اور باریک بینیوں نے اس بات کو بہرحال محسوس کیا ہے، کہ ان تمام حسرت زدہ اور رخسار آلودہ افعال و اعمال منجمد سوچ، سیک اندازِ فکر کی امتزاجی صورتوں سے ایک ایسی تہذیب جنم لے چکی تھی جس نے لاشعوری طور پر قوم کا مزاج یا کم از کم اس خطے کا مزاج بدل دیا۔

جب لکھنؤ لٹا تو آناً فاناً جو اودھ کا ایک اٹوٹ انگ تھا وہ بھی لٹا، اس کے تہذیبی قصبات (دریاباد، صفی پور، میاں گنج وغیرہ) بھی لٹے۔ لیکن ان تمام تاریخی لوٹ کھسوٹ کے پس پردہ وہ تہذیب جو ان خوابیدہ صورتوں کی کوکھ سے جنم لے چکی تھی رفتہ رفتہ ان خطوں کے ماحول اور ان کی مٹی کی آتما میں جذب ہو گئی — اور اس طرح تخریب کے اس پردہ میں رفتہ رفتہ تعمیر اور تہذیب کا ایک نیا پھول کھل گیا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو تقریباً پچیس برس بعد (۱۸۸۱ء) موہان جیسے قصبے میں فضل الحسن ضرور پیدا ہوتے، لیکن حسرت موہانی نہ پیدا ہو پاتے۔ فضل الحسن کو حسرت موہانی موہان کے اس تہذیبی ماحول نے بنایا، جس کے ڈانڈے مرکزِ لکھنؤ کے اس نازک خوشگوار احساس سے جا ٹکراتے ہیں جس نے باقاعدہ ایک اسکول کی حیثیت اختیار کی۔ کانپور، اور لکھنؤ کے درمیان سئی ندی اور اس پر چھوٹی چھوٹی برجیوں سے

آراستہ ہیں (جو بقول رابعہ بیگم کے موہان کی دل کشی کا واحد ذریعہ تھا) اور اسی کے نزدیک قدیم وضع قطع کے تعمیر شدہ مکانات کی ایک چھوٹی سی بستی موھان — اور انھیں مکانوں میں قدرے ایک بڑا مکان، جسے بارہ دری کہتے تھے، اسی بارہ دری میں حسرت نے زندگی کی آنکھیں کھولیں، اور اپنے بھائی بہن، دوست احباب کے ساتھ بچپن کے رنگین دن گزارے۔ بقول رابعہ بیگم ؎

"اس بارہ دری میں اپنی ماں بہنوں اور دوسرے عزیز و اقارب کے درمیان اس کے بچپن کا زمانہ گزرا، اور یہیں سے اس کی ابتدائی شاعری کے نغمے، گاؤں کے باہر بہتی ندی کی موجوں کے ساتھ ڈوبتے ابھرتے اس کے ساتھیوں نے اور دوستوں نے سنے اور سنائے۔ یہیں سے اس نے شدید وحشت کے بندھن کو محسوس کیا، اور یہیں سے اس نے محبت کے رنگین خواب دیکھے۔" ۱؎

حسرت کے والد سید فتح پور کے رہنے والے تھے، جہاں وہ اپنی جائداد کی دیکھ بھال کرتے تھے، لیکن حسرت اپنی نانی کے یہاں، ماں اور بہن کے ساتھ موہان ہی میں رہتے تھے۔

موہان کے ننھیالی عزیز و اقارب کے درمیان بچپنا گزرا — بھولا بھالا، سادہ سا بچپنا اس پر اور سادہ اردگرد کا ماحول، نمود و نمائش آرائش و زیبائش سے بے نیاز۔ موہان کی فضا — نیم مذہبی اور نیم زاہدانہ شوخی میں ڈوبا ہوا، یہ ماحول حسرت کو کچھ ایسا بھایا کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ان کے قلب و جگر میں اتر گیا۔ حسرت کی بہن کے ذریعہ گھر کے ماحول کی ایک جھلک دیکھیے: —

"نماز کے بعد سب لوگ دالان میں تختوں پر جمع ہو جاتے، والدہ صاحبہ آجاتیں اور دسترخوان بچھتا۔ والدہ صاحبہ کو چینی کے پیالوں میں دودھ اس میں رات کی ... چپاتی اور شکر ڈال کر دیتی جاتیں اور ہم لوگوں کو یہ ناشتہ بہت ہی اچھا لگتا۔" ۲؎

۱؎ حسرت کی خانگی زندگی — اردو ادب اکتوبر ۵۱ء نمبر ص ۹۲

۲؎ ″ ″ ″ ″ ″ ″

ان جملوں کی آڑ میں پرورش پائی ہوئی ذہن کی سادگی، اور ماحول کی شائستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے میں ایک طرف پتنگ بازی کا شوق بھی ہے اور دوسری طرف بھائی بہنوں کے ساتھ نانی یا والدہ سے روزانہ کہانی سننے کی عادت، مزار پر سے شیرینی کا دونہ بھی چرایا جا رہا ہے تو ساتھ ہی ندی کے کنارے نوجوان دوستوں کے ساتھ شعر و شاعری کا شغل بھی جاری ہے۔ گھر پہنچے تو نانی اور ماں نے گھیرا۔ وہ نانی اور ماں جو اردو اور فارسی میں غیر معمولی استعداد رکھتی تھیں اور بلا کا شعری ذوق بھی۔ ان سب کی ایک ایک بوند حسرت کے ذہن میں جذب ہوتی رہی، اور ذہن کی زرخیزی سے اُس وجدانی جذبے کا شتکار ہوتا رہا جہاں سے رومانیت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور یہی وجہ ہے ابھی موہان کے اسکول میں داخلہ لیا تھا کہ شاعری کا شوق اُمڈ پڑا۔ نانی نے شاعری کا شوق دیکھا تو نسیم دہلوی کا دیوان پکڑا دیا۔ بس حسرت اسی میں ڈوب گئے اور جب بکھرے تو استاد کے دواوین چاروں طرف بکھرے پڑے تھے اور وہ اس میں نکھرتے چلے گئے۔

موہان کی ابتدائی تعلیم ختم ہوئی تو حسرت والد کے پاس فتح پور چلے گئے۔ وہاں انھوں نے نیاز فتح پوری کے والد سے حصول علم کے ساتھ ساتھ پنڈت لچھمی نرائن کا ساتھ پکڑا، جنھوں نے ان کے شاعرانہ ذوق کو دیکھ کر ان کی فطری صلاحیتوں کو اُبھارنے میں خاصی مدد کی ساتھ ہی سید ہاشم جیسے دوست ملے جن کے بارے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:۔

"اُن کو اپنے فتح پوری احباب میں سید ہاشم سے خصوصیت کے ساتھ بڑا شغف تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ حسرت کی شاعری کے موضوع تھے۔ چنانچہ حسرت نے اپنے اشعار میں متعدد جگہ ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔" [1]

حسرت نے فتح پور میں ایک کلب قائم کیا جو اپنی رنگین صحبتوں اور مشغلوں کے لیے بڑی شہرت رکھتا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ ان تمام مشغلوں میں دلچسپ ترین مشغلہ شعر و سخن کا تھا۔

اس طرح سے اگر ہم حسرت کی ابتدائی زندگی کا تجزیہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ حسرت کی زندگی کی ابتدا انتہائی عاشقانہ اور شاعرانہ انداز میں ہوئی۔ عشق و محبت کی یہ داستانیں محض خیالی نہ تھیں۔

۱۔ تذکرہ حسرت۔ حسرت نمبر نگار ص

بلکہ ان کے پیچھے گوشت پوست کی کچھ ایسی مادی حقیقتیں بھی تھیں جو زیرِ لب موہان کی تفریح کا ذریعہ بنی ہوئی تھیں۔ رابعہ بیگم لکھتی ہیں :-

"ان کے عزیز عزیزان کے اس زمانے کے متعلق گفتگو کرتے وقت زیرِ لب مسکراتے ہیں کبھی اُڑتا اُڑتا کوئی نام سنائی دیتا ہے۔ کبھی ان ہیلیوں کا ذکر ہوتا جو بیجوں کو تیلا اور سُرخ رنگ کر بنائی گئی تھیں اور ہدیہ شوق کے طور پر پیش ہوتی تھیں، خود حسرت کے اس وقت کے کلام سے بھی اس وارفتگی کا کچھ نہ کچھ پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ کہا ہے ؎

موہان کے کوچے کیا، رسوائی کا مسکن تھے
جو شخص نظر آیا بدنام نظر آیا[1]

ابتدائی شاعری کے کچھ اور اشعار دیکھیے ؎

بام پہ آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا
پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی — اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا
کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا خاطرِ ناشاد کا — ان سے جب مجبور ہو کر میں جدا ہونے لگا

مضطر ہے بہت میری طبیعت کئی دن سے — دیکھی جو نہیں آپ کی صورت کئی دن سے

نگاہِ شوق کو شکوے بہت ہیں — تمہارے جلوۂ حیرت فزا کے

روبرو ان کے کچھ نہیں معلوم — کیا ہوا بے خودی میں کیا نہ ہوا

خبر کیا تھی ترے عزمِ سفر کی — روانی رک گئی اب چشمِ تر کی

۱۔ حسرت کی خانگی زندگی ۔ حسرت نمبر اردو ادب ۱۱۸ نمبر ص ۹۵

اس انجمن کے شوق میں جان کا زیاں سہی　　اک بار ان کو دیکھ تو لیں گے بلا سے ہم

حسرت کے ان ابتدائی اشعار سے پیار و محبت کی شوخی، تمناؤں کے اظہار کا سلیقہ اور زندگی کی حرارت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس داستانِ عشق میں ممکن ہے بظاہر خیالی لہریں کام کر رہی ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے پیچھے خیالی معشوق نہیں، بلکہ عشق کی داستان حقیقی زندہ اور متحرک ہے جس نے حسرت کو ایک ایسا شاعرانہ شعور عطا کر دیا جو ماضی کی تقریباً تمام آوازوں سے یک سر مختلف تھا۔ ان کی اس انفرادیت کے پیچھے ان کے اپنے جذبے کی شدت اور رومان کی حدت نظر آتی ہے جس میں عشق کی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ زمانہ کی نیرنگیاں بھی جلوہ گر ہیں۔ ان کے احساس میں سادگی کے ساتھ اٹوٹ وارفتگی کا جو جذبہ نظر آتا ہے اس نے حسرت کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ ان کی ابتدائی شاعری کو پڑھ جائیے زندگی کے سچے اور سادہ جذبات کی جو ترجمانی ہمیں ملتی ہے، وہ کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے حسرت کے دل و دماغ میں جو صفائی، پاکیزگی اور رومانیت عطا کی تھی، اسے اس طرح کے ماحول نے اور بھی شدید کر دیا۔

یہ سچ ہے کہ رومان صرف عشق و محبت کا نام نہیں، لیکن عشق و محبت کی زندہ داستانیں رومانی جذبے کو متحرک اور فعال ضرور بنا دیتی ہیں۔ رومان کے ارد گرد بعض بھی اشیا سمٹتی ہیں۔ حسرت اپنے بچپنے میں تمام طرح کے تجربات لے کر آئے تھے، اس پر خاص قسم کی تہذیب ملی، مطالعہ مشاہدہ کی گرمی ہاتھ آئی۔ لہذا زندگی کا ایک واضح اور نکھرا ہوا روپ سامنے آیا۔ دل کے اندر مچلتا ہوا رومان چھلک پڑا، اور رومان کی نفسیات یہ ہے کہ وہ اپنے تمام جذبوں کو انتہا پر پہنچا کر دم لیتا ہے۔ کم و بیش حسرت کے ساتھ بھی یہی ہوا ۔۔۔ مزاج کی سادگی، حق گوئی، کھرا پن اور باغیانہ جذبے نے ایک طرف سر اٹھایا، اور شعر و ادب کا عاشقانہ جذبہ و ذوق، دوسری جانب نقطۂ عروج پر پہنچا جس کی وجہ سے حسرت کی زندگی اور شاعری میں بظاہر ایک خلیج قائم ہو گئی۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوؤں کا نفسیاتی اور رومانوی نقطۂ نگاہ اور گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ان کی زیریں لہریں ایک ہی جذبہ کا شکار نظر آتی ہیں۔

انٹر پاس کرکے ڈاکٹر ضیاء الدین کی دعوت پر حسرت جب علی گڑھ پہنچے تو بیسویں صدی کی ا
ہو چکی تھی، اور علی گڑھ پر ہنوز انگریزیت کا دور دورہ تھا۔ ہارون خاں شیروانی لکھتے ہیں :۔

"علی گڑھ کی تاریخ میں اس زمانہ کو بدرجۂ اتم انگریزیت کا زمانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مذہبیت تو درکنار یہ خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کالج کا کوئی ایسا گریجویٹ بھی ہوگا جو روزمرّہ اپنے چہرہ پر استرہ نہ پھیرتا ہو۔" [1]

حسرت کو یہ سب پسند نہ آیا، وہ اپنی اسی قدیم وضع قطع کے ساتھ علی گڑھ کے اس ماحول میں
داخل ہوئے۔ لوگوں نے مذاق کئے، پھبتیاں کسیں۔ نجانے کیا کیا القاب سے نوازا، لیکن حسرت
مخصوص ذہنی و جمالی کیفیات پر اٹل رہے۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ میں ایک مشاعرہ ہوا جس کے مہتم
حسرت تھے۔ بڑے بڑے شاعروں نے شرکت کی۔ امیر مینائی کے مشہور شاگرد گستاخ رام پوری بھی
ان کا یہ مطلع خاص طور پر مقبول ہوا :۔

یہ مرض گستاخ کیسا تجھ کو پیدا ہو گیا
جس کی صورت اچھی دیکھی اُس پہ شیدا ہو گیا

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں :۔

"یہ زمانہ برطانوی قیصریت کے شباب کا زمانہ تھا۔ مسٹر ماریسن کالج کے پرنسپل تھے، اور نواب محسن الملک سکریٹری تھے۔ کالج کے ارباب حل و عقد پر سرکارِ برطانیہ کا رُعب چھایا ہوا تھا، اور کالج میں گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ پیٹھ پیچھے بُرائی کرنے والوں نے جن کو حسرت کی آزاد اور مستغنی طبیعت سے روزِ ازل سے ہی اختلاف تھا، ماریسن سے جاکر کہہ دیا کہ مشاعرے میں تہذیب سے گرے ہوئے، اور اخلاق بگاڑنے والے اشعار پڑھے گئے اور مثال کے طور پر گستاخ رام پوری کا وہ شعر پیش کر دیا۔" [2]

---

[1] حسرت موہانی۔ حسرت نمبر اردو ادب ۵۱ء ص ۸۰.

مارسین ان چکنی باتوں سے طیش میں آ گیا۔ حسرت کو اسی وقت بلا بھیجا اور سخت لہجے میں کہا:

"تمھارا مشاعرہ اخلاق سے گرا ہوا تھا۔"

حسرت نے پہلے اس سے اختلاف کیا۔ بعد میں بے باک ہو کر کہہ دیا:-

"ممکن ہے کہ آپ کے اخلاق سے ایسا نہ ہو۔ ہمارے اخلاق سے تو مشاعرے میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔"

اس جواب سے مارسین آگ بگولہ ہو گیا۔ ڈپٹ کر بولا! "کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا میں اخلاق و تہذیب کے دو معیار ہوں۔؟"

حسرت کو کالج سے نکال دیا گیا۔ بڑی مشکل سے نواب محسن الملک کی سفارش سے حسرت کو امتحان دینے کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس لیے کہ اس مختصر سے وقت میں حسرت نے اپنی قلندرانہ اور دلیرانہ شخصیت کی چھاپ اس انداز سے چھوڑی کہ وہ ایک ہی وقت میں یونین کے سکریٹری بھی تھے، فوڈ مانیٹر بھی اور انجمن اردوئے معلی کے معتمد بھی۔ لیکن مارسین کے خلاف انھوں نے ان سب عہدوں کو تج دیا۔ انصاف کی باغیانہ لہر نہایت سرعت سے ان کے دل و دماغ میں ارتعاش پیدا کر گئی۔ تیزی سے بدلتے ہوئے ذہن نے ایک جھٹکے سے فیصلہ لیا کہ اب میدان میں اترنے کا وقت آ گیا ہے۔ ابتدا سے حق گوئی، انصاف پسندی کا جو خمیر اٹھ رہا تھا اور روحانیت و جذباتیت کی جو کرنیں مچل رہی تھیں، اک دم سے تڑپ اٹھیں۔ بدلتے ہوئے حالات نے انھیں اور بھی ہوا دی، اور وہ باقاعدہ و باضابطہ حریت پسند طبیعت اور جذبۂ آزادی سے مغلوب ہو کر میدان سیاست میں کود پڑے۔

بی اے کرنے کے بعد بجائے کہیں ڈپٹی کلکٹری حاصل کرنے کے وہ علی گڑھ شہر میں آباد ہو گئے اور وہیں جولائی ۱۹۰۳ء میں "اردوئے معلی" کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا، جو بیک وقت ادبی اور سیاسی جریدے کی شکل میں سامنے آیا۔ اسی سال وہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے گئے۔ علی گڑھ کی اس پہلی لڑائی میں وہ کامیاب ہو چکے تھے، ان کا قلم اور ذہن آزاد اور بے باک ہو چلا تھا۔ "اردوئے معلی" کے ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:-

"ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سر سید اپنے زمانے میں قوم کے مسلم رہنما تھے

تھا۔ اور اس وقت مسلمانوں کے حق میں جو کچھ انھوں نے کیا بہتر کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ ہونے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکارِ انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی، تو بہت خوب کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تمام ملکی معاملات سے علیحدہ کر کے صرف اعلیٰ تعلیم کی طرف مائل کیا تو اور بھی خوب کیا ...... لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سرسیّد کے وقت میں تھی؟ سرکار انگریزی کو اب بھی کسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ننگ و عار کا موجب کون امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لیے خود کوشش نہ کریں، بلکہ دوسروں کی حمایت پر بھروسہ رکھیں اور اپنے جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی نفع کی امید کی وجہ سے باز رہیں۔"

رفتہ رفتہ حسرت اور اردوئے معلیٰ روشناس ہونے لگے اور قدردانوں میں اعتماد پیدا ہونے لگا۔ ۱۹۰۸ء کے ایک شمارے میں ایک مضمون کے خلاف مقدمہ چل گیا۔ حسرت نے اسے انتہائی جرأت کے ساتھ جھیلا، پھر بھی اپنے آپ کو بچا نہ سکے اور ۱۹۰۸ء میں دو سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔ ہارون خاں شروانی لکھتے ہیں :-

"اس زمانے میں سیاسی جمود کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ یہ تھا کہ حسرت کو اپنے بچاؤ کے لیے نہ کوئی وکیل مل سکا نہ بیرسٹر۔ چنانچہ دو تین پیشیوں کے بعد انھیں دو سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔"[1]

حسرت جس وقت علی گڑھ آئے، اس وقت علی گڑھ تحریک ہر چند کہ دم توڑ رہی تھی، لیکن کانگریس تحریک کی مخالفت میں پھر بھی اڑی رہتی۔ علی گڑھ میں پڑھنے والوں کی کیا مجال کہ یا ی

---

[1] آجکل حسرت نمبر اگست ۱۹۵۱ء ص ۱۹

طور پر وہ انگریزوں کے خلاف سوچیں۔ حسرت نے ابتدا ہی میں علی گڑھ کی خوشامدی پالیسیوں کی مخالفت کی اور کانگریس تحریک میں شامل ہو گئے۔ ادھر کانگریس میں بھی رفتہ رفتہ دو گروپ ہو رہے تھے۔ ایک گروپ وہ تھا جو کسی قسم کا خطرہ مول لیے بغیر انتہائی نرم رول کے ساتھ بعض سیاسی قرار دادوں کے ذریعہ جو بھی آسانیاں اور مراعات حاصل ہو سکیں حاصل کرنا چاہتا تھا، ایسے اعتدال پسند گروپ کی نمائندگی دادا بھائی نوروجی۔ گوپال کرشن گوکھلے اور سر یندر ناتھ بنرجی وغیرہ کر رہے تھے۔ دوسرا گروپ تشدد اور انتہا پسند تھا، جو قرار دادوں کی بجائے پرزور احتجاج پر یقین رکھتا تھا۔ ایسا احتجاج جو حق مانگنے کے بجائے چھین لینے پر یقین رکھتا تھا، ایسے گروپ کی نمائندگی کا سہرا بال گنگا دھر تلک کے سر تھا۔ حسرت اپنی حریت پسند، بے باک اور باغیانہ طبیعت سے مجبور ہو کر انتہا پسند گروپ میں شامل ہو گئے اور اردوئے معلیٰ میں کانگریس کی سرگرمیوں کے سلسلے میں تفصیلی نوٹ شائع کرتے رہے۔ اس اعتبار سے اردوئے معلیٰ اردو کا وہ پہلا اخبار ہے جس نے علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی اور ادب کے ساتھ ساتھ اس وقت کی چلتی ہوئی سیاست کو نہایت خوبصورت انداز میں اعلیٰ صحافت کا معیار بنا دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :۔

> "مسلمان ۱۹۰۶ء تک ہندوستان کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ ایک مدراس کے سید محمد کا نام کانگریس میں کبھی کبھی سنائی دیتا تھا، یا جسٹس طیب جی کا خیال کبھی کبھی ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا شبلی خیال کی حد تک کانگریس کے ساتھ تھے، مگر بہادر نوجوان حسرت پہلا شخص ہے، جس نے علی گڑھ پالیسی کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا اور اردوئے معلیٰ ادب کے ساتھ ساتھ سیاست کا صحیفہ بنتا گیا۔[۵]"

رفتہ رفتہ کانگریس کے ان دونوں گروپ میں اختلاف بڑھتا گیا۔ بال گنگا دھر تلک اعتدال پسند گروپ کی مصلحت پسند خاموشی اور نرمی کے سخت شاکی تھے، کئی بار شدت سے اظہار بھی

۵؎ حسرت نمبر، نگار، ص ۱۱۲

کر چکے تھے، اور جب بات حد سے گزر گئی تو ۱۹۰۷ء میں سورت کانگریس میں انھیں اختلافات کی وجہ سے وہ اپنے گروپ کے ساتھ کانگریس سے باہر آ گئے، تو اُن کے ساتھ حسرت بھی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔

تلک کی شخصیت کا حسرت پر بے حد اثر تھا۔ تلک ایک سچے مجاہد آزادی کے علاوہ بے باک قلم کار اور نڈر صحافی بھی تھے جنھوں نے جنگِ آزادی کی لڑائی میں بہ بانگِ دہل یہ اعلان کر رکھا تھا کہ "آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے، میں اسے لے کر رہوں گا" جا بجا وہ اپنی تقریروں میں کہتے:

"اگر ہمارے گھر میں چور گھس آئیں، اور ہم اُنھیں پکڑ نہ سکیں تو ہمیں چاہیے کہ انھیں بند کر کے آگ لگا دیں، تاکہ آگ میں وہ بھسم ہو جائیں۔"

حسرت کو تلک کی شخصیت کی یہ بے باکی اور بے خوفی اور جذبے کی شدت ایسی بھائی کہ اُن کی آواز میں اُنھیں اپنی آواز سنائی دینے لگی اور وہ بے خوف و خطر اُس وقت کے تمام احول سے بے نیاز ہو کر تلک کے مُرید ہو گئے۔ حسرت کے دل و دماغ پر تلک کا جادو اُس وقت چلا جب علی گڑھ جیسے ماحول میں سر سید اور ان کے نقوش کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنا تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ حسرت نے تلک کو پیشوا مان کر اپنی طبیعت کے باغیانہ پن کو سرِ عام ظاہر کر دیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں تلک پر ایک مضمون کے سلسلے میں مقدمہ چلا اور انھیں چھ سال کی قید بامشقت کی سزا ہو گئی تو حسرت پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ انھوں نے باقاعدہ ان پر ایک نظم کہی، جس کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:۔

آزادیٔ ہند کی خواہش کو مقبول، خاص و عام کیا
دل اہلِ ستم کے بیٹھ گئے، وہ بال تلک نے کام کیا
سب ہند کے گرم اخباروں میں مضمون لکھے کیسے کیسے
جس سے کہ فرنگی ڈرتے تھے، اس کام کو سرانجام کیا
ہو جور و جفا، یا ظلم و ستم ہٹنے کے نہیں پیچھے کو قدم
جس نے یہ کہا دب جائیں گے ہم واللہ خیال خام کیا
بلونت تلک اے فخرِ وطن، بے جرم اسیرِ دام و محن
یاد آئی تیری جس دم فوراً حسرت نے جھک کے سلام کیا

اور جب ۱۹۲۰ء میں تلک انتقال کر گئے تو حسرت نے ان کی یاد میں باقاعدہ نوحہ کہا ؎

ماتم ہو نہ کیوں بھارت میں بپا دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہاراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک
جب تک وہ رہے دنیا میں، ہم سب کے دلوں پر زور اُن کا
اب رہ کے بہشت میں نزدِ خدا، روحوں پہ کریں گے راج تلک
ہر ہندو کا مضبوط ہے جی، گیتا کی یہ بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں خود بھی کہا ہے یہی، پھر آئیں گے مہاراج تلک

حسرت پہلی بار جیل سے لوٹ کر آئے تو لوگوں نے محسوس کیا کہ حسرت کی ننھی سی شخصیت جیل کی چکی کی مشقت کے تلے کچل گئی ہو گی، اس لیے واپسی پر انھوں نے حسرت کو رائے دی کہ وہ اپنی اور اُردوئے معلّیٰ کی سیاسی پالیسی میں اعتدال اور توازن برتیں، اور اطمینان سے مسلم لیگ یا کانگریس (اعتدال پسند گروپ) کے بارے میں غور کریں، لیکن چکی کی مشقت نے حسرت کی طبیعت کو اور بھی طرفہ تماشا بنا دیا، جس کا اعتراف جیل میں ہی اس شعر کے ذریعہ کر چکے تھے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

چکّی کی مشقت نے حسرت کی جرأت اور بے باکی کو اور بھی ہوا دی اور ان کے عزائم اور افکار کو مضبوط کر دیا، جیل سے واپس لوٹتے ہی انھوں نے اُردوئے معلّیٰ میں ان نیک لوگوں کو جواب دیا ؎

”ہم پر ان تمام نیک نیت مشوروں اور مصلحت کوش صلاحوں کا شکریہ فرض ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدۂ عام اس لیے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کرنا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بڑا

ترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا

پالیٹکس میں ہم مقتدائے وطن پرستاں مسٹر تلک، مسٹر گھوش اور سید گھوش کی پیروی لازم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس حیثیت سے فیروز شاہی کانگریس سے ہم کو اتنا ہی بیزاری ہے جتنی ابھری مسلم لیگ یا نوزائیدہ لال چندی کانفرنس سے اور یہ بیزاری حق بجانب ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی رفتار اور اہل دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے۔"

حسرت کی حریت پسندی کا ایک اور اعلیٰ نمونہ ہمیں اس وقت دیکھنے کو ملتا ہے جب ملک میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوتا ہے اور حسرت کھل کر اس تحریک کا ساتھ دیتے ہیں اور جا بجا تقریر کرنے کے بجائے اپنے گھر ہی سے اس کی ابتدا کی اور زندگی بھر ولایتی کپڑے اور ولایتی اشیا کے استعمال سے پرہیز کیا۔

حسرت جب دوبارہ جیل گئے تو اردوئے معلیٰ پھر بند ہو گیا۔ دو سال بعد جیل کی واپسی پر علی گڑھ کے مدرسل کنج میں سودیشی اسٹور کھولا جس میں صرف سودیشی کپڑا ہی نہیں، بلکہ دیگر ضروریات کی چیزیں بھی تھیں، جس کو دیکھ کر مولانا شبلی نے مذاق میں حسرت سے کہا تھا:۔

"تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشن بنے، اور اب بنئے ہو گئے ہو۔"

شبلی کے اس جملے کے ذریعہ حسرت کی نیرنگی طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، طبیعت کا ایک ایسا میلان جو زندگی کے ہر پہلو کو سچائی و بے باکی کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز اور دلچسپ بنا دینے والی کیفیت سے دوچار رکھتا تھا اور یہ کیفیت ایسی سرشاری میں غرق رکھتی ہے، جو جیل کی تکالیف و دیگر ذلت و رسوائی کی حدوں کو بھی پار کر جاتی ہے۔ لیکن حق پرستی اور حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑتی۔

علی گڑھ کے سودیشی اسٹور میں جب ناکامی ہوئی تو حسرت کانپور آ گئے اور وہاں بھی

انھوں نے سودیشی اسٹور کھولا، لیکن ۱۹۲۱ء میں ایک بار پھر گرفتاری نے اسے ناکام ہونے پر مجبور کر دیا۔

حسرت کی سر بسر فکر آزاد، اور رہنما جذبے کی شدت سے لبریز تھا، انھیں جس وقت جو محسوس ہوتا، وہ کرنے لگتے، کیوں کہ وہ آزادی کو چشم زدن میں اپنے قریب دیکھنا چاہتے تھے، ابتدا میں مسلم لیگ سے برگشتہ رہنے کے بعد اک دم سے اس کے قریب آگئے اور اس کے لیے جو بھی کیا دل کھول کر کیا۔ جب خلافت تحریک چل پڑی، اور مسلم لیگ کچھ دنوں کے لیے پس منظر میں چلی گئی تو حسرت اک دم سے اس تحریک سے جڑ گئے۔ اس تحریک میں گاندھی جی آگے آگئے تھے۔ ان کے ساتھ جو لوگ تھے، ان میں حسرت کا نام خاصا اہم ہے۔ پھر ترک موالات (NONCO-OPERATION) کا وقت آیا، اس ترک موالات کی باگ ڈور بھی گاندھی جی کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں حسرت گاندھی جی کی قیادت کے سخت مخالف ہو گئے۔ کیوں کہ گاندھی جی بنیادی طور پر نرم مزاج اور صلح کن طبیعت رکھتے تھے، اور حسرت کے نزدیک سیاست کے لیے یہ ساری چیزیں فضول ہی نہیں، بلکہ مضر تھیں۔ انھیں خطرہ تھا کہ یہ تحریک کہیں درمیان میں ہی نہ دم توڑ جائے، اور مصالحت کا شکار ہو جائے۔ حسرت یہ سب ہرگز منظور نہ کر سکتے تھے کیوں کہ ان کی باغی طبیعت اپنے مقصد کی حصولی کے لیے تشدد اور عدم تشدد، دونوں پر یقین رکھتی تھی، اور گاندھی جی کو صرف عدم تشدد پر اعتماد تھا۔ اس لیے حسرت نے گاندھی جی کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اور وہی ہوا کہ جب فروری ۱۹۲۲ء میں حکومت نے گاندھی جی کی طرف سے تحریک ختم کر دینے کی تجویز منظور کر لی، تو حسرت کی بددلی اور خفگی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی، اور وہ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔

۱۹۱۷ء میں جب روس کے انقلاب کی لہر چاروں طرف پھیل گئی اور کمیونزم کا بول بالا ہونے لگا تو اس کے اثرات ہندوستان میں بھی پہنچے۔ حسرت جیسی جذباتی، اور انقلابی ذہنیت کے اوپر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ نتیجے کے طور پر ان کا رجحان کمیونزم کی طرف بڑھا، اور جب ۱۹۲۵ء میں کان پور میں پہلی بار کل ہند کمیونسٹ کانفرنس ہوئی تو حسرت اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، اور اپنی صدارتی تقریر ....

میں انھوں نے نہایت جوشیلے انداز میں روس کی اشتراکیت اور کمیونزم کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالنے کے بعد انھوں نے دعوت دی :-

"جو شخص ہمارے اصولوں کو مانے، وہ ہمارے فریق میں داخل ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم، عیسائی ہو یا بودھ، مذہبی ہو یا لامذہبی، بالفاظ دیگر ہم ہر مذہب کے معبود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک لامذہبی بھی ایک مذہب ہے۔"

یہ اُس حسرت کے جملے ہیں جو "مولانا حسرت موہانی" کے نام سے مشہور ہے۔ مذہب اور تصوف اس کی شخصیت کے اہم عناصر ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ایک جگہ اپنے آپ کو مسلمان کمیونسٹ کہا ہے ؎

درویشی انقلاب مسلک ہے مرا صوفی مومن ہوں، اشتراکی مسلم

اردوئے معلّٰی کے پرچوں میں کمیونزم۔ سوشلزم سے متعلق مضامین بکھرے پڑے ہیں۔

تیزی سے اندازِ فکر کا بدل جانا، فکر کی راہوں میں اچانک کروٹ لے لینے کی یہ کیفیات حسرت کے یہاں تضاد کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب کے پیچھے انگریزوں سے نفرت، سامراجیت سے دشمنی اور آزادی کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ سیدھا سچا ایک مخلص اور رومانی ذہن کے انسان کا جذبہ جس کے نزدیک سیاسی مسلک، مصلحت کی کوئی حیثیت اور حقیقت نہ تھی، اس لیے وہ جہاں جو محسوس کرتے، کھُل کر موافقت کرتے، جہاں اُن کی سمجھ میں نہ آتا کھُل کر مخالفت کرتے۔ افہام و تفہیم کی یہ معصوم اور دل کش ادا ان کے شاعرانہ اور عاشقانہ جذبے کی دین تھی جس کے تناظر میں وہ اس وقت کے تمام ہندوستان کی سیاست کو دیکھتے اور عمل کرتے تھے جو بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا تھا، لیکن اس کے پیچھے دل و دماغ میں بسی اُن رومانی لہروں کا عمل رہتا جس نے ابتدا سے ہی ان کی سوچ اور عمل کو دل چسپ اور نیرنگ بنا دیا تھا۔ اس دلچسپی اور نیرنگی کی ایک مثال اس وقت اور دیکھنے کو ملتی ہے جب فروری ۲۸ء کو سائمن کمیشن آیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اس کا بائیکاٹ کیا، لیکن حسرت اس بائیکاٹ سے خلاف تھے، انھوں نے متعدد مقامات پر "سائمن گو بیک" کی جگہ پر "گاندھی گو بیک" کے نعرے لگوائے۔ یہ وہ دور تھا جب گاندھی جی کے ہاتھ میں عوام کی طاقت تھی اور ان دنوں گاندھی جی کی مخالفت میں اس طرح کے نعرے لگوانا حسرت جیسے بے باک اور جری شخص کا ہی کام تھا۔

کچھ دنوں بعد مسلم لیگ پھر حرکت میں آئی اور حسرت کانگریس سے برگشتہ خاطر ہو کر مسلم لیگ کے حامی بن گئے۔ لیکن یہاں بھی انھیں قائد اعظم محمد علی جناح سے اختلاف رہتا اور بقول مولانا سلیمان ندوی کے کہ محمد علی جناح اپنی مخالفت کم برداشت کر پاتے تھے لیکن حسرت موقع پڑنے کھل کر اُن کی مخالفت کرتے اور ان کو برداشت کرنا پڑتا۔

محمد علی جناح ایک الگ پاکستان بنانا چاہتے تھے، لیکن حسرت اُس کے سخت مخالف تھے وہ مسلم اکثریت کے صوبوں کی آزادی چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے گاندھی جی۔ راجگوپال اچاریہ اور سردار پٹیل سے بات کی لیکن ناکام رہے اور پاکستان بن گیا۔ بھرے جلسوں میں وہ اکیلے سب کی مخالفت کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس وقت اُن کی آواز پر توجہ نہ دی جاتی، لیکن حق گوئی اور حق پرستی کے سامنے وہ کسی کو نہ دیکھتے اور نہ ہی مرعوب ہوتے۔ ایک بار تو سردار پٹیل کو سخت لہجہ میں ڈانٹ دیا اور پٹیل کے بیانوں پر خدا کی لعنت بھی۔

حسرت زندگی بھر پریشان رہے لیکن خودداری۔ غیرت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا شوخی اور کھلنڈرا پن جو کہ شروع ہی سے سرایت کر گیا تھا اس کے اثرات تا زندگی قائم رہے۔ اسی لیے ان کی زندگی ہمیشہ حق گوئی اور بے باکی، پختہ عزم اور فعالیت سے لبریز رہی۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے:

"حسرت محشر خیال ہی نہیں، محشر عمل تھے۔ حسرت جس بات کا ارادہ کر لیتے، وہ ضرور کر تے"

کر کے ہی رہے گا جو دل میں ٹھان لی ہے

روشن ہے ہم پہ حسرت عزم امور تیرا

ڈاکٹر احمر لاری لکھتے ہیں :۔

"اس عزم امور نے ان میں فولاد کی سی صلابت اور چٹان کی سی مضبوطی پیدا کر دی تھی وہ جرأت اور استقلال کا آہنی پیکر تھے۔ ساری زندگی وہ قوم اور ملک کے لیے لڑتے رہے اور لڑتے لڑتے جان دی مگر راستے میں کبھی نہ لغزش آئی اور نہ ہی وہ کبھی اپنے راستے سے ہٹے۔"

(حسرت موہانی، حیات اور کارنامے۔ ص ۱۴۲)

شخصیت کا یہ بانکپن ان کی زندگی میں سمائے ہوئے اس جذبہ کا رد عمل تھا جو بچپن میں ہی ان کے خمیر میں سما گیا تھا۔ شاعرانہ اور باغیانہ جذبے کا وہ خمیر جس نے بنیادی طور پر ان کو رومانی شاعر تو رکھا ہی سیاست میں

بھی اس کا جذبے کا شکار بنا دیا۔ یہ حسرت کی سیاست تھی جناح۔ گاندھی والی سیاست نہ تھی بلکہ شاعرانہ اور رومانیانہ جذبے کا ایسا تال میل تھا جو ہر چیز کو ایک آن میں اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہے۔ حبیب احمد صدیقی نے اچھی بات لکھی ہے:۔

" ان کی شاعرانہ طبیعت کا اقتضا تھا کہ آزادی کے زریں خواب کی تعبیر دم زدن میں ہو جائے۔ وہ منزل کی جانب کترا کر چلنے کے قائل نہ تھے بلکہ اکثر نمرود میں بے خطر کود پڑنا ان کا شعار تھا۔

(اردو ادب حسرت نمبر ۱۵۱ ص ۹)

اسی لیے مجنوں گورکھپوری نے ان کی سیاست میں وجدانیات اور تصوف کے عناصر کو تلاش کر لیا۔

ڈاکٹر مسیح الزماں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

" شعر کی دنیا میں ہیچ کردہ ماحول کی تلخی سے کچھ دیر کے لیے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے، غم عشق میں روزگار کو بھلا دینا چاہتے تھے۔ سیاسی جکڑبندسرکاری پابندیوں اور غلامی کے احساس سے ذکر محبوب میں فرار حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

میرا خیال ہے کہ بات اس کے برعکس ہے۔ وہ سیاست سے گھبرا کر شاعری کی طرف نہیں بڑھے اور نہ ہی انھوں نے سیاست کی تلخیوں کو ختم کرنے کے لیے عاشقانہ شاعری کی، بلکہ اگر ہم ان کے ابتدائی حالات کا بغور جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ شاعری کی وجدانی اور رومانی کیفیت سے حسرت ابتدا ہی سے دوچار تھے۔ اس سلسلے کی کی تمام سوچ اور فکر ان کے دل اور دماغ میں ایک خاص قسم کا دائرہ بنا گئی جس کے آئینے میں انھوں نے زندگی کے تمام معاملات کو دیکھا، پرکھا اور جھیلا، خواہ وہ شاعری کی زندگی ہو۔ سیاست کی یا ان کی ذاتی۔

شاعری کے میدان میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس نے ان کو دائمی زندگی عطا کی، لیکن اس کے بالکل برعکس سیاست کے میدان میں جو انھوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے اور جس پر انھوں نے اپنی ذات کی دلیرانہ و قلندرانہ چھاپ چھوڑی ہے اس پر کم غور کیا گیا ہے، اگر کیا بھی ہے تو اسے کوئی مقام نہیں دیا، جس کے حسرت حقدار تھے۔



دوادبُ

حسرت نمبر

انجمن ترقّی اُردو ہند

(اردو ادب - حسرت نمبر)

۱۹۸۱ء (شمارہ ۱ تا ۴)

اردو ادب

سہ ماہی

(حسرت نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

سالانہ قیمت: بیس روپے

فی شمارہ: پانچ روپے

موجودہ شمارہ: بیس روپے

پرنٹر پبلشر شاہد خاں نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر
انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی سے شائع کیا۔

فہرست مضامین